نیا دور
23

نیا دور کراچی

۳۹، ۴۰

سالانہ: ۱۶ روپے
قیمت فی پرچہ: ۴ روپے

شائع کردہ: پاکستان کلچرل سوسائٹی۔ کراچی ۵

ادارہ

قمر سلطانہ

جمیلہ ہاشمی

شمیم احمد

ترتیب

افسانے

تبصرے

اداریہ

پاکستان کو سب سے زیادہ فکر صحیح کی ضرورت ہے۔ فکر صحیح کیا ہے؟ ــــ جو کسی شے کے منشا تخلیق کو جانے اور اسے مقصد تخلیق سے نہ ہٹنے دے۔ پاکستان مختلف علاقوں کے لوگوں کے اتحاد سے وجود میں آیا ہے۔ یہ علاقے پاکستان بننے سے پہلے موجود تھے۔ ان کا رہن سہن اپنا تھا۔ ان کا لباس اپنا تھا ان کی زبانیں اپنی تھیں۔ غرض بحیثیت مجموعی وہ ایک اکائی کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک اکائی بنگال والوں کی تھی۔ ایک اکائی پنجاب والوں کی۔ ایک اکائی سندھ والوں کی، ایک اکائی سرحد والوں کی۔ اور ایک اکائی بلوچستان والوں کی۔ یہ سب اکائیاں حصول پاکستان کی تحریک میں مل گئیں اور پاکستان وجود میں آ گیا۔ ہمیں پاکستان کے حقیقی مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے اس ــــ اختلاف اور اتحاد ــــ دونوں کو اپنی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہئے۔ ہمارا اتحاد صرف اتحاد نہیں ہے۔ یہ اختلاف میں اتحاد ہے۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ اختلاف کے باوجود ہمارے اتحاد کی اساس کیا ہے۔ اس کا ایک جواب تو وہی ہے جو سب دیتے ہیں۔ اسلام۔ لیکن اس جواب پر بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ اسلام تو ایران اور پاکستان میں بھی مشترک ہے۔ پاکستان اور ترکی میں بھی مشترک ہے۔ پھر ترکی، ایران اور پاکستان ایک تو نہیں ہیں۔ یہ اعتراض اپنے اندر ایک صداقت رکھتا ہے لیکن ادھورے جواب سے پیدا ہوا ہے اس لئے خود بھی درست نہیں ہے۔ اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے مگر اسنے ہر جدا خطۂ زمین میں اپنا ایک الگ رنگ پیدا کیا ہے۔ یہ ہر خطۂ زمین سے مل کر ایک جدا اجتماعی مزاج کی تشکیل کرتا ہے۔ ایران میں یہ تشکیل کسی اور طرح ہوئی ہے۔ ترکی میں کسی اور طرح۔ برصغیر میں کسی اور طرح۔ ہمیں پاکستان کے اتحاد کی بات کرتے ہوئے

حقیقت کے اس رخ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ حصول پاکستان کی تحریک مسلمانانِ عالم کی تحریک نہیں تھی۔ یہ ہندی مسلمانوں کی تحریک تھی۔ اس لئے پاکستان کے اتحاد میں ہمیں اسلام کے ساتھ ہندی مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ تاریخ کو بھی مدِنظر رکھنا چاہیئے۔ یہ ہمارے اتحاد کا دوسرا سب سے بڑا ستون ہے۔ اس تاریخ نے ہمیں مشترک یادیں دی ہیں۔ مشترک چیزوں سے محبت اور نفرت کرنی سکھائی ہے۔ مشترک دکھ اور سکھ دیئے ہیں۔ اسی تاریخ کی بنا پر ہمارے قابلِ احترام بزرگ ایک ہیں، سیاسی اور مذہبی شخصیتیں ایک ہیں۔ ہماری محبت اور نفرت کی علامتیں ایک ہیں۔ اس طرح ہمارے اتحاد کے دو ستون ہیں۔ ایک اسلام۔ دوسرا ہزار سالہ مشترک تاریخ۔ تاریخ کی سب سے بڑی امانتوں میں جو امانت ہمارے حصے میں آئی ہے وہ ہماری زبان اردو ہے۔ حصول پاکستان کی جد وجہد میں جب ہم نے یہ آواز بلند کی کہ ہم ایک الگ مستقل بالذات قوم ہیں۔ ہمارا مذہب الگ ہے۔ کلچر الگ ہے۔ زبان الگ ہے تو زبان سے ہماری مراد اردو زبان تھی۔ اور اس پر وہ تمام علاقے جمع ہو گئے جو اب پاکستان میں شامل ہیں۔

اب پاکستان کی غایتِ تخلیق بالکل صاف ہے۔ پاکستان اس لئے بنا تھا کہ اسلام کو قائم رکھے۔ تاریخی امانتوں کا تحفظ کرے اور اردو کو ترقی دے۔ یہی پاکستان کی غایتِ تخلیق ہے اور یہی وجہِ تخلیق۔ قومی اتحاد کے ان تین ستونوں میں سے ہم جس ستون کو بھی منہدم کریں گے پاکستان کے وجود پر ضرب لگائیں گے۔ ہمیں یہ بات ایک ہزار ایک بار غور کرکے سمجھ لینی چاہیئے اور سمجھ کر اس پر قائم ہو جانا چاہیئے۔

قیام پاکستان کے بعد ایک ذہنیت پیدا ہو گئی ہے جس نے دانستہ شرارت یا نادانستہ حماقت سے ہر اس چیز پر ضرب لگائی ہے جس پر پاکستان کی بنیاد ہے۔ اس ذہنیت نے ایک طرف مذہب کو اجتماعی شعور سے کاٹنے کی کوشش کی تو دوسری طرف تاریخی شعور کو منقطع کرنا چاہا۔ اب اس کی نگاہ توجہ اردو کی طرف مبذول ہوئی اور اس نے اصلاح کے لبادہ میں اردو کو مجروح کرنے کے لئے مختلف حربے استعمال کئے ہیں۔ اس ذہنیت کے

محرک کبھی یہ کہتے ہیں کہ اردو کا رسم الخط تبدیل کر دینا چاہیئے کبھی یہ کہتے ہیں کہ اردو کا نام بدل دینا چاہیئے۔ کبھی یہ کہتے ہیں کہ ساری زبانوں کو خلط ملط کر کے ایک نئی زبان بنائی چاہیئے یہ ساری آوازیں پاکستان دشمنی کی آوازیں ہیں۔ خواہ انہیں بلند کرنے والے اسے جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔ فکر صحیح کا تقاضا یہ ہے کہ اس ذہنیت کو پروان چڑھنے کا موقع نہ دیا جائے۔ ہر پاکستانی کو اس ذہنیت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔

نیازؔ فتحپوری

نیازؔ فتحپوری کے انتقال کے ساتھ ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ گزشتہ پچاس سال کے عرصہ میں انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ کئی نسلوں کی ذہنی آبیاری کی اور یہ کام خود اتنا بڑا ہے کہ تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

نیازؔ فتحپوری اب ہم میں نہیں ہیں مگر ان کا کام باقی ہے اور یہ کام تاریخ کی امانت ہے۔ وہ نیازؔ جنہوں نے "نگار" نکالا تھا یقیناً ایک عہد کے معماروں میں شمار ہوں گے۔ نیازؔ فتحپوری کا نام ایک دبستان، ایک ادبی معیار اور ایک دور کے نمائندہ ترین ادیب کی حیثیت میں جس طرح آج زندہ ہے کل بھی رہے گا۔ ہم اس خلوص، اس لگن، اس محنت اور مسلسل جد و جہد کو سلام کرتے ہیں جس نے پچاس سال سے زیادہ عرصہ تک اردو زبان اور علم و ادب کی خدمت کی۔

نیازؔ فتحپوری کے انتقال سے جو جگہ خالی ہو گئی ہے اُسے پُر کرنا آسان نہیں ہے۔ نئی نسل صرف شہرت چاہتی ہے اور محنت سے جی چراتی ہے۔ نیازؔ صاحب جس نسل کے نمائندہ ترین ادیب تھے وہ محنت کرتی تھی اور شہرت سے بھاگتی تھی۔ نام سے زیادہ کام انکا مقصد حیات تھا۔

ہمیں یقین ہے کہ وہ کام جو نیازؔ صاحب عمر بھر کرتے رہے ان کے شاگرد اور بچے

اسے آگے بڑھائیں گے اور "نگارِ پاکستان" کو اسی معیار کے ساتھ جاری و زندہ رکھیں گے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

راجہ مہدی علی خاں

پرچہ پریس جا رہا تھا کہ راجہ مہدی علی خاں کی ستاؤنی آگئی۔ دل اب بھی ماننے کے لئے تیار نہیں کہ راجہ مہدی علی خان جواں مرگ ہو گئے۔ راجہ مہدی علی خاں نے ساری زندگی اپنی صلاحیتوں کو دریافت کرنے اور نکھارنے میں صرف کر دی۔ وہ ایک شعلہ تھے تخلیقی نا آسودگی کا ایک مظہر تھے۔ انہوں نے شاعری کی اور اس میں کئی کروٹیں بدلیں۔ نثر لکھی اور تازہ ترین روپ میں وہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت میں ابھر رہے تھے۔ نیا دور میں ان کا ایک خوبصورت اور چونکا دینے والا افسانہ ابھی چند ماہ پہلے شائع ہوا تھا۔ ایک اور افسانہ وہ اس دعویٰ کے ساتھ لکھ رہے تھے کہ اردو میں اتنی تیکھی اور سچی چیز اب تک شائع نہیں ہوئی ہوگی۔ مگر وہ مر گئے اور اتنی جلدی مر گئے۔ جوان آدمی کے مرنے پر تو آنسو بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

۱۸۸۸ ــــ ۱۹۶۵

ٹی-ایس-ایلیٹ زندگی کے آخری دنوں میں
۱۹۶۴ء

ٹی - ایس - ایلیٹ

۱۹۲۶ء

ٹی - ایس - ایلیٹ

۱۹۳۲ء

جب ایلیٹ سات آٹھ سال کا تھا تو سینٹ لوئی میں اپنے خاندان والوں کے لئے ایک رسالہ ھاتھ سے لکھ کر شائع کرتا تھا ۔ اس شوقیہ اور معصوم مشغلے کے چند پرچے هارورڈ یونیورسٹی میں محفوظ ھیں، جو ایلیٹ کے بھائی ھنری وئیر ایلیٹ کا عطیہ ھیں ۔ آپ یہاں اس رسالہ کے دوسرے شمارے کی تصویر دیکھ رہے ھیں ۔

ایلیٹ ابھی آٹھ سال کا بھی نہ تھا کہ اس نے ایک سوانحی ''تصنیف'' بعنوان ''جارج واشنگٹن'' لکھی ''کتاب'' ایک کاغذ کو چار تہ کرکے بنائی گئی تھی جس کے چاروں صفحات پر کتاب کا پورا مواد اس طرح دیا گیا تھا:-

پہلے صفحہ پر کتاب کا نام جلی حروف میں اوپر ←

George Washington.
BY
T. S. Eliot.

—

George Washington was born in
a plantation. He wanted to go to
sea but his mamma didn't want
him to, so he took to the army
First he killed French and Indians
and then British.
He freed his country and was president
When J. Adams was president he wa

اور اس کے نیچے مصنف کا نام ٹامس-ایس-ایلیٹ،
ایس-اے ایڈیٹر ''فائر سائڈ'' نظر آرہا ہے- یہ بھی بتایا
گیا ہے کہ یہ کتاب کا پہلا ایڈیشن ہے- اس ٹائٹل کو
چند لائنوں سے مزین بھی کیا گیا ہے- دوسرے صفحہ سے
اصل ''کتاب'' شروع ہوتی ہے ←

an admilal of someting like.
And then he died, of corse. He was never said to say a lie. He died at Mt. Vernon.

جس میں ''جارج واشنگٹن'' کی سوانح دی گئی ہے۔
تیسرے صفحہ پر جہاں سوانح ختم ہوتی ہے دو سطریں
خط منحنی میں کھینچی گئی ہیں ←

G. Wash-ing-ton.
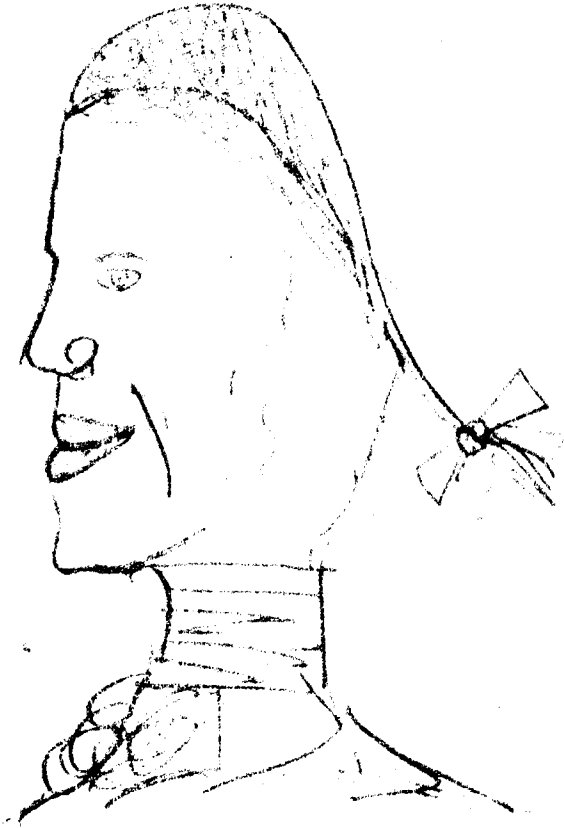
آخری صفحه پر ''جارج واشنگٹن،، کا ایک اسکیچ بنایا گیا ھے جس پر اس کا نام بھی درج ھے۔ یه دلچسپ بات ھے که ایلیٹ کے ذھن میں جارج واشنگٹن کی یه تصویر تھی -

۲ مضمون

محمد احسن فاروقی
جمیل جالبی

محمد احسن فاروقی

ٹی ایس ایلیٹ

۱۹۱۷ء سے ۱۹۶۵ء تک قریب پچاس برس ٹی۔ ایس ایلیٹ انگریزی زبان کے ادب پر خاص طور سے اور دنیا کے ادب پر عام طور سے ایک عجیب سایہ کی طرح چھایا رہا عجیب اس لئے کہ اس کے عام خیالات اس کی شاعری اور اس کی تنقیدی خیالات نے ایک ایسا نیا راستہ نکالا اور ایسا نیا اثر ڈالا جو ہمارے روائتی طریقوں سے سمجھایا سمجھایا نہ جا سکتا تھا مگر جس کو اچھی طرح سمجھ لینا اس لئے ضروری تھا کہ یہ بیسویں صدی کے ادب کا سب سے مخصوص اور سب سے اہم راستہ تھا۔ اس نئے راستے کی بنیاد ایلیٹ کے کردار یعنی اس کی انفرادی ہستی میں نظر آتی ہے اس کی امریکہ میں پیدائش اور تربیت۔ پھر یورپ کی اعلےٰ ترین تعلیم گاہوں میں درس حاصل کرنا اور اس کے بعد انگریزی قومیت حاصل کر کے انگلستان ہی میں زندگی گزار دینا یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ مختلف اور اکثر متضاد قومی اور علمی اثرات کو جذب کرتا رہا اور آخر میں ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں اس کی ہستی میں یہ سب اثرات مل جل کر ایک نئی انفرادیت کا مظہر ہوگئے۔

وہ ۱۸۸۸ء میں امریکہ کے سینٹ لوئی مقام پر پیدا ہوا۔ اس کا خاندان انگریزوں کا تھا جو سترھویں صدی میں انگلستان سے ہجرت کر کے امریکہ میں آ بسے تھے۔ اس کی ماں مصنفہ اور شاعرہ تھی۔ اٹھارہ برس کے سن میں وہ امریکہ کی بہترین یونیورسٹی ہارورڈ میں داخل ہوا اور یہاں حالانکہ اسے اپنے درجہ کا بہترین شاعر مانا گیا، اسکی خاص دلچسپی فلسفہ میں رہی مشرقی فلسفہ میں وہ اس قدر منہمک ہوا کہ اسے مغربی خیالات سے الگ ہو جانے کا خوف ہونے لگا۔ ہارورڈ میں اس وقت ولیم جیمس کے فلسفے کا دور تھا مگر ایلیٹ کو اس سے کوئی دلچسپی نہ ہوئی۔ اس نے ایف ایچ بریڈلے پر مقالہ لکھا جو جیمس کی Pragmatism کا سخت مخالف تھا۔ وہ فلسفہ پڑھنے

کے لیے جرمنی گیا اور پھر آکسفورڈ میں داخل ہوا۔ وہ پیرس کی مشہور یونیورسٹی ساربون سے بھی متعلق ہوا اور فرانس کے اشاریت پسند شاعروں ـــــ بودلیئر اور لافورگ سے بہت متاثر ہوا۔ اب اسے محسوس ہوا کہ "جس قسم کی شاعری کی مجھے ضرورت ہے اور جو مجھے اپنی آواز کا استعمال سکھا سکتی ہے وہ انگریزی میں کہیں نہیں ہے وہ صرف فرانسیسی زبان میں ہے"۔ اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں اس کی نظم .... "The Love Song of" شکاگو کی میگزین "پوئٹری" میں شائع ہوئی۔ اسی سال اس نے شادی کرلی اور انگلستان میں رہنے لگا جہاں اس کی ملاقات ازرا پونڈ، وندھام لوئس اور جیمس جوائس سے ہوئی۔ ۱۹۱۷ء میں اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ ...Prufrock and Other مقبول ہوا اور اس میں لافورگ کا اثر فکری اشاریت اور طنزیہ مکالمہ میں صاف طور پر پایا گیا۔ نظموں کے دوسرے مجموعے بھی شائع ہونے لگے اور ساتھ ہی ساتھ تنقیدی مضامین بھی شائع ہوئے جن میں سے "روایت اور انفرادی صلاحیت" نے ایک سنسنی پیدا کردی۔ رومانی ذوقِ سخن اور رومانی نظریات جو اس وقت نقاد کے خیالات اور عام مذاق پر حاوی تھے ہل گئے۔ ساتھ ہی ساتھ لادینی اور جمہوری نظریات، جن کو صدیوں سے لوگ مانتے چلے آئے تھے، ٹی۔ایس ایلیٹ کے "For Lancelot Andrews" میں اس اظہار سے کہ وہ "ادب میں کلاسیکیت کا، سیاست میں بادشاہت اور مذہب میں رومن کیتھولک دین کا پیرو ہے" زخم خوردہ ہوئے۔ معلوم ہوا کہ نشاۃ الثانیہ سے اب تک جس چیز کو لوگ ترقی کہتے آئے تھے وہ اصل میں تنزل تھا۔ اسنے ایک ماہنامہ The Criterion نکالا جس کا مقصد یہ تھا کہ اپنے نظریات کو عام کرے اور انگریزی ادب کو یورپ کے تہذیبی فرقہ میں شامل کرنے۔ اسی رسالے کے پہلے نمبر میں اس کی نظم Waste Land اس کے بعد Hollow Man چھپی ۱۹۲۳ء میں وہ Faber and Faber کا ڈائریکٹر ہوگیا اور ۱۹۲۸ء میں ہارورڈ میں پوئٹری کا پروفیسر مقرر ہوا اور اس کے تنقیدی مضامین کے مجموعے اور آخری دور کی نظمیں چھپتی رہیں۔ پھر وہ ادبی تنقید سے سوشل تنقید کی طرف متوجہ ہوا اور .... Notes towards A Definition اور Ideas of a Christian Society سے فکری ادب میں خاص اضافہ کیا۔

آخری دور میں اس کی زیادہ تر توجہ منظوم ڈراموں کی طرف رہی۔ منظوم ڈرامے کی صنف کو اس نے ادب کی بہترین صنف کہا۔ ۱۹۴۸ء میں اسے نوبل پرائز ملا۔ ۱۹۵۰ء میں اس کی کلیات اور ۱۹۵۱ء میں منتخب مضامین شائع ہوئے جو اس کے تمام کارناموں کو ایک ساتھ کر دیتے ہیں۔ اس کی شاعری کی بابت عام خیال یہ ہے کہ وہ سمجھ میں نہیں آتی اور اس کی تنقیدوں کو نہایت تباہ کن بتایا جاتا ہے۔ مگر باوجود اس کے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاتا۔ انگریزی شاعری کو اس نے نئی زندگی بخشی اور تنقید میں وہ اضافہ کیا کہ اس کا نام اہم ترین نقادوں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس وقت اس کی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش ایک کامیاب درجہ پر پہنچ چکی ہے اور اس کی پیروی میں دنیا بھر کے شاعر کچھ نہ کچھ ضرور کہہ چکے ہیں۔ جدید ادب میں اس کی اہمیت ملکوں ملکوں مانی جا چکی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ چاہے ہم اسے پسند نہ کریں مگر جدید ادب کو سمجھنے کے لئے اس کا مکمل مطالعہ لازمی ہے۔

۲

ایلیٹ امریکہ کے اس حصہ میں پلا اور بڑھا جہاں پرانے انگریز خاندان کے لوگ سترھویں صدی سے آباد ہو کر انگریزی روایات میں جکڑے ہونے پر فخر کرتے تھے۔ نیو انگلینڈ نے امریکی زندگی میں اہم حصہ لیا کیونکہ یہیں سے امریکہ میں سیاسی اور تہذیبی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے مخصوص خاندان اپنے کو پرانی روایات کے اہم حامل سمجھتے تھے اور ان ہی پر تمام زندگی کی بنیادیں رکھنا چاہتے تھے۔ ایلیٹ بھی پرانی تہذیبی روایات سے ایک عام یوروپین کے مقابلہ میں زیادہ گہری جذباتی دلچسپی لے کر آگے بڑھا۔ یورپ میں اس وقت اس رومانیت کا دور دورہ تھا جو نشاۃ الثانیہ سے شروع ہو کر انیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہونچ چکی تھی۔ اس کے مطابق انسانی زندگی "ترقی" کی راہ پر تھی اور اس ترقی کو ڈاروِن کے نظریہ ارتقاء نے سائنسی اصولوں سے ثابت کر دیا تھا۔ ترقی کے معنے انفرادی آزادی، جمہوریت اور پروٹسٹنٹ مذہب تھے۔ ایلیٹ کے حد سے زیادہ روایت پسند ذہن کے لئے یہ سب چیزیں تخریبی تھیں کیونکہ یہ ان عام معیاروں اور قدروں کی قاطع

تھیں جوانوں کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرتی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے رسکن بھی یہ ثابت کر چکا تھا کہ قرونِ وسطیٰ کا دور جدید دور سے زیادہ تہذیب یافتہ تھا کیونکہ اس میں سماج مذہب اور فنون انفرادی قدروں کے بجائے عام قدروں پر قائم تھے۔ ایلیٹ اس نظریہ کا حامی ہو جس وقت زیادہ تر لوگ قرونِ وسطیٰ کو ایک دھندلکا کہتے تھے اور نشاۃ الثانیہ سے اس روشنی کا آغاز بتاتے تھے جو دراصل انسانی ترقی کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئی ایلیٹ نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ قرونِ وسطیٰ کی تہذیبی اکائی یوروپین جماعت بندی کا علینی عالم پیش کرتی ہے۔ نشاۃ الثانیہ نے یورپ کو قوموں میں بانٹ دیا۔ مذہب کو فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ علم کے الگ الگ شعبے کر دیئے جسکے نتیجہ میں یہ افسوسناک عالم ظہور میں آیا کہ عیسائیت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے متحد عقائد اور متحد کلچر غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ ایلیٹ کے تمام سماجی اور تنقیدی نظریات کی بنیاد اسی عقیدہ پر ہے (یہ ایک نئے قسم کی رجعت پسندی ہے جو ترقی پسندی کی جڑ اور بنیاد تک کو اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہے) ایلیٹ مسئلہ ارتقاء کا مخالف ہو کر سامنے آتا ہے اور ایچ۔ جی۔ ولز G. Wells ایسے مصنفین کی جو ترقی پذیری کے بڑے حامی تھے توہین کرتا ہے۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ دانتے کے بعد سے یورپ کی تخریب شروع ہو گئی۔ انگلستان میں اٹھارویں صدی سے تہذیبی آہنگ ٹوٹنے لگا اور انیسویں صدی میں ترقی معکوس اپنے پورے زور پر آئی چنانچہ آخری پچاس برس میں زندگی کے ہر شعبہ میں تنزل صاف صاف دکھائی دینے لگا، کارڈنیل نیومین کی طرح اسنے بھی یہ ثابت کیا کہ زندگی کی بابت محض دو مستحکم نظریہ ہو سکتے ہیں ایک کیتھولک اور دوسرا مادی اور پروٹسٹنٹ اور اس سے وابستہ تمام نظریات ایسی درمیانی چیزیں ہیں جن میں کوئی استقلال نہیں اور جن کا ہر درجہ زیادہ سے زیادہ خرابی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لئے ایلیٹ جدید دور کو بڑھاپے کی کمزوری کا دور کہتا ہے اور آگے آنے والی تاریکی اور بہیمیت کا خوف دلاتا ہے۔

اس کے نظریہ کے مطابق انسان فطری طور پر طبقات میں تقسیم ہونے کے لئے بنا ہے۔ بے طبقوں کا سماج جس کا تصور اشتراکی لوگ پیش کرتے ہیں بے معنے چیز ہے۔ ایک منظم جماعت میں ایک مخصوص طبقہ ضروری ہے جو عوام کے لئے مثال ہو اور انہیں قابو میں رکھے۔ جغرافیائی

قومی اور لسانی رجحانات مل کر ایک کلچر کی تعمیر کرتے ہیں۔ مختلف قومیتوں کو وہ اپنی تہذیبی اکائی کو قائم رکھنے کی ہدایت کرتا ہے۔ جنوبی امریکہ کے لوگوں کی تہذیبی تحریک کی حمایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "آپ لوگ نیویارک سے بہت دور ہیں اس لئے آپ بیرونی اثرات اور صنعتی زندگی کے حملے سے بچے ہوئے ہیں"۔ ایک سرزمین سے وابستگی اور ایک خاندان سے تعلق قدرت سے ہم آہنگی کا ثبوت ہیں۔ صنعتی اور تجارتی ذہن ان کو بھلا رہا ہے اور اس طرح ہر مذہب اور تہذیب کا قاطع ہے۔ ایلیٹ یہ دکھلاتا ہے کہ ہر قسم کے نظریات یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسان میں دو قسم کی خودی ہے ایک وہ جو خود غرضی سے اور دوسری وہ جو خود اعتمادی سے ظاہر ہوتی ہے۔ عیسائیت میں ان دونوں کو ایک دوسرے کا متضاد بتایا جاتا ہے۔ پہلی خودی وہ خود غرضی ہے جو ختم کر دینے کے لئے ہے اور دوسری وہ روح ہے جو لافانی ہے۔ جدید نظریات، جو انفرادی آزادی کو اہم قرار دیتے ہیں، اس روح کو محض خود غرضی سے مختلف نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سماجی زندگی ٹوٹتی جا رہی ہے اور خود غرضی کا یہ عالم ہے کہ ہر شخص اپنی قید میں ہے اور سماج سے یا تو برسرپیکار ہے اور یا پھر اپنی خواہش پورا کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ایلیٹ بتاتا ہے کہ جدید تہذیب میں جس چیز کو اہمیت دی جاتی ہے وہ ہستی نہیں بلکہ نفس ہے یا ہستی کا ایک سفلی پہلو ہے جو علوی سطح اور حقیقی ہستی کا متضاد ہے۔ روسو کا "نیک وحشی" جس کے لئے سماج آزادی کا قاطع ہے محض نفس پرستی کی طرف لے جاتا ہے۔ ایلیٹ کے لئے فرد سے زیادہ اہم سماج ہے۔ سماج اپنے قوانین اپنے عقائد اور اپنی کلچر کے ساتھ ازل سے موجود ہے اور ابد تک موجود رہے گا۔ کسی دور کا فرد سماج کی روایات سے الگ نہیں ہو سکتا۔ وہ ان تمام زمانی اور مکانی اثرات سے وابستہ ہوتا ہے جن پر سماج کی بنیاد ہے اور اپنی انفرادیت سے ان کی تکمیل کرتا ہے۔

ان تمام اثرات کو جو ایک فرد کو اپنے آغوش میں لئے ہوتے ہیں ایلیٹ کلچر یا روایت کا نام دیتا ہے۔ کلچر وہ چیز ہے جو زندگی کو صحت عطا کرتی ہے۔ یہ زندگی پر مکمل نظر اور زندگی پر مکمل عمل ہے اس لئے اس میں فنون اور تعلیم شامل ہیں اور کھیل اور خانہ داری بھی۔ روایت بھی اثرات کا ایک دھارا ہے جو شعوری اور لاشعوری دونوں طریقوں

پروفسر دسے متعلق ہے وہ کہتا ہے "روایت سے میرا مطلب وہ سب عمل۔ عادتیں اور رواج ہیں جو ایک قوم کا ایک مقام پر رہنے کی بنا پر خونی رشتہ ظاہر کرتی ہیں"۔ اس سلسلے میں خونی رشتہ اور مقامی اثرات کو وہ بڑی اہمیت دیتا ہے کیونکہ سیاسیات پوری دنیا پر پھیل سکتی ہیں اور غیر جانب دار ہو سکتی ہیں مگر کلچر کے لئے چاہے وہ شاعری۔ مصوری یا شراب کی نفاست سے نمایاں ہو ایک خاص ماحول ضروری ہے۔ زمین سے تعلق اور ایک مقامی جماعت کا احساس کلچر کے لئے ضروری ہے۔ مذہب ان دو سطحوں سے اوپر ایک سطح ہے۔ لفظ کلچر کے موجد میتھو آرنلڈ نے مذہب کو کلچر کا ایک حصہ بلکہ پیداوار بتایا تھا ایلیٹ کے لئے مذہب کلچر کی وہ روح ہے جسکو اگر الگ کر دیا جائے تو سماج ختم ہو جائے۔ اس کے لئے انسان جب ہی انسان کہلانے کے لائق ہوتا ہے جبکہ وہ روحانی حقائق سے اپنا تعلق جان لیتا ہے۔ اس لئے مذہب کلچر سے بالاتر بھی ہے اور اس میں شامل بھی ہے۔ کلچر کو وہ مذہب کا' اوتار' بھی کہتا ہے یعنی کلچر روحانی حقیقت کا انسانی مجسمہ ہے۔ مذہب کلچر کا وہ علیٰ جزو ہے جس تک پہونچنے کے لئے ہر فرد کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ قدرتی زندگی اور مذہبی زندگی ایک دوسرے سے وہ تعلق رکھتی ہیں جو ان دونوں میں سے کسی کا مکانی زندگی سے نہیں ہو سکتا۔ مذہبیت کے معنے شعوری طور پر روایات کے مذہبی عنصر سے تعلق ہیں۔ جو کلچر مذہب سے تعلق منقطع کر کے اپنے کو سب کچھ سمجھتی ہے جیسے مارکسی اشتراکیت وہ انسان کو خود غرضی کے تجربے سے باہر نہیں نکال سکتی چاہے وہ اپنی سطح پر زندگی کو وہ ایک ظاہرہ معنے دیدے (لہذا ایلیٹ کے لئے انسان کا اداروں سے وابستہ ہونا اہم ہے۔ فرد یا ایگو ایک محض تصوراتی چیز ہے جو کلچر اور روایات سے غیر متعلق ایک پست درجہ کا انسان ہے۔ اصل انسان کسی ادارے کا عکس ہوتا ہے اور اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ ادارے لازمی چیز ہیں کیونکہ انسان کی فطرت میں بدی ہے اور یہی اسکو بدی سے بچاتے ہیں مگر سیاسی اداریت جو اس وقت جمہوریت یا اشتراکیت کی صورت میں نمایاں ہے اسلئے مضر ہے کہ یہ قدرتی آدمی کی نفس پرستی پر مبنی ہے۔ جمہوریت انسان کی نفسانی ضروریات کی تکمیل کو اپنا مقصد بتاتی ہے اشتراکیت اور فاشسیت جمہوریت کے رجحان کی ہی صورتیں ہیں جو نفس کی آرام طلبی کو آزادی کی خواہش سے تعبیر کرتی ہیں۔

اس طرزِ فکر کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ایلیٹ نے اس لادینی کے خلاف، جو نشاط الثانیہ سے ترقی کی نمایاں صفت ٹھہرائی جا رہی تھی، علم اٹھایا۔ ترقی ارتقا، لادینی سب انفرادیت کو اہم قرار دینے کی وجہ سے رائج ہوئے۔ ان کا اخلاقی اثر یہ ہوا کہ زعم اور غرور انسان کی فطرت مانی جانے لگی۔ مذاہب نے غرور کو شیطان سے وابستہ کیا تھا اور انسان کے لئے انکساری کو لازم ٹھہرایا تھا۔ ایلیٹ بھی انکساری کو وہ عقلمندی بتاتا ہے جو کبھی ہم اس دنیا میں حاصل کر سکتے ہیں اور جس کو ہی دوام ہے۔ انفرادیت پسندی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سماجی برائیوں پر کڑی تنقید کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ ہر برائی کو سیاسی یا اقتصادی نظام سے وابستہ کیا جاتا ہے اور امید یہ کی جاتی ہے کہ کسی اتفاقیہ تبدیلی سے طاقت صحیح لوگوں کے ہاتھ میں آجائے گی اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس لئے انسان برابر انقلابی ذہنیت کا دلدادہ ہوتا جا رہا ہے اور کسی چیز کی بابت کچھ بھی نہیں طے کر پاتا۔ جدت کے لئے بھی انکساری ضروری ہے کیونکہ غرور سے پیدا ہونے والی جدت میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جو عام رواج بلکہ فیشن سے بالاتر ہو۔ اصل میں سماج کا نظام ایسا ہونا چاہئے کہ اوپر سے نیچے تک کلچر کی سطحوں کا ایک زینہ سا بن جائے جس میں اوپر کے زینے زیادہ تہذیب یافتہ نہ ہوں بلکہ کلچر کا زیادہ بہتر شعور رکھتے ہوں۔ اس طرح ایک اونچا طبقہ ہونا لازمی ہے۔ اسی اونچے طبقہ سے شاعر اور نقاد ظہور کریں گے کیونکہ ان کے لئے عام سے زیادہ ادراک اور زبان پر قابو کی ضرورت ہے۔ اس اونچے طبقوں کے لوگوں کا مذہبی ہونا ضروری ہے کیونکہ مذہب انسانی زندگی کو مافوق بشر زندگی سے ملاتا ہے اور ایک عینی عمل کی طرف لے جاتا ہے۔ مذہب کے معنے کچھ عمل کچھ رسمیں کچھ خیالات اور کچھ عقائد ہیں جو وحی کے ذریعہ حاصل ہوئے تھے۔ کلیسا ان سب کو ایک خاص شکل دیتا ہے اس لئے مذہب کے لئے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ کلیسا سے متعلق رہے اور مذہبی آدمی وہ ہے جو کلیسا کے احکام پر اپنی انفرادیت کو ترجیح نہ دے۔ پروٹسٹنٹ مذہب غلط ہے کیونکہ وہ کلیسا کے ادارے کو ختم کرتا ہے۔ بہترین مذہب رومن کیتھولک ہے جو رسموں اور دوسرے عوامل کی پابندی پر زور دیتا ہے۔ مذہب کے عام قاعدوں سے تجاوز خطروں سے خالی نہیں ہے اس لئے پابندی کا پہ زیادہ سخت زور ہونا چاہئے، تعلیم کا مقصد انفرادیت کو نمایاں کرنا نہیں بلکہ اسکو سماج سے ہم آہنگ

کرنا ہو تو بہتر ہے۔ تعلیم سے ایسے افراد ظاہر ہوں جو ذاتی ترقی سے زیادہ پورے سماج کے مفاد پر وقت صرف کریں۔ ایلیٹ کے خیالات سے واقف ہو کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نشاۃ الثانیہ ایک تباہ کن سانحہ تھا اور ہمیں قرونِ وسطےٰ کی طرف واپس جانا چاہیے ورنہ ہم برباد ہو جائیں گے

ایلیٹ کی یہ فکر ایک عجیب کیفیت رکھتی ہے کیونکہ یہ انقلابی خیالات رکھنے والوں کو منقلب کرتی ہے۔ یہ ہے رجعت کے راستے پر مگر اس کو محض رجعت پسند کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ نئی روشنی جو نشاۃ الثانیہ سے پھیل کر تمام دنیا پر حاوی ہوتی چلی گئی اپنی جگہ پر کوئی کامل چیز نہ تھی اور وہ قرونِ وسطےٰ جس کو مطعون کرنا ہر تہذیب یافتہ آدمی کا فرض ہو گیا تھا اس قدر ناقص نہ تھا جیسا کہ مان لیا گیا تھا۔ ایلیٹ سے پہلے بھی رسکن ایسے لوگ قرونِ وسطیٰ کو نشاۃ الثانیہ پر ترجیح دیتے رہے تھے مگر ان کی آواز صدا بصحرا ہو گئی تھی۔ ایلیٹ کے سلسلے میں صرف یہ ہوا کہ اس کی آواز نے زیادہ زور اختیار کیا اور اسکو سننے والوں نے بھی زیادہ توجہ دی۔ اس کی ایک وجہ تاریخی ہے اور دوسری عصری۔ یورپ میں یونانی نظریۂ حیات جسکو ہیلنزم Hellenism کہتے ہیں عرصے سے حاوی تھا قرونِ وسطیٰ میں عیسائیت نے اسے بالکل دبا دیا اور عبرانی قوم کا خاص نظریہ جس کو Hebraism کہتے ہیں غالب ہو گیا۔ نشاۃ الثانیہ یونانی نظریہ کی طرف رجعت لائی مگر کیونکہ یورپ کے رہنے والوں کا مذہب عیسائی ہی رہا لہٰذا دونوں نظریوں کے درمیان کش مکش یورپ کی فکر کی اہم ترین صفت رہی۔ نشاۃ الثانیہ کے مفکرین نے اُس تضاد کی طرف توجہ نہیں کی جو دونوں نظریوں کے درمیان تھا مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا یہ تضاد زیادہ سے زیادہ واضح ہوتا گیا یہاں تک کہ انیسویں صدی میں سائنس کی ترقی نے جو بنیادی طور پر یونانی نظریہ کا نتیجہ تھی عبرانی نظریہ کو جس کی حامل عیسائیت تھی بالکل قلم زد کر دیا۔ میتھیو آرنلڈ نے عبرانی نظریہ کو ترک کر کے یونانی نظریہ کی طرف آجانے کی دعوت دی اور یہ دکھایا کہ کلچر سے یونانی نظریہ ہی کا تعلق ہے۔ بیسویں صدی میں زیادہ تر مفکرین کا رجحان اسی طرف تھا کہ ایلیٹ نے عبرانی نظریہ کو اپنے طریقے پر اہمیت دی اور اس طرح اسنے اپنی طرف خاص توجہ مبذول کر لی۔ پھر عصر نے اس کی اس طرح مدد کی کہ پہلی جنگِ عظیم نے زیادہ تر لوگوں کا عقیدہ سائنس، یونانی نظریہ اور

لادینیت کی طرف سے پھیر دیا اور وہ مذہب کی طرف رجوع ہونے لگے۔ ایلیٹ کے خیالات جو مذہب میں بہت سخت عقیدے کا اعلان تھے بہت ہی امید افزا ثابت ہوئے چاہے اس کے خیالات کی جزئیات سے لوگ متفق ہوئے یا نہ ہوئے اسکے اثر کو ضرور اہم ماننے لگے اس طرح انقلابی ذہنیت کو منقلب کر کے استحکام کی ایک راہ دکھانا ایلیٹ کا نمایاں کام ٹھہرا۔

۳

عام افکار سے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا تعلق ضمنی تھا۔ اس کا خاص میدان ادب تھا۔ مگر اس کا مخصوص فکری رجحان اس کے ادبی نظریات اور تنقیدی خیالات کی بھی بنیاد بنا کیونکہ رومانی نظریۂ ادب جو بیسویں صدی کے شروع میں رائج تھا تاریخ کے ارتقائی نظریہ پر مبنی تھا۔۔۔ اس لئے ایلیٹ کو اس سے بھی سخت اختلاف کرنا پڑا۔ عام خیال یہ تھا کہ ادب میں اوریجنیلیٹی ادیب کی انفرادی آزادی پہ مبنی ہے اس لئے زوردار انفرادیت والے لوگ جیسے شیکسپیئر اور ملٹن انگریزی ادب کے سب سے بہتر نمائندے ہیں۔ کلاسیکی دور کے شاعر سچے شاعر نہیں بلکہ اچھے نثر نگار تھے اور رومانی تحریک نے پھر انگریزی شاعری کی روایات کو زندہ کیا جو انگلستان میں سوئنبرن اور امریکہ میں وٹمین تک جاری رہی۔ ایلیٹ نے اس عام رائے کو ہر ہر نقطہ پر غلط قرار دیا۔ اس کا مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" شاعرانہ عمل کا ایک نظریہ پیش کرتا ہے وہ شاعرانہ عمل کو "غیر انفرادی" بلکہ انفرادیت سے بچاؤ بتاتا ہے۔ شاعر کا ذہن محض ایک ایسے جزو کی طرح کام کرتا ہے جو کیمیاوی عمل کو پورا کرنے میں لو ممد ہو مگر خود اس سے وابستہ نہ ہونے پائے۔ اس عمل کی زیادہ بہتر مثال کلاسیکی شاعری ہے اور رومانی شاعری ایک محض خام کاری ہے جو شاعر کو روایات اور اصول سے آزاد کر کے کہیں کا نہیں رکھتی۔ وہ انفرادیت سے شروع ہوتی ہے اور انفرادیت ہی پر ختم ہو جاتی ہے اور تمام دنیا کو چھوڑ جاتی ہے۔ اسی لئے ایلیٹ کلاسیکی شاعری کو بہتر مانتا ہے مگر کلاسیکی شاعری کے بہترین نمونے اس کے لئے یونانی اور

رومی قدما نہیں ہیں بلکہ قرونِ وسطےٰ کے لاطینی ادیب اور دانتے ہیں۔ دانتے کو نشاۃ الثانیہ کا پیشرو مانا جاتا تھا مگر ایلیٹ اسکو عیسائی کلاسیکیت کا کمال بتاتا ہے وہ دانتے کی عظمت کی ایک وجہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کے زمانے میں یورپ ذہنی طور پر بہت متحد تھا نشاۃ الثانیہ نے اس عظمت کو ختم کر دیا۔ لہذا وہ کلچر جس کی پیداوار دانتے ہے اس کلچر سے بہتر ہے جسنے شیکسپیر کو جنم دیا۔ شیکسپیر کو مطعون کرنے کی تو اسے ہمت نہ ہوئی مگر اسنے یہ ضرور کہا کہ شیکسپیر کی شاعری کا مواد دانتے کی شاعری کے مقابلے میں بہت پست ہے کیونکہ دانتے نے عظیم فلسفۂ حیات سے عظیم شاعری کی عمارت بنائی جبکہ شیکسپیر نے پست اور مبہم فلسفۂ حیات پر اپنی عظیم شاعری کو ایستادہ کرنے کی کوشش کی۔ اس لئے شیکسپیر اپنی جگہ پر عظیم فرد ضرور ہے مگر جو محض شیکسپیر کو ماڈل مان کر شاعری کرے وہ زبان کو بگاڑ کر رکھ دینے سے آگے نہیں جا سکتا۔ اسنے یہ بھی ثابت کیا کہ "ہملیٹ" جو رومانی مذاق کے لئے عظیم ترین ادبی چیز ہے، اصل میں فن کے نقطۂ نظر سے ناکامیابی کی مثال ہے اور شیکسپیر کی ٹریجڈیوں پر کلاسیکی نقادوں نے جو اعتراضات کئے وہ صحیح ہیں۔ شیکسپیر کے ساتھ ساتھ نشاۃ الثانیہ کے تمام عظیم نمائندے جن سے شیکسپیر کا تعلق تھا غلط راہ پر جاتے دکھلائے گئے ہیں۔ مونتیں Montaigne سینیکا اور میکاولی Machiavelli جن سے شیکسپیر خاص طور پر متاثر تھا اسکی بربادی کا باعث کئے گئے ہیں۔

ایلیٹ کے زیادہ تر تنقیدی مضامین سترھویں صدی کے انگریزی ادب سے متعلق ہیں اس صدی کا اہم ترین تاریخی واقعہ یعنی سول وار اس کے لئے خاص طور پر دلچسپ ہے۔ کیونکہ اس واقعہ نے بادشاہ کے آسمانی حقوق کا تصور مٹا دیا۔ بادشاہت کی جگہ جمہوریت آگئی اور اس تخریب کی ابتدا ہوئی جو انفرادیت پر زور دیتی ہے۔ شیکسپیر۔ ٹورنر۔ بن جونسن اس سے بالاتر جا سکتے تھے مگر سنگر اور فورڈ اس سے دب گئے۔ سول وار نے پیوریٹانوں کو ہجرت پر مجبور کیا۔ تھیٹر بند کئے گئے۔ رومن کیتھولک کلیسا کو ختم کیا اور ملٹن کی شاعری وجود میں آئی۔ ان سب واقعات نے کلچر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور جدید دور وجود میں آیا۔ ایلیٹ کا قول ہے کہ سول وار اب تک ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ برابر جاری ہے کیونکہ ادب اسی راہ پر

جا رہا ہے جو ملٹن نے قائم کی۔ ملٹن نے زبان کو ایسے انفرادی طریقہ پر استعمال کیا کہ اسکے اور آنے والے شاعروں کے درمیان چین کی دیوار کی طرح کی حد فاصل قائم ہو گئی۔ ایلیٹ کی نظر میں ملٹن آنکھوں کا ہی اندھا نہ تھا بلکہ تخیلی اندھا بھی تھا کیونکہ اس کی شاعری میں بصری تاثرات پر صوتی تاثرات غالب ہیں۔ وہ راہ سے الگ ہو جانے والوں میں عظیم ترین مثال ہے اور ایغو کے کمال تک پہونچنے کی اہم ترین صورت ہے۔ ڈرائڈن سے انگریزی ادب کے راہ پر آجانے کا سامان ہوتا ہے۔ پوپ اور جانسن اس راہ کو قائم رکھتے ہیں مگر انگریزی ادب میں فرانس کے ریسین Racine کا سا کوئی شاعر نہیں پیدا کرتا۔ رومانی شاعروں میں پھر انفرادیت اور ایغو پرستی کا زور دکھائی دیتا ہے۔ بلیک ایک ایسا فلسفہ پیش کرتا ہے جو روایات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اور ورڈس ورتھ بھی کوئی تشفی بخش مقام نہیں حاصل کرتا۔ بائرن اور شیلی تو ایغو کو اس حد تک پہونچا دیتے ہیں کہ انسانیت اور شاعری دونوں کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ اس دور کی سب سے زیادہ اہم یوروپین ہستی گوئٹے بھی ایلیٹ کی نظر میں کچھ نہیں ہے کیونکہ گوئٹے نے فلسفہ اور شاعری دونوں میں دخل دیا مگر کسی میں کامیابی حاصل نہیں کی۔ جدید دور کے ادب کو بھی اسنے ذلیل بنایا۔ ہارڈی کی ہستی تمام اداریت سے فرار کرتی ہے۔ ڈی، ایچ لارنس ایک بیمار روحانیت کا شکار ہے۔ ساؤ۔ ویلز۔ رسل سب ایغو کا برا اثر دکھاتے ہیں اور انگریزی نثر کو برباد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کلچر کے خاتمے کی مثالیں ہیں۔ برخلاف ان کے ازرا پاؤنڈ۔ جیمس جوائس کیتھولک تہذیب اور کلاسیکی نظریہ کے نمائندے ہونے کی وجہ سے ادب کو صحیح راہ پر لارہے ہیں۔ اس تمام تخریبی تنقید سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایلیٹ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زور دار طرفداری میں بحث کرتے ہوئے سارے اس انگریزی ادب کو روندتا چلا جارہا ہے جس پر انگریز قوم کو ناز ہے۔ ظاہر ہے اس سے اتفاق بہت ہی کم کیا گیا بلکہ اسکی شدید مخالفت ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ کلاسیکیت اور رومانیت کی اصطلاحوں کو وہ اب ادبی سیاست کے آلے بناتا ہے ملٹن کے اثر کے بابت اپنی رائے تبدیل کرتا ہے اور اس کی بلینک ورس کی تعریف کرتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ہر بڑا

شاعر آخر کار ایک چین کی دیوار ہی بنا جاتا ہے۔ میتھیو آرنلڈ پر اسنے یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ ادب کو چھوڑ کر مذہب اور تہذیب کی طرف نکل گیا۔ اب ایلیٹ خود اسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ عیسائی سماج کی تعمیر اور کلچر اس کے لئے ادب سے زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔

اس تمام تنقید کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایلیٹ تہذیبی تخریب کا ڈنڈا ہاتھ میں لئے ہوئے ان تمام ہستیوں کو مارتا کاٹتا چلا جا رہا ہے جن کی قوم میں مقبولیت مستحکم ہو گئی ہے۔ اس کی سادگی اور خلوص بہرحال اثر رکھتے ہیں اور اس کے خیالات چونکا دیتے ہیں مگر غور کرنے پر یہ سب یکطرفہ ہی نظر آتے ہیں۔ ہر بڑے نقاد کی طرح وہ تمام یوروپین ادب کا جائزہ لیتا ہے اور اسے ایک خاص نظریے سے پرکھتا ہے۔ یہ عمل اسے ڈرائڈن ڈاکٹر جانسن۔ کولرج اور میتھو آرنلڈ کی سطح پر لے آتا ہے مگر ان عظیم نقادوں کیساتھ اسے جگہ دیتے وقت سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ پوری قوم کا ذوق ادب بدل دینے میں کامیاب ہوا کہ نہیں۔ اس کامیابی کا اندازہ لگانے کے لئے وقت درکار ہے۔ اس وقت ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ رومانی مذاق جو انگریزی ادب کے جانچنے کے لئے اٹل ہو گیا تھا ناکافی ضرور ثابت ہو گیا ہے۔ ایلیٹ کی علمبرداری نے ہمیں یہاں تک ضرور پہنچا دیا ہے —— چاہے اس سے آگے ہم اسکی راہبری کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اتنا بھی کر لینا اپنی جگہ پر اہم ہے کیونکہ تنقید کی اہمیت اس امر میں نہیں ہے کہ اس کے خیالات کو مذہبی عقائد کی طرح اٹل مان لیا جائے۔ تنقیدی خیالات کی زندگی اس میں ہے کہ ان کا بار بار اقتباس کیا جائے اور ان پر بحث کی جائے ان سے اختلاف کیا جائے۔ اس وقت ایلیٹ کی تنقیدی آرار کو یہ مقام ضرور حاصل ہو گیا ہے۔ کسی مصنف پر بھی ہم بات کریں ہمیں ایلیٹ کی رائے کو ضرور شامل کرنا پڑتا ہے چاہے ہم آخر میں ایلیٹ کو غلط ہی کیوں نہ ثابت کر دیں۔ ایسا کب تک ہوتا رہے گا یہ وقت ہی بتا سکتا ہے!

۴

ایلیٹ کی تنقید آرار سے زیادہ اس کے تنقیدی نظریات اہم ہیں کیونکہ اول الذکر میں یوروپین ادب کے طالب علم ہی کو زیادہ دلچسپی ہو سکتی ہے جب کہ آخر الذکر سے تمام دنیا

کے ادیب متاثر ہو چکے ہیں۔ یہ نظریات اس کی عام فکر اور اس کے مخصوص نظریۂ تاریخ اور کلچر سے الگ نہیں ہیں۔ اصل میں ایلیٹ اپنے مخصوص فکری نظریہ کے ماتحت ادیب کی ہستی اور اس کے ادبی کاموں کی نوعیت کو واضح کرتا ہے اور اس سلسلے میں بھی وہ نشاۃ الثانیہ سے شروع ہو کر رومانیت کے عروج تک ان تمام بنیادی اصولوں کے متضاد اصول پیش کرتا ہے جو ادب کے سلسلے میں دائمی حقائق کی حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ پہلا سوال جو وہ اٹھاتا ہے وہ ادیب کی اوریجینلیٹی کا ہے جو کسی فرد ادیب کو اہمیت دینے کے سلسلے میں شرط اول تھی کیونکہ نئی راہ نکالنے ہی میں ادیب کی بڑائی سمجھی جاتی تھی۔ خیال یہ تھا کہ ادیب کے اندر لکھنے کا جذبہ فطری طور پر پیدا ہوتا ہے اور وہ جتنا موجودہ ادب سے بے نیاز ہو کر لکھے اتنا ہی بڑا مجدد ہو گا۔ ایلیٹ نے بتایا کہ یہ غلط خیال ہے۔ تحریر کا شوق سابقہ تجربے سے فروغ پاتا ہے اور روایات کی مدد سے تکمیل کو پہونچتا ہے۔ ہر شاعر کے ورثہ میں ایک ادبی روایات کا دھارا ہوتا ہے جو قدیم ترین شعراء سے اس تک برابر چلا آرہا ہے اور جس کے وجود کا اسے اس طرح شعور ہوتا ہے جیسے سارا دھارا ایک وقت میں اور ایک مقام پر جمع ہو جائے۔ شاعر کا اپنی روایات سے تعلق شعوری ہو یا لاشعوری مگر اس کا ہونا لازمی ہے۔ شعوری طور پر اس تعلق کو مطالعہ کے ذریعہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ تعلق نہ ہو تو شاعری پڑھنے والوں پر اپنا اثر نہ کر سکے گی۔ سابق شعراء کے طرز کی نقل کو خامی کی مثال سمجھا جاتا ہے مگر جب کوئی شاعر اپنا الگ رنگ قائم کر لیتا ہے تو اس کا رشتہ سابق کے شاعروں سے اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ ایلیٹ کہتا ہے "اچھی شاعری کی پہچان یہ ہے کہ شاعر نے کس طرح سے سرقہ کیا۔ خام شاعر نقل کرتے ہیں۔ پختہ شاعر صاف چرا لیتے ہیں"۔ ایلیٹ خود کی نظمیں ان صاف چوریوں کی مثال ہیں۔ یہ چوریاں مختلف شاعروں سے پورے پورے مصرعے لے آنے کی ہیں۔ اور یہ مصرعے بہت سی زبانوں سے لئے گئے ہیں۔ شاعر کے لئے اپنی زبان کے علاوہ بھی زبانیں جاننا ضروری ہے۔ ایلیٹ کے یہاں یورپ کی زبانوں ہی سے نہیں بلکہ سنسکرت کے بھی مصرعے نظر آتے ہیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاعری جس میں تلمیحات اور سرقے ہوں عجیب کیفیت رکھتی ہے۔ ایلیٹ شاعری کی خوبی کو اس کے آسانی سے یاد ہو جانے سے

جانچتا ہے اور اس کی شاعری ہمیں اور بھی زیادہ آسانی سے اس لئے یاد ہو جاتی ہے کہ اس
میں ان اشعار کے الفاظ میں جو ہمیں یاد ہیں یہ سرقے اکثر شعوری طور پر بھی کئے جاتے ہیں
مگر زیادہ تر تخلیقی عمل لاشعوری ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شاعر کو یہ نہیں خیال ہوتا کہ وہ کیا کہنا
چاہتا ہے جب تک کہ اس کے ذہن میں الفاظ نہیں جمع ہو جاتے۔ اور جب یہ الفاظ
جمع ہو جاتے ہیں تو وہ بات جو وہ کہنا چاہتا ہے الفاظ میں ضم ہو کر نظم کو وجود میں لے آتی
ہیں۔ شاعر کے ذہن میں جو چیز سب میں نمایاں ہوتی ہے وہ ایک قسم کا راگ یا وزن
ہوتا ہے جو فوراً ہی الفاظ میں ظاہر ہونے لگتا ہے اور اس کے بعد خیال اور تصور وجود میں
آتے ہیں۔ یہاں شاعر کی انکساری اس کے لئے سب سے اہم مددگار ثابت ہوتی ہے کیونکہ
اگر وہ خود پسند ایغو کو درمیان میں لے آئے تو سارا معاملہ بگڑ جائے۔ جو شاعر مکمل انکساری
برت لیتے ہیں ان کی زبان میں ایک خاص صفائی اور چمک آجاتی ہے اور موضوع و زبان
ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ ایک دوسرے پر ترجیح نہیں دی
جا سکتی۔ اس سلسلے میں ایلیٹ Emotion یا جذبہ کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے اور
اس سے عام معنوں کے علاوہ پیچیدہ تصورات اور خیالات کو آمد کے ساتھ پیش کرنے کے
معنے بھی لیتا ہے۔ وہ ایک اور لفظ Sensibility یا ادراک بھی استعمال کرتا ہے
جس سے اس کا مطلب عام معنوں کے علاوہ باریکی، نزاکت اور تہذیب بھی ہوتا ہے۔

شاعری کی تخلیق کے سلسلے میں اس کا جو فقرہ سب سے زیادہ مشہور ہے وہ
Objective Correlatives ہے جب موزوں الفاظ اپنی اپنی جگہ
آجاتے ہیں تو جو تصورات اور خیالات ان الفاظ کے ذریعہ سامنے آتے ہیں وہ جذبہ کا
ایسا عالم پیش کرتے ہیں جو قاری کے لئے قابلِ فہم ہو سکتا ہے ـــــــ یہ عالم ہی
Objective Correlative ہے۔ عظیم شاعری میں ہمیں متنوع تجربے ہم آہنگ
ہو کر نظر آتے ہیں اور شاعری کی عظمت اس آہنگ کے زور میں ہوتی ہے۔ اس درجہ
کی شاعری فرسودہ۔ غائب شدہ۔ صوتی۔ جدید۔ عام۔ تعجب انگیز، حد سے زیادہ قدیم
اور حد سے زیادہ تہذیب یافتہ عناصر کو ہم آہنگ کرتی نظر آتی ہے اور اس لئے اس

میں ایک تجربے کے ذریعہ لاتعداد تجربوں کی طرف لے جانے کی طاقت ہوتی ہے۔ وہ دانتے کی پیرا ڈیسو Paradiso کے آخری کینٹو کو مثال میں پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہی حقیقت میں صحیح چیز ہے۔ یہی گوناگوں قسم کے حس میں رشتے پیدا کرنے کی طاقت ہے۔ یہی شاعر کی قوت کا کمال ہے۔ اعلیٰ ترین شاعر ادراک کی وہ قوت رکھتے ہیں جو مختلف قسم کے تجربوں کو ایک ساتھ جذب کرتی ہے۔ اس قوت کے دو پہلو ہیں ــــ ایک خارجی اور دوسرا داخلی۔ یہ مصوری اور موسیقی سے مشابہ ہوتے ہیں۔ شاعری لاشعور کی ان گہرائیوں میں جہاں ایغو نہیں پہونچ سکتا ایک قسم کے وزن کی طرح شروع ہوتی ہے۔ اس وزن کا وجود میں آجانا صوتی تخیل Auditory Imagination ہوتا ہے یہ شاعر کا کام کوئی بات کہنا نہیں ہوتا بلکہ ایک وزن کو ادا کر دینا ہوتا ہے اور اس معاملے میں موسیقی کے مشابہ ہوتا ہے کیونکہ شاعری کا وجود پہلے پہلے راگ کا سا ہوتا ہے۔ پھر یہ وجود بصری تصورات کی حالت میں آجاتا ہے جو معنے اور راگ کی حدوں کو ملا دیتے ہیں۔ تصورات ہی میں خیالات چھپے ہوتے ہیں کیونکہ شاعر کے لئے خیال اور جذبات مل کر ایک تخیلی وجود کا ظہور کرتے ہیں۔

نفس شاعری کے بابت ان سب رایوں سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایلیٹ اس قسم کی شاعری کا دلدادہ ہے جسے ڈاکٹر جانسن نے مابعد الطبعاتی Meta-Physical کہا تھا جس میں خیالات اور تصورات بشتر زبردستی یکجا کئے ہوئے ملتے ہیں۔ اسی کو وہ متحد ادراک Unified Sensibility کہتا ہے۔ یہ سترھویں صدی کے انگریزی شاعروں میں جو ڈن Donne کے پیرو تھے نظر آتی ہے یا پھر جدید دور میں فرانس کے اشاراتی شاعروں (Symbolists) کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ تمام شاعر مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں اور ایلیٹ یہ کہتا ہے کہ ہماری تہذیب کے موجودہ حالات میں شاعر کا مشکل پسند ہونا لازمی ہے۔ متحد ادراک میں شاعر کی انفرادیت رخنہ انداز ہوتی ہے اور پھر وہ صورت پیدا ہوتی ہے جسے وہ Dissociation of Sensibility کہتا ہے یعنی اس میں معنے ادراک کا آہنگ بگڑ جاتا ہے۔ دونوں میں سے ایک چیز زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ وہ دکھاتا ہے کہ

رادیت کو اہمیت دینے کی وجہ سے انگریزی شاعری کا یہی حشر ہوا۔ انگریزی رومانی شاعر
کی مثال ہیں کیونکہ ان کے ہاں راگ اتنا اہم ہو گیا ہے کہ تصورات بالکل غائب ہو گئے
ی۔ الفاظ سنسنی پیدا کر کے رہ جاتے ہیں اور حقیقت تک نہیں پہونچاتے۔ اس لئے ایلیٹ
ان کی مخالفت کر کے اس شاعری کو وجود میں لاتا ہے جس کی سب سے زیادہ نمایاں صفت
Clear Visual Image ہیں ہمیں شک ہے کہ کیا ایلیٹ کی شاعری اس
ل صفت تک پہونچ گئی ہے۔ بہرحال اس میں روایات کا اثر ایک اہم چیز ضرور ہے مگر
یٹ نے ہمیں کہیں یہ نہیں سمجھایا کہ تخلیقی عمل میں روایات کس طرح شامل ہو جاتی ہیں مگر وہ
زور بتاتا ہے کہ سب سے زیادہ جدید حصے وہی ہوتے ہیں جن میں قدیم شعرا کا اثر جھلکتا ہے۔
م ہوتا ہے کہ اس کے حساب سے روایات سے ہم آہنگی ہی جدت کا دوسرا نام ہے۔ یعنی
ترین شاعرانہ فطرت رکھنے والا روایات میں اعلےٰ ترین طریقہ پر رچا ہوتا ہے۔ روایات
یروی کا ایک تو وہ درجہ ہے جسکو محض دستکاری کہا جائے مگر اعلیٰ فنی درجہ پر شاعر روایات
ائم رکھتے ہوئے انہیں ایسا موزوں بنا دیتا ہے کہ ہم کہہ اٹھتے ہیں کہ ایک جینئیس زبان
ے طریقہ پر استعمال کر رہا ہے۔ اصناف ادب کے سلسلے میں وہ جو کچھ کہتا ہے وہ صرف
مناف کے تعین تک لے جاتا ہے ایک وہ صنف جس میں شاعر اپنے آپ سے باتیں کرتا
ی اسے اپنی شاعری کے دوسروں پر اثر کا خیال نہیں ہوتا۔ دوسری وہ جس میں سننے والوں
خیال تخلیق کے دوران ہی لازمی طور پر آجاتا ہے۔ دوسری صنف کی بہترین مثال منظوم
ہے جس کے بابت اسنے بہت کچھ کہا اور جسکو انگریزی میں پھر سے زندہ کرنے کی اسنے
ب کوشش کی۔ منظوم ڈرامہ کا مرکزی مسئلہ عروض اور طرز سے تعلق رکھتا ہے اور اسکے
یں ایلیٹ نظم (Verse) کی بابت اپنے اُن خیالات کا اظہار کرتا ہے جو اس کی
کو خاص طور پر اور آزاد نظم کو عام طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہو جاتے ہیں۔ وہ نظم
(Ve اور شعر (Poetry) کے اختلاف پر بہت زور دیتا ہے۔ اول الذکر کے دائرے
شاعری آتی ہے جو سننے والوں کا خیال رکھ کر لکھی جاتی ہے اور یہ امر اسکی تعمیر میں بنیادی
ہے۔ اسکی سب سے معمولی شکل محض تک بندی ہے جو ایک روا روی کی حرکت کا اثر پیش

کرتی ہے۔ شعر کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قاری کا ذہن ایک قسم کی رکاوٹ اور قابو سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اس کے لئے سچی شاعری بنیادی طور پر بے ربط ہوتی ہے۔ ایلیٹ کی شاہکار نظموں میں بے ربطی کا وجود اسکے اس عقیدے کی بنیاد پر ہے۔ طویل نظم کو کامیابی سے لکھنے کے لئے شاعر کو نظم، شعر اور نثر سب کا مالک ہونا لازمی ہے کیونکہ طویل نظم یا ڈرامہ کی ساخت کا احساس قائم رکھنے کے لئے محض نظم ضروری ہے اور یہی نظم خاص موقعوں پر زور اختیار کر کے شعر ہو جاتی ہے۔ جو چیز نظم اور شعر کو ہم آہنگ رکھتی ہے وہ "عام طرز" ہے۔ یہ ان چند لوگوں کے، جو لکھنے میں اور ان کثیر تعداد کے درمیان جو ایک لازمی تعلق ہے۔ یہ طرز عام بات چیت کا طرز ہوتا ہے اور اس محض شاعرانہ طرز سے مختلف ہوتا ہے جسے عظیم کہا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال دانتے ہے شیکسپیر اور ملٹن اس سے الگ ہو گئے اور اس طرح تخریب کے علمبردار ہوئے۔ ڈرائیڈن پہلا شخص ہے جس نے شاعری کو عام بول چال کی زبان سے قریب لانے کی کوشش کی۔ ورڈسورتھ دوسرا اور اب ایلیٹ یا ازرا پاؤنڈ تیسرا۔ ایلیٹ انگریزی عروض کا جائزہ لیتے ہوئے ان سب اصولوں کو رد کر دیتا ہے جو ہمیں عروض پر کتابوں میں ملتے ہیں۔ نظم میں وہ تین اجزاء بتاتا ہے۔ ایک عروضی ترتیب دوسرا عام بول چال کا وزن اور تیسرا اتار چڑھاؤ کی ترتیب۔ انگریزی کی تمام منظوم چیزیں چاہے وہ قدیم نظمیں ہوں عوامی گیت ہوں، لوریاں ہوں ان اجزاء پر مبنی ہیں اور بحروں کی پابندی سے زیادہ ان میں موسیقی کے اصولوں کی پابندی نظر آتی ہے اس لئے اپنی نظموں کو بحروں کی پابندی سے اسنے آزاد کر کے موسیقی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ "آزاد نظم" کا بنیادی اصول یہی ہے۔ اس کی مثالیں اسے عہد ایلیزبتھ کے منظوم ڈراموں میں کثرت سے ملیں اور یہی اس کے لئے روایتی بنیاد ٹھہریں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی نظموں کے الگ الگ حصے ہیں جو موسیقی کی Movements سے مشابہ ہیں مصرعوں کی لمبائی۔ وزن کا التزام۔ قافیہ۔ پیمائی اور تمام عروضی اجزاء اس ایک اصول کے ماتحت چلتے ہیں۔ اس آزاد عروض کو ڈراموں میں برتنے پر اسنے خاص توجہ دی اور اور یہ دکھایا کہ ڈرامہ میں نظم کی نوعیت ڈرامہ دیکھنے والوں کے مذاق موسیقی سے ہم آہنگ ہونی چاہئے چنانچہ اس کے ہر منظوم ڈرامے میں آزاد نظم کو ایک آہنگ دے دینے کی کوشش ہے

جو جدید دور کے لوگوں کو اسی طرح قدرتی معلوم ہوتی ہے جیسے کہ پابند نظم عہد ایلیزبتھ کے لوگوں کو معلوم ہوتی تھی۔ ان تمام خیالات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زندگی بھی اپنا خاص وزن رکھتی ہے جو ہر مقام اور ہر دور میں بدلتا رہتا ہے اور شاعر کا کام کسی ٹکے بندھے وزن کے مطابق شعر کہنا نہیں ہے بلکہ اپنے چاروں طرف کی زندگی کا وزن محسوس کر کے اسے زبان کے ذریعہ ادا کرنا ہے۔ آزاد شاعری ظاہرہ تو محض الٹکل پچو اڑانا ہے جس سے زیادہ آسان اور کوئی کام نہیں ہو سکتا مگر حقیقت میں اس سے زیادہ مشکل اور کوئی کام نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے کامیابی سے برتنے کے لئے نظم کا وہ اعلیٰ شعور ضروری ہے جو محض فطری طور پر نہیں آتا بلکہ فطرت کے ساتھ طویل تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے ایلیٹ محض جوان شاعروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا بلکہ ان شاعروں ہی کو توجہ کے قابل سمجھتا ہے جو پچیس برس کے سن کے بعد بھی شاعری میں مصروف نظر آئیں۔

یہ ظاہر ہے کہ شاعری کا تعلق زبان سے ہے اور زبان ایک قومی چیز ہے۔ ایلیٹ کی زبان انگریزی ہے جسکو وہ شاعری کے لئے استعمال کرتا ہے اور اس زبان کی شاعری کی جو روایات ہیں ان کو ہی وہ اہمیت دیتا ہے اور ان کی ہی پابندی سے الگ نہیں ہٹنا چاہتا مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شاعری کے آفاقی اثر کا وہ قائل نہیں ہے۔ کسی فرد کے ایک مقامی سوسائٹی کے کلچر میں غرق ہو جانے کے معنے تو یہی ہوئے کہ شاعر حد سے حد قومیت تک جا سکتا ہے۔ مگر ایلیٹ یہ بتاتا ہے کہ مقامی کلچر یا ایک تہذیب یا ایک قوم میں ہمیں آفاقی حقیقت نہیں مل سکتی۔ عام طور پر کوئی شخص اپنے کو آفاق سے وابستہ نہیں کرتا جب تک کہ اسے کسی نیچے درجہ کی چیز سے وابستگی حاصل رہتی ہے۔ آفاقیت میں وہ تہذیبی انفرادیت بھی شامل ہونی چاہئے جو ہماری مقامی چیز ہے۔ اس سلسلے میں وہ تصوف یا اسراریت تک پہونچتا ہے۔ زمان و مکان کے تاثرات ایک دائمی مقام اور ایک نہ بدلنے والے وقت پہ آجاتے ہیں۔ بریڈلے Bradley کے فلسفہ سے وہ مطلق کا تصور لیتا ہے اور ہندو فلسفہ سے آتما کا۔ عیسائی مذہب سے حضرت عیسیٰ کی ہستی لے کر اسے ایک دائمی اشارہ بنا دیتا ہے۔ شاعری کو وہ ایسا مکمل تجربہ بتاتا ہے جو ایک وقت کا بھی ہے اور

پوری زندگی کا بھی۔ فن کا مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی پر ایک اصول عائد کر کے زندگی کے اصول کا اندازہ لگائے۔ فن بھی آفاقی فکر کی ایک ٹیکنیک ہے۔ اس کا اثر اطمینان پیدا کرتا ہے۔ شاعری ہمیں وہاں تک لے جاتی ہے جہاں تک ورجل دانتے کو لے گیا اور پھر ہمیں اپنی آسمانی عقل کے حوالے کر دیتی ہے۔ شاعری کا اثر شاعر کے مخصوص عقائد کے اثر سے نہیں بدلتا۔ ہر اچھی شاعری تمام دنیا کی شاعری کی نمائندہ ہو جاتی ہے۔ دانتے کی نظم کے بعد سب سے عظیم نظم وہ بھگوت گیتا، کو مانتا ہے۔ اس کا تصور ادب سے شروع ہو کر "یوروپی ذہن" کے تصور پر آجاتا ہے اور آفاقی ذہن پر ختم ہوتا ہے۔ یہ حالتیں ایک دائرے کے چاروں طرف دوسرا زیادہ بڑا دائرہ بناتی ہیں اور مقامیت آفاقیت سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔

جمیل جالبی

مفکّر نقّاد

ہر اُس شخص کے لئے، جس کی مادری زبان انگریزی نہیں ہے، ایلیٹ کی نثر اسکی شاعری سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور میں نثر میں اسکے ڈراموں کو اس لئے شامل سمجھتا ہوں کہ یہاں ایلیٹ نے نظم اور نثر کی حدود ملاکر عام بول چال کی زبان سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ من دونوں کے بیشتر رشتے ختم ہو کر ایک ہو گئے ہیں۔ یہی وہ 'وحدت' ہے جو ایلیٹ کے فن اور ایلیٹ کی شخصیت کی ممتاز خصوصیت ہے۔ اس وحدت کے معنی وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جو "لطیف اور جامع میڈیم" کے معنی سمجھتے ہیں اور جو اس بات کو نہ صرف جانتے ہیں بلکہ اس کا تجربہ بھی رکھتے ہیں کہ "فن شخصیت کے اظہار کا نام نہیں ہے بلکہ شخصیت سے فرار کا نام ہے۔"

جب میں ایلیٹ کی نثر کو ایک غیر اہلِ زبان کی حیثیت سے اس کی شاعری پر ترجیح دیتا ہوں تو اسکے معنی یہ ہیں کہ کسی زبان کی شاعری سے صرف وہی لوگ پورے طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو اس زبان کے لہجے اور تیور کو نہ صرف اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہوں بلکہ جن کے مزاج میں اس زبان کے کلچر کی روح چہک چہک کر بول رہی ہو اور جو اُن جذبوں اور ان محسوسات سے بخوبی واقف ہوں جو 'آفاقی' ہوتے ہوئے بھی 'قومی' ہوتے ہیں۔ "کسی زبان میں 'سوچنا' بمقابلہ اس زبان میں محسوس کرنے کے نسبتاً آسان ہے۔ اسی لئے کوئی فن بمقابلہ شاعری کے اتنی شدت کے ساتھ قومی خصوصیات کا حامل نہیں ہوتا۔" جب میں ایک غیر اہلِ زبان کی حیثیت سے ایلیٹ کی نثر کو اس کی شاعری پر ترجیح دیتا ہوں تو اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ میں اس کی شاعری کی اہمیت کو جھٹلا رہا ہوں یا میں اس کی شاعری سے

ایک حد تک لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ اس بات کا اعتراف مقصود ہے کہ میں انگریزی میں سوچ تو سکتا ہوں محسوس نہیں کر سکتا۔ شاعری میں محسوس کرنے کا عمل بمقابلہ نثر کے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے ایلیٹ کی نثر نے، اس کی شاعری سے ایک حد تک لطف اندوز ہونے کے باوجود، مجھے ہمیشہ مسحور کیا ہے اور میں نے خیال سے لے کر جملوں کی ساخت، لہجہ کی ادا، بات کے ڈھنگ تک سے وابستگی محسوس کی ہے۔ پھر ایک بات یہ کہ اس کی نثر اور خصوصاً ادبی تنقید اس کی شاعری کے مقصد کو آگے بڑھانے کے باوجود ایسی خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہے جو خود اس کی شاعری کی نفی کرتی ہیں۔ نہ صرف نفی کرتی ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الگ الگ دو آدمی ہیں جو ایک حد تک ہم خیال ہوتے ہوئے بھی بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور جن میں سے ایک نثر لکھتا ہے اور دوسرا شاعری کرتا ہے۔ یہ عمل ادب کی تاریخ میں کبھی کبھار ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں لے دے کر مولانا حالی کی مثال ملتی ہے۔ ایک جگہ ایلیٹ خود اس بات کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے کہ "اپنی تنقید میں اگرچہ میں انتہائی صحیح رائے پیش کرتا ہوں لیکن میں اپنی شاعری میں خود ان کی خلاف ورزی کرتا ہوں اور اگر آپ اسے منافقانہ بات نہ بھی سمجھیں تو بھی میں ایک طرح سے دو روپ میں ظاہر ہوتا ہوں۔" ایلیٹ کے یہ 'دو روپ' ایک حد تک مربوط ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی نفی بھی کرتے ہیں۔ اسی لئے اس کی تنقید سے اس کی شاعری کی تاویل کرنا ایک ایسی غلطی ہے جو ایک طرف اس کی شاعری سے لطف اندوزی کو مجروح کرتی ہے اور دوسری طرف اس کی تنقید کو ایک مقررہ لیکن غلط رُخ دے دیتی ہے۔ اسی لئے جب میں ایلیٹ کی نثر کو اس کی شاعری سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں تو اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ میں اس کے تنقیدی کارناموں کو اپنی زبان کے لئے اس کی شاعری سے زیادہ مفید سمجھتا ہوں اور دوسرے یہ کہ اس کی تنقید اس کی شاعری کا ایک ذیلی حصہ نہیں ہے بلکہ شاعری سے الگ ایک زندہ سرگرمی ہے۔ شخصیت کے اسی دو رُخے پن کی وجہ سے اس کا تنقیدی شعور اس کی تخلیقی صلاحیت کو غصب نہیں کرتا۔ مثلاً ایلیٹ کا تنقیدی شعور بہت لطیف ہے۔ وہ کلاسیکیت کا حامی ہے۔ اس کا مطالعہ اور اس کی

دلچسپیاں ایسی نظموں اور ایسے شاعروں سے زیادہ ہیں جو خود اس کی اپنی شاعری سے بالکل متضاد و مختلف ہیں۔ دلچسپیوں کے اس تضاد کی وجہ سے اس کی تخلیقی صلاحیت اس کے تنقیدی فیصلوں کو اور اس کا تنقیدی شعور اس کی تخلیقی قوت کو غصب نہیں کرتے بلکہ دونوں کو الگ الگ محفوظ رکھتے اور پرورش پانے میں مدد دیتے ہیں۔ اسی لئے ایلیٹ بیک وقت شاعر بھی بڑا ہے اور نقاد بھی۔ ذہن اور شخصیت کے اس توازن کا اندازہ وہ لوگ آسانی سے کر سکتے ہیں جنہوں نے ایسے ہی پل صراط پر چلنے کی کوشش کی ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ ایلیٹ کی شخصیت میں تنقید اور تخلیق کا عمل ایک دوسرے کے ساتھ اس طور پر گڈمڈ نہیں ہو جاتا کہ دونوں کی الگ شان باقی نہ رہے۔ مثال کے طور پر اس کے مذہبی عقائد جنہیں میری طرح اور لوگ بھی رجعت پسندانہ سمجھتے ہیں، اسے اچھی شاعری سے لطف اندوز ہونے سے معذور نہیں کر دیتے۔ اپنے مذہبی عقائد کے باوجود وہ جمالیاتی اثر کو مذہبی اثر سے، اخلاقی سیاسی اور سماجی اثر سے آزاد اور الگ سمجھتا ہے۔ وہ شاعری کی بابت ایک طرف یہ کہتا ہے کہ اس کا مقصد خود اس کے اندر موجود ہے اور ساتھ ساتھ وہ نہ صرف لادینی شاعروں سے بلکہ غیر مذہبی شاعروں سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے۔ بودلیئر والے مضمون سے میں ایلیٹ کے نقطۂ نظر اور اسکے انداز فکر کو تو سمجھ سکتا ہوں لیکن اس کی شاعری کو نہیں۔ اسی لئے دانتے والے مضمون کو پڑھ کر میں اسکی فکر، اس کے تنقیدی شعور کی داد تو دے سکتا ہوں لیکن دی ویسٹ لینڈ، دی ہولومین، برنٹ نورٹن، ایسٹ کوکر، لوسونگ اوف جے الفریڈ پروفرک وغیرہ کے سمجھنے میں مجھے کوئی خاص مدد نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ ملٹن کی عیسائیت کے باوجود وہ اسکی شاعری کی عظمت کا منکر ہے اور اس وقت تک منکر رہتا ہے جب تک مذہبی عقائد اور مذہبی مسائل ضعف جسم اور موت کے احساس کے ساتھ، اس کے فکر و احساس میں اس درجہ غلو اختیار نہیں کر لیتے کہ وہ تصوف کے گنبد بے در میں چکر لگاتے ہوئے اپنے پہلے مضمون (۱۹۳۶ء) پر اظہار افسوس کرتا ہے اور اس قسم کے دلائل دیتے ہوئے ملٹن کی دوبارہ توصیف کرتا ہے کہ "ملٹن صرف اس وجہ سے بھی عظیم شاعر

کہ اس کے بعد کوئی بھی ملٹن کی طرح کی شاعری نہ کر سکا۔" یہ بات ہر ٹٹ پوبخیے شاعر کے بارے میں اسی وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ اس پورے مضمون میں وہ ملٹن یا جنت گم گشتہ، کے بارے میں کسی بڑے سوال کا جواب نہیں دیتا۔ اس ذہنیت کے ساتھ ممکن ہے ایلیٹ پیر و مرشد تو بن گیا ہو لیکن اس کا تنقیدی شعور کمزور پڑ کر کند ہونے لگتا ہے۔ بہرحال ملٹن (۱۹۳۶ء)، دانتے (۱۹۲۹ء)، بودلیئر (۱۹۳۰ء) وہ مضامین ہیں جو بنیادی طور پر اس کی شاعری کی نفی کرتے ہیں اور اگر ان مضامین کی مدد سے اس کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ کوشش بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے میر کے کلام سے ایک مربوط نظام حیات تلاش کیا جائے یا داغ کی شاعری کو صوفیانہ شاعری ثابت کیا جائے۔ بہرحال آخری عمر کی تحریروں کو چھوڑ کر ایلیٹ کی شخصیت اور اسکے فن میں ایسے دو روپ ملتے ہیں جو ایک ہو کر بھی الگ الگ ہیں اور جہاں تنقیدی شعور تخلیقی قوت کو اور تخلیقی قوت تنقیدی شعور کو غصب نہیں کرتے۔ اب اگر میں ایلیٹ کی نثر کو شاعری پر ترجیح دیتا ہوں یا اسے ایک الگ سرگرمی کے طور پر دیکھتا ہوں تو شاید یہ بات اب اتنی بے معنی نظر نہ آئے جتنی شروع میں نظر آئی تھی۔

(۲)

یہ دیکھنے کے لئے کہ تنقید کے سلسلے میں ایلیٹ کا بنیادی نظریہ کیا ہے اسکے بہت سے مضامین کے علاوہ میری نظر اس کے ایک مضمون "تنقید کا منصب" پر جاتی ہے جہاں وہ تخلیق اور تنقید پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ فن اپنے علاوہ بھی کچھ اور مقاصد کا ادعا کر سکتا ہے لیکن خود فن کے لئے ان مقاصد سے باخبر ہونا ضروری نہیں ہے اور فن درحقیقت اپنا منصب، وہ جو کچھ بھی ہو، اقدار کے مختلف نظریات کے مطابق، زیادہ بہتر طریقہ پر اُن سے بے خبر رہ کر ہی انجام دے سکتا ہے۔ برخلاف اس کے تنقید کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ کسی مقصد کا اظہار کرے" ایلیٹ، اپنے مخصوص معنی میں تخلیق کے لئے بے خبری کو شرط قرار دیتا ہے اور تنقید کے لئے باخبری کو۔ یہاں تنقید میں شعور کی سطح واضح ہے۔ فکر اور اسکے وہ بنیادی مسائل اہمیت رکھتے ہیں جن پر ادب کی

بنیاد قائم ہے اور جن سے معاشرہ کی تہذیبی روح قوت حاصل کرتی ہے۔ فکری تنقید کے بغیر آج کا ادب ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ جب تنقید کے ساتھ میں 'فکر' کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس سے میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں جب سائنس نے فلسفے کو غیر اہم بنا دیا ہے اور فلسفہ رفتہ رفتہ سائنس کی مختلف شاخوں میں تقسیم ہو کر خود بے معنی ہوتا جا رہا ہے میں ادبی تنقید کے ذریعہ وہ کام انجام دینا چاہتا ہوں جو ایک زمانہ میں ادب اور فلسفہ الگ الگ انجام دیتے تھے۔ اسی لئے میں اس تنقید کو جو فکر سے عاری ہے ادب کے دائرہ سے بھی خارج سمجھتا ہوں۔ ہمارے ہاں اس تنقید کے علمبردار وہ لوگ ہیں جو ایلیٹ کے الفاظ میں "وہ استاد ہیں جو نقاد بن گئے ہیں" اور جن کی تنقیدی سرگرمیاں پہلے پہل کلاس روم میں رو پذیر ہوئیں۔ تنقید کی یہی وہ قسم ہے جسے میں "نصابی تنقید" کا نام دیتا ہوں۔ اس 'تنقید' نے ایک طرف خود تنقید کی تخلیقی سطح کو بے معنی بنا دیا ہے اور دوسری طرف اصلاح مذاق، خیال کی پیدائش، ارتقا اور ذہن کی تربیت کے عمل کو بند کر دیا ہے۔ مثلاً اس تنقید کا ایک زہریلا اثر تو یہ ہوا ہے کہ آج کا طالب علم کسی اوریجنل تصنیف کے بارے میں اپنا کوئی تجربہ نہیں رکھتا۔ اسے ادب پاروں سے کوئی گہری دلچسپی نہیں ہے بلکہ نصابی نقادوں کی رائیں ادب پاروں کا بدل بن گئی ہیں۔ اس زہریلے اثر نے سوچنے کی صلاحیت کو مردہ کر دیا ہے اور ادب پاروں کے ساتھ ذہنی سفر کو ایک بے معنی چیز بنا دیا ہے۔ نصابی نقادوں کی آرا کی بیساکھیاں نوجوان طالب علموں کے پاس ہیں اور ادبی فیصلوں کے کیپسول ان کے ذہن کے خانوں میں رکھے ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنی ساری ضروریات پوری کر لیتے ہیں جعلی دستاویزیں، نقلی مہروں کے ساتھ، اصل کی جگہ چل رہی ہیں —— اور یہ صورتِ حال ایسی ہے کہ اس پر جس قدر تشویش کا اظہار کیا جائے کم ہے۔

اسی صورتِ حال کی وجہ سے تنقید ایک دوسرے درجہ کی سرگرمی بن کر رہ گئی ہے جو تخلیق کی ضد ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو حقیقی تنقید حقیقی تخلیق کی ضد ہرگز نہیں ہے۔ ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "جب تک ادب ادب رہے گا اس وقت تک تنقید کے لئے جگہ باقی رہے گی کیونکہ تنقید کی بنیاد بھی اصل میں وہی ہے جو خود ادب کی ہے

تنقید اور تخلیق کے بنیادی رشتے کو سمجھنے کے لئے بجلی کی اس لہر کی مثال دی جا سکتی ہے جو ایک طرف کمروں کو روشن رکھتی ہے۔ پنکھے چلاتی ہے اور پانی ٹھنڈا کرتی ہے اور دوسری طرف پیڑا بنتی ہے، تصویریں دکھاتی ہے اور دنیا بھر کی خبریں آناً فاناً ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی ہے۔ یہ سب کام نوعیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ان سب میں بجلی کی ایک ہی لہر کام کر رہی ہے اور بنیادی طور پر وہ وہی رہتی ہے۔ اسی طرح تنقید کی بنیاد بھی اصل میں وہی ہے جو خود ادب کی ہے۔ تنقید کو غیر تخلیقی سرگرمی سمجھنا اس بات کی علامت ہے کہ ہم ادب کے معنی و مفہوم، مزاج و نوعیت، حدود و ماہیت سے واقف نہیں ہیں۔ تخلیق میں تنقید کا عنصر اور تنقید میں تخلیق کا عنصر اپنے اپنے طور پر موجود رہتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو نہ تخلیق تخلیق رہتی ہے اور نہ تنقید تنقید۔

اس تنقید کی اہمیت جس کا میں یہاں ذکر کر رہا ہوں اور جس کا ایک ذمہ دار نمائندہ ایلیٹ ہے، یہ ہے کہ ہر نسل کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تنقید خود پیدا کرے اور اپنی فکر کے پیمانوں اور معیاروں کا از سر نو جائزہ لے۔ اگر کوئی نسل اپنی تنقید پیدا کرنے سے قاصر رہی ہے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ ادب میں اور نہ صرف ادب میں بلکہ پورے نظام خیال میں جس کا اظہار اس معاشرے کے کلچر میں ہو رہا ہے، سخت گڑبڑ، سخت انتشار اور بحران موجود ہے۔ اس بحران کے معنی وہ لوگ بخوبی سمجھتے ہیں جو کلچر اور ادب کے تعلق کو جانتے ہیں اور ادب کو کلچر کی تشکیل جدید کا ایک اہم اور بنیادی ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اپنے ادب، اپنے معاشرے اور اپنے کلچر پر نظر ڈالئے تو موجودہ تخلیقی ناکارہ پن اور تہذیبی و معاشرتی بحران کے اسباب سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ کیا ہم اپنے ادب کو دیکھ کر اپنی نسل کے کسی نقطۂ نظر کی نشان دہی کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اس تنقید کا پتہ بتا سکتے ہیں جو ہماری نسل نے پیدا کی ہے؟ کیا ہمارے پاس اپنے کوئی ایسے پیمانے، کوئی ایسے معیار ہیں جن سے ہم اپنے ماضی کا نہ صرف ماضی کا بلکہ حال کا جائزہ لے سکتے ہیں؟ اپنے دور میں سرسید کی نسل نے اپنے تنقیدی معیار بنائے تھے۔ اکبر کی نسل نے بھی اپنے طور پر تنقید کے اپنے پیمانے اور معیار بنائے تھے۔ اقبال کی نسل نے بھی اپنی تنقید خود پیدا کی تھی یہاں تک کہ ترقی پسندوں نے بھی

جنہیں ہم لوگ بے وجہ مطعون کرتے رہتے ہیں، اپنی تنقید خود پیدا کی تھی۔ لیکن ۴۷ء کے بعد سے، چند مبہم اور جذباتی باتوں کو چھوڑ کر، ہم کسی ایسے تنقیدی معیار کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے جسے ہم اپنی نسل سے منسوب کر سکیں۔ ہماری تنقید انہی از کار رفتہ طریقوں اور انداز فکر کی تقلید کر رہی ہے۔ انہی مقاصد کو دہرا رہی ہے اور انہی ذہنی کیفیات کا اظہار کر رہی ہے جن کو ہماری پچھلی بلکہ پچھلی سے پچھلی نسل نے پیش کیا تھا۔ ہماری نسل کے پاس اپنی تنقید اور اپنے معیار نہ ہونے کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ۴۷ء کے بعد سے ہم فراقؔ گورکھ پوری، حسن عسکری اور کلیم الدین احمد سے آگے نہیں بڑھے ہیں اور ہم جوشؔ، راشدؔ، مجازؔ اور فیضؔ سے بڑے یا کم از کم اُن کے برابر کے شاعر بھی پیدا نہیں کر سکے ہیں۔ اس تخلیقی ناکارہ پن کا سبب یہ ہے کہ ہماری نسل اپنی تنقید پیدا کرنے سے معذور ہو گئی ہے اور یہ بات اتنی تشویشناک ہے کہ اس سے ساری تہذیبی روح کے مُردہ ہو جانے کا امکان پیدا ہو گیا ہے لیکن اس خطرہ کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو تنقید کی تخلیقی قوت کے معنی سمجھتے ہیں۔ ایلیٹؔ کے الفاظ کا سہارا لے کر میں اپنی نسل پر یہ بات واضح کرنا چاہوں گا کہ "تنقید اتنی ہی ناگزیر ہے جتنا خود سانس لینا۔"

(۳)

جیسا کہ میں نے کہا ہر زندہ نسل، اپنی تنقید، اپنے معیار اور پیمانے خود بناتی ہے اسی سے توصیف کے پیمانے بنتے ہیں اور اسی سے گمنام ادیب اور ادبی ادوار دوبارہ اہمیت حاصل کرتے ہیں اور نامور ادیب اور ادوار گوشۂ گمنامی میں جا چھپتے ہیں۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ ہر دور اپنے پچھلے دور سے ذہنی، سماجی، تہذیبی و فکری اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کی ضروریات، تقاضے اور عوامل جدا ہوتے ہیں۔ ہم اپنے والدین سے اس اعتبار سے مختلف ہیں اور ہمارے بچے ہم سے مختلف ہوں گے۔ اسی لئے پرانے معیاروں پر ہمیشہ نظرثانی کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ نئے معیار، جو اس نسل کی ضرورت

اور تقاضوں کو پورا کر سکیں، تلاش کئے جا سکیں۔ یہ کام اتنا بڑا ہے کہ وہ ادیب یا ادیبوں کی وہ جماعت جو اسے انجام دیتی ہے ادب و تہذیب میں خود تاریخی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ سرسید اور حالی اسی لئے بڑے اور اہم ہیں۔ کالرج اور میتھو آرنلڈ اسی لئے تاریخ میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ جدید دور میں ایلیٹ کی بھی یہی اہمیت ہے۔ آپ اس سے ہزار اختلاف کریں لیکن اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آپ اسے رجعت پسند کہیں لیکن اس کی رائے کا حوالہ دینا اس لئے ضروری ہوگا تاکہ آپ ترقی پسندی کو پہچان سکیں۔ ایلیٹ نے اپنی نسل کے لئے جو معیار اور پیمانے بنائے اُن کے ساتھ ہی دورِ ایلیزبیتھ کے ڈرامہ نگار دوبارہ مقبول ہو گئے اور اُن میں اس نسل کو نئے معنی نظر آنے لگے۔ نہ صرف یہ بلکہ انیسویں صدی کے مقبول شعراء ٹکسال باہر ہو گئے۔ ملٹن کی شہرت اور شاعرانہ عظمت مشتبہ ہو گئی۔ ڈرائڈن اور پوپ دوبارہ مقبول ہو گئے۔ سترھویں صدی کے مابعد الطبیعاتی شعراء، جو اب تک ایک عجیب و غریب مخلوق سمجھے جاتے تھے، ایک نئی معنویت کے ساتھ اس نسل کی فکر میں شامل ہو گئے۔ دانتے اور ڈان دوبارہ زندہ ہو گئے۔ رومانیت کے پیر ٹوٹ گئے اور کلاسیکیت پر دوبارہ بامعنی بحث ہونے لگی۔ مذہب میں دوبارہ معنی نظر آنے لگے۔ ہر نسل کے اپنے تنقیدی معیار زندگی کے ہر شعبہ میں یہی کام انجام دے کر زندگی میں معنی پیدا کرتے رہتے ہیں اور اس طرح معاشرہ تخلیقی بانجھ پن سے محفوظ رہتا ہے۔

(۴)

ایلیٹ کسی فن پارہ کو کوئی ایسی الہامی چیز تسلیم نہیں کرتا جو شدتِ جذبات کے ساتھ ایک خاص شکل اور ایک خاص لمحہ میں خود بخود وجود میں آ گیا ہو۔ وہ فن پارے کو ایک "شے" کی طرح سمجھتا ہے جسے سوچ سمجھ کر، ناپ تول کر سلیقہ اور محنت سے تعمیر کیا جاتا ہے اور جس کا مقصد ایک مخصوص اثر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ اثر فنکار کے سامنے پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ اس بات کی وضاحت وہ "معروضی تلازمات۔ Objective)

(Correlatives کے نظریہ سے کرتا ہے جسے اس نے ہیملٹ والے مضمون میں پیش کیا ہے۔ فن کی شکل میں جذبات کے اظہار کا واحد طریقہ یہ ہے کہ معروضی تلازمات تلاش کئے جائیں یعنی اشیاء کو اس طرح ترتیب دیا جائے۔ موقع محل اور واقعات کے سلسلوں کو اس طور پر جمایا جائے کہ جب خارجی واقعات حسی تجربوں کے ذریعہ ظاہر ہوں تو وہ مخصوص جذبہ یا جذبات' جو فنکار کے پیش نظر تھا ابھر آئے۔ یہ کام بصری امیجز اور موزوں الفاظ کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ امیجز کے ذریعہ جذبات کا اظہار ہوگا اور زبان کو اس طور پر استعمال کرنے سے سمعی تخیل کا۔ اس عمل کے ذریعہ، ایلیٹ کا خیال ہے، پہلے سے سوچا سمجھا "اثر" پیدا کیا جا سکتا ہے اور فن پہلے سے سوچی سمجھی اثر آفرینی کا نام ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال خود ایلیٹ کے مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" میں ملتی ہے جہاں وہ شخصیت اور جذبات کے مسئلہ کو واضح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پلیٹنیم کے ایک نازک و نفیس ٹکڑے کو ایک ایسی بند جگہ میں داخل کیا جائے جو آکسیجن اور سلفر ڈائی اکسائڈ سے بھری ہو۔ جب ان دو گیسوں کو پلیٹنیم کے تار کے ساتھ ملایا جاتا ہے تو نتیجہ کے طور پر سلفیورس ایسڈ پیدا ہوتی ہے۔ یہ آمیزہ اسی وقت وجود میں آ سکتا ہے جب پلیٹنیم موجود ہو لیکن اس کے باوجود اس نئی گیس میں پلیٹنیم کا کوئی بھی نشان موجود نہیں ہوتا اور پلیٹنیم بھی بظاہر متاثر نہیں ہوتا اور بالکل بے حرکت اور غیر مبدل رہتا ہے۔ شاعر کا دماغ بھی پلیٹنیم کے ٹکڑے کی طرح ہوتا ہے...... سائنسی تجربے کی رو سے یہ مثال بالکل غلط ہے۔ سرے سے ایسا ہوتا ہی نہیں ہے لیکن اس قیاسی تجربے کو اس طور پر بیان کرنے سے ایلیٹ اپنے خیال کی ایک ایسی تصویر بنا دیتا ہے کہ ذہن کی آنکھ اس سائنسی تجربہ کو دیکھ کر اس اثر کو قبول کر لیتی ہے جو فنکار کے پیش نظر ہے۔ یہی معروضی تلازمات کا نظریہ ہے۔

ایلیٹ جمالیاتی اقدار کو سب اقدار سے **الگ قائم کر کے** یہ بتاتا ہے کہ شاعری خالص اور اچھوتی جمالیاتی روح کا نام ہے۔ وہ ماضی کو ادب و تہذیب کے لئے بنیادی اہمیت دیتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ اپنے دور کا شعور بغیر ماضی کے شعور

ادھورا اور ناقص ہے۔ ماضی کا شعور ان لوگوں کے لئے ناگزیر ہے جو پچیس سال کی عمر کے بعد بھی شاعر رہنا چاہتے ہیں لیکن یہاں ماضی کا شعور صرف گزرے ہوئے زمانے اور بیتے دنوں کی یادوں کا رومانوی تصور نہیں ہے جب گاڑیوں میں گھوڑے جتتے تھے اور انکے ٹاپوؤں کی آواز اندھیری سڑکوں پر دور تک سنائی دیتی تھی بلکہ یہ ماضی حال کا حقیقی حصہ ہے۔ یہیں سے ایلیٹ کے ہاں روایت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ روایت تکرار سے بہتر ہے۔ یہ میراث میں نہیں ملتی اور اگر کوئی اسے حاصل بھی کرنا چاہئے تو اس کے لئے بڑے ریاض کی ضرورت پڑتی ہے۔ اول تو اس کے لئے تاریخی شعور کی ضرورت پڑتی ہے۔ تاریخی شعور مجبور کرتا ہے کہ لکھتے وقت جہاں اسے اپنی نسل کا احساس رہے وہاں یہ احساس بھی رہے کہ یورپ کا سارا ادب ہومر سے لیکر اب تک اور اسکے اپنے ملک کا سارا ادب ایک ساتھ زندہ ہے اور ایک ہی نظام میں مربوط ہے۔ یہ تاریخی شعور جس میں لا زماں اور لازماں کا شعور الگ الگ اور ساتھ ساتھ شامل ہے وہ چیز ہے جو ادیب کو روایت کا پابند بناتا ہے اور یہی وہ شعور ہے جو کسی ادیب کو زماں میں اسکے اپنے مقام اور اپنی معاصرت کا شعور عطا کرتا ہے۔ روایت کے اس تصور نے جدید ادب کو ایک نئے معنی دیئے ہیں۔ ماضی کے اسی شعور کے ذریعہ ہم اپنی بنیادی غلطیوں، غیر ضروری ستائش اور تاریخی و ذاتی مغالطوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں جن میں ہماری تنقید پھنسی ہوئی ہے۔

ایلیٹ مذہب پر ہر جگہ زور دیتا ہے " اگر تہذیب کے معنی مادی ترقی اور صفائی وغیرہ کے نہیں ہیں بلکہ اس سے اعلیٰ سطح پر روحانی تنظیم مراد ہے تو یہ بات مشکوک ہے کہ آیا تہذیب بغیر مذہب کے زندہ رہ سکتی ہے اور مذہب بغیر چرچ کے " ایک ڈرامہ میں اس کا ایک کردار یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ " ہمارا ادب مذہب کا بدل ہے اور اسی طرح ہمارا مذہب ادب کا " لیکن اس کے باوجود وہ تخلیقی عمل کو مذہبی عقیدے سے الگ رکھتا ہے۔ دانتے والے مضمون میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ " آپ دانتے کے فلسفیانہ اور دینی عقائد کو نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود ان عقائد کو ماننا آپ کے لئے ضروری نہیں ہے کیونکہ فلسفیانہ عقیدہ اور شاعرانہ قبولیت

میں فرق ہے۔ یہاں آپ اس عقیدے کو ماننے پر مجبور نہیں ہوتے جس پر دانتے ایمان رکھتا تھا بلکہ آپ اسے زیادہ سے زیادہ سمجھنے کی کوشش ضرور کرنے لگتے ہیں۔

ایلیٹ سے میری دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ اسنے تنقید میں فکر کو جذب کر کے اسے ایک نئی قوت دی ہے۔ اس کی تنقید تاثراتی نہیں ہے۔ اس کا طرز فکر، تجزیہ و تحلیل حد درجہ سائنٹفک ہیں۔ وہ اپنے خوبصورت اور جمے ہوئے انداز میں ٹھنڈے ٹھنڈے باوقار طریقہ سے بات کرتا ہے۔ اس کی شخصیت اس کے اسلوب میں شامل بھی رہتی ہے اور علیحدہ بھی۔ اپنے اسلاف شعرا میں ان شعرا سے وہ خاص دلچسپی کا اظہار کرتا ہے جنہوں نے ماضی سے شدت کے ساتھ اپنا رشتہ توڑا ہے جیسے لافورگ، ڈان وغیرہ یا پھر جنہوں نے رشتہ توڑے بغیر بول چال کی زبان سے قریب رہنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے وہ جیکوبین ڈرامہ نگاروں کو محبوب رکھتا ہے۔ ایلیٹ رسمی اظہار کے خلاف ہے اور ڈرامائی اور عام بول چال کی زبان کا مداح ہے۔ اس کی تنقیدی زبان اس کے اپنے تجربے اور شخصیت کا پورا اظہار کرتی ہے۔ طویل جملوں اور جملہ ہائے معترضہ کے باوجود اس کا انداز بیان برجستہ اور دلکش ہے۔ اس کی شاعری کی طرح، اس کی نثر کی خوبی یہ ہے کہ وہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ہم اردو والے ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

نیا دور

ٹی ایس ایلیٹ

پانچ مضامین

تنقید کا منصب

شاعری اور پروپیگنڈا

بودلیئر

ادب اور عصر جدید

ادب اور صحافت

ترجمہ

جمیل جالبی

تنقید کا منصب

(ا)

کئی سال ہوئے فن میں نئے اور پرانے کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے ایک بات کہی تھی جسے میں آج بھی مانتا ہوں۔ وہ جملے میں یہاں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کیونکہ موجودہ مقالے میں اُسی اصول کا، یہ جملے جس کا اظہار کرتے ہیں، اطلاق کیا گیا ہے:

"موجود فن پارے خود ہی ایک مثالی نظام بنا لیتے ہیں جس میں کسی نئے (حقیقتاً نئے) فن پارے کی تخلیق سے خود ہی رد و بدل ہو جاتا ہے۔ موجود نظام نئے فن پارے کے وجود میں آنے سے قبل مکمل ہوتا ہے۔ لیکن نئے فن پارے کے وجود میں آنے کے بعد اس نظام کی زندگی کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ سارے موجود نظام میں تبدیلی پیدا ہو، خواہ یہ تبدیلی کتنی ہی خفیف کیوں نہ ہو۔ اس طرح ہر فن پارے کے رشتے، تناسبات اور اقدار پورے نظام میں نئے سرے سے ترتیب پا لیتے ہیں۔ نئے اور پرانے کے درمیان یہی اصل مطابقت ہے۔ جو بھی نظام کے اس تصور سے اتفاق کرتا ہے اور یورپ اور انگریزی ادب کی اس نوعیت کو سمجھتا ہے اس کیلئے یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ جس طرح ماضی حال کو متعین کرتا ہے اسی طرح حال ماضی کو بدلتا ہے۔"[1]

---

[1] ایلیٹ کے مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" سے۔

اس وقت میں فن کار کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہا تھا اور روایت کے شعور کے بارے میں جو، میں سمجھتا ہوں، فنکار میں ہونا ہی چاہیئے۔ لیکن وہ زیادہ تر نظام کا مسئلہ تھا اور تنقید کا منصب بھی بنیادی طور پر نظام ہی کا ایک مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ میں اس وقت ادب کو، جیسا کہ میں اب بھی سمجھتا ہوں، دنیا کے ادب کو، یورپ کے ادب کو، کسی ایک ملک کے ادب کو، صرف افراد کی تحریروں کا مجموعہ نہیں سمجھ رہا تھا بلکہ زندہ مکمل چیزیں سمجھ رہا تھا یعنی ایسے اصول جن کے تعلق سے اور صرف جن کے تعلق سے، ادبی فن کی انفرادی تخلیقات اور انفرادی فنکاروں کی تخلیقات اپنی قدر و قیمت قائم کرتی ہیں۔ لہٰذا اس بات کے پیش نظر فنکار سے الگ، عالم خارج میں، کوئی چیز ایسی ہے جس کا وہ مطیع ہوتا ہے ــــ ایک ایسی عقیدت جس کے سامنے اپنے اچھوتے مقام کو پاتے اور حاصل کرنے کے لئے اسے جھکنا پڑتا ہے اور اپنی ذات کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ ایک مشترک ورثہ اور ایک مشترک مقصد فن کاروں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر متحد کر دیتے ہیں۔ اس بات کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ یہ اتحاد زیادہ تر غیر شعوری ہوتا ہے۔ ہر زمانے کے سچے فنکاروں کے درمیان، میرا خیال ہے، ایک غیر شعوری شراکت ہوتی ہے اور چونکہ سلیقہ مندی کی ہماری جبلت ہمیں حکماً مجبور کرتی ہے کہ ہم اس جگہ اٹکل پچو لاشعوریت کے رحم و کرم پر نہ رہیں جہاں ہم شعوری طور پر کچھ کر سکتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جو کچھ غیر شعوری طور پر واقع ہوتا ہے اگر اسے شعوری طور پر سمجھنے کی کوشش کریں تو ہم اسے کسی مقصد میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ دوسرے درجے کے فنکار یقیناً اپنی ذات کو کسی مشترک مقصد کے حوالے کر دینے پر قادر نہیں ہیں کیونکہ اس درجہ کے فنکار کا خاص مقصد غیر اہم اختلافات کا ادعا ہے جو اس کا طرۂ امتیاز ہیں۔ صرف ایسا آدمی ہی، جو اپنی ذات کو اس درجہ ترک کر دے کہ وہ اپنی تصنیف میں خود کو بھول جائے، ہم کاری، تبادلۂ خیال اور اضافہ کرنے پر مقدور رکھتا ہے۔

اگر ایسے نظریات فن کے بارے میں تسلیم کر لئے جائیں تو اس سے یہ فطری نتیجہ نکلتا ہے کہ جو کوئی ان نتائج کو تسلیم کرتا ہے وہ تنقید کے بارے میں بھی اسی قسم کے نظریات کو تسلیم کرتا ہے۔ جب میں تنقید کا نام لیتا ہوں تو یقیناً اس سے یہاں میری مراد تحریری لفظوں کے ذریعہ کسی

فن پارے کی تفسیر و تشریح سے ہے۔ لیکن لفظ تنقید کے عام استعمال کے سلسلے میں جس سے ایسی تحریریں مراد لی جائیں جیسا کہ میتھیو آرنلڈ اپنے مضمون میں مراد لیتا ہے، میں چند معروضات پیش کروں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تنقید کے کسی بھی نمائندے نے (ان محدود معنی میں) یہ لچر معروضہ پیش نہیں کیا کہ تنقید خود اپنے اندر ایک مقصد رکھنے والی سرگرمی ہے۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ فن اپنے علاوہ بھی کچھ اور مقاصد کا ادعا کر سکتا ہے لیکن خود فن کے لئے ان مقاصد سے باخبر ہونا ضروری نہیں ہے اور فن درحقیقت اپنا منصب، وہ جو کچھ بھی ہو، اقدار کے مختلف نظریات کے مطابق، زیادہ بہتر طریقہ پر ان سے بے اعتنائی برت کر ہی انجام دے سکتا ہے۔ برخلاف اسکے تنقید کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ کسی مقصد کا اظہار کرے جسے سرسری طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ فن پارے کی توضیح اور اصلاح مذاق کا کام انجام دے۔ اس طرح نقاد کا کام بالکل واضح اور مقرر ہو جاتا ہے اور اس بات کا فیصلہ بھی نسبتاً آسان ہو جاتا ہے کہ آیا وہ اسے تسلی بخش طور پر انجام دے رہا ہے یا نہیں اور یہ کہ عام طور پر کس قسم کی تنقید مفید ہے اور کس قسم کی مبہم اور بے معنی۔ لیکن اس بات کی طرف ذرا سی توجہ دینے سے ہم دیکھتے ہیں کہ تنقید فائدہ بخش سرگرمی کا ایک سیدھا سادا باضابطہ دائرہ عمل ہونے کے علاوہ، کہ جس سے ظاہر داری کو فوراً بے دخل کیا جا سکتا ہے، سنڈے پارک کے بحث و مباحثہ کرنے والے تختی مقرروں سے زیادہ بہتر نہیں ہے جنہیں اپنے اختلافات کا بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں یہاں اس بات کا اقرار کیا جائے گا کہ ایسے موقع پر خاموشی کے ساتھ باہمی سمجھوتہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ نقاد کو اگر اپنے وجود کا جواز پیش کرنا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے ذاتی تعصبات اور جکڑوں سے، جن کا ہم سب شکار ہیں، نکلنے کی کوشش کرے اپنے اختلافات کو، جہاں تک ممکن ہو، صحیح فیصلے کی مشترک تلاش میں زیادہ سے زیادہ اپنے ہم پیشہ لوگوں کے ساتھ مرتب کرے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ معاملہ اسکے برعکس ہے تو ہم اس شبہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ نقاد کی روزی دوسرے نقادوں سے انتہائی مخالفت اور تشدد پر منحصر ہے یا پھر اپنے بے معنی، چھوٹی چھوٹی انوکھی اور عجیب باتوں پر جن پر وہ پہلے سے کاربند ہے اور جن پر وہ صرف خود بینی یا کاہلی کی وجہ سے جما رہنا چاہتا ہے

نقادوں کے اس گروہ کو ہم اپنے دائرۂ فکر سے خارج کر دینا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔
اس اخراج کے فوراً بعد یا جیسے ہی ہمارا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے، ہم اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس کے باوجود کچھ کتابیں، کچھ مضامین، کچھ جملے، کچھ آدمی پھر بھی ایسے رہ جاتے ہیں جو ہمارے لئے بہت مفید رہے ہیں اور ہمارا دوسرا قدم یہ ہے کہ ہم ان کی درجہ بندی کی کوشش کریں اور معلوم کریں کہ آیا ہم کوئی ایسا اصول وضع کر سکتے ہیں جس کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ کس قسم کی کتابوں کو محفوظ رکھنا چاہئے اور تنقید کے کن مقاصد اور ضابطوں کی پیروی کرنی چاہئے۔

(۲)

فن پارے سے فن کے تعلق کا تصور، ادب پارے سے ادب کے تعلق کا تصور، تنقید سے تنقید کے تعلق کا تصور، جس کا خاکہ میں نے اوپر پیش کیا ہے، مجھے نظری اور بدیہی معلوم ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کے اختلافی پہلو کے احساس کے لئے میں مسٹر مڈلٹن مری کا ممنونِ احسان ہوں یا غالباً میں اپنے اس احساس کا کہ اس میں صحیح اور قطعی فیصلے کا مسئلہ بھی شامل ہے مسٹر مری کے احسان کا مجھے اور زیادہ احساس ہے۔ ہمارے بیشتر نقاد بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی محنت میں مصروف ہیں، وہ صلح کرتے ہیں، لیپا پوتی کرتے ہیں، معاملے کو دبانے میں، ٹھپکنے میں، نچوڑنے میں، بات بنانے میں، خوشگوار مسکن تیار کرنے میں، بہانہ سازی میں مصروف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کے اور دوسروں کے درمیان فرق صرف یہ ہے کہ وہ خود تو نفیس آدمی ہیں اور دوسروں کی نیک نامی مشکوک ہے مسٹر مری ان میں سے نہیں ہیں۔ وہ اس بات سے واقف ہیں کہ نقاد کو معین راستے اختیار کرنے چاہئیں اور کبھی کبھار اسے چاہئے کہ وہ کسی چیز کو مسترد کرے اور کسی دوسری چیز کو اختیار کرے۔ وہ کوئی اس گمنام ادیب کی طرح نہیں ہیں جس نے آج سے کئی سال قبل ایک ادبی پرچے میں اس بات پر زور دیا تھا کہ رومانیت اور کلاسیکیت ایک ہی چیز ہے اور فرانس میں حقیقی کلاسیکی دور وہ دور تھا جس نے گوتھک گرجاؤں کو جنم دیا اور ــــ جون آف آرک کو

کلاسیکیت اور رومانیت کے سلسلے میں میں مسٹر مری سے متفق نہیں ہوں۔ مجھے تو یہ فرق مکمل اور ادھوری، بالغ اور غیر پختہ، مرتب اور منتشر چیز کا سا فرق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جو کچھ مسٹر مری کہنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ ادب کے سلسلے میں اور ہر چیز کے سلسلے میں کم از کم دو رویئے ہو سکتے ہیں اور آپ بیک وقت دونوں کی پابندی نہیں کر سکتے۔ اور وہ رویہ جس کی وہ تلقین کرتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں دوسرے رویہ کی سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے ایک قومی اور نسلی مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔

مسٹر مری اپنے مسئلہ کو پورے طور پر واضح کر دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ کیتھولی سزم فرد سے باہر بے چون و چرا ایک روحانی اقتدار کے اصول کو تسلیم کرتا ہے۔ ادب میں یہی اصول کلاسیکیت کا ہے۔ اس دائرے کے اندر جس میں مسٹر مری کی بحث چلتی ہے یہ مجھے ناقابلِ اعتراض تعریف معلوم ہوتی ہے حالانکہ یہ بذاتِ خود مکمل بات نہیں ہے جو کیتھولی سزم اور کلاسیکیت کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ ہم میں سے وہ لوگ جو کلاسیکیت کی تعریف کے سلسلے میں مسٹر مری کی حمایت کرتے ہیں اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان اپنے سے باہر کسی چیز کی اطاعت کئے بغیر عمل ہی نہیں سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ "بیرونی" اور "اندرونی" ایسی اصطلاحیں ہیں جو کج بحثی کے لئے بے حساب مواقع فراہم کرتی ہیں اور کوئی بھی ماہر نفسیات ایسی بحث کو جو اتنی گھٹیا اصطلاحوں کو زیر بحث لاتی ہے برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن میں یہ فرض کرتے ہوئے کہ مسٹر مری اور میں اس بات پر متفق ہو سکتے ہیں کہ ہمارے مقصد کے لئے یہ کھوٹے سکے ہی کافی ہیں اپنے ماہر نفسیات دوست کی ملامت کو نظر انداز کر دیتا ہوں۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کسی چیز کو "بیرونی" سمجھیں تو پھر یہ "بیرونی" ہے۔ اگر کسی آدمی کی دلچسپی سیاسی ہے تو میں سمجھتا ہوں اسے چاہئے کہ وہ چند اصولوں سے، ایک طرز حکومت سے، کسی بادشاہ سے اطاعت کا اظہار کرے۔ اگر وہ مذہب سے دلچسپی رکھتا ہے تو میرا خیال ہے اسے اسی قسم کی اطاعت کرنی چاہئے جس کا اظہار میں نے اس مضمون کے پچھلے حصہ میں کیا ہے۔ لیکن اسکے باوجود ایک اور چارۂ کار بھی ہے جس کا اظہار مسٹر مری نے کیا ہے "ایک انگریز ادیب، ایک انگریز عالم دین، اور ایک انگریز مدبر کو اپنے پیش روؤں سے ورثہ میں قاعدے ضابطے نہیں ملتے، انہیں لطور

ورثہ جو کچھ ملتا ہے یہ ہے ـــــ: ایک شعور، کہ آخری تدبیر کے طور پر انہیں اپنی اندرونی آواز پر تکیہ کرنا چاہئے"۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بات چند صورتوں میں درست ہے۔ یہ مسٹر لائڈ جارج کے بارے میں بہت کچھ روشنی ڈالتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخری تدبیر کے طور پر ہی کیوں؟ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اندرونی آواز کے حکم کو آخر وقت تک نظر انداز کرتے رہتے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ جن میں یہ اندرونی آواز موجود ہے اسے توجہ سے سننے کی طرف مائل رہتے ہیں اور وہ کوئی اور آواز نہیں سنتے۔ درحقیقت اندرونی آواز، واضح طور پر، پرانے اصولوں کی طرح معلوم ہوتی ہے جیسے ایک بزرگ نقاد نے "جو جی میں آئے کرنا"[۱] کی اب مروجہ ترکیب میں وضع کیا تھا۔ اندرونی آواز کے مالکان ایک ایک ڈبے میں دس دس بیٹھ کر اپنی اندرونی آواز سنتے ہوئے، فٹ بال میچ دیکھنے سُوئین سی جاتے ہیں جس سے نخوت، خوف اور طمع کا دائمی پیغام سُنائی دیتا ہے۔

مسٹر مری کہیں گے کہ یہ بالا رادہ غلط بیانی ہے۔ وہ فرماتے ہیں" اگر وہ (انگریز ادیب، عالم دین، مدبر) خود دانی کی کوشش میں گہری کھدائی کریں ـــــ وہ کان کنی جو صرف ذہن سے نہ کی جائے، بلکہ پورا آدمی اسے انجام دے ـــــ تو وہ اس خودی کو پالیں گے جو آفاقی ہوگی"ـــــ یہ ایک ایسی ورزش ہے جس سے کیتھولی سزم کے پیروکار کو اتنی دلچسپی ضرور ہے کہ وہ کئی رسالے اس کی مشق کے طریقوں پر قلمبند کردے۔ لیکن کیتھولک، چند رافضیوں کو چھوڑ کر، ترگیبت میں مبتلا نہیں ہیں۔ کیتھولک کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ خدا اور بندہ بالکل ایک ہیں۔ مسٹر مری کہتے ہیں" وہ انسان جو صحیح معنی میں خود سے سوال کرتا ہے آخر کار خدا کی آواز سن سکے گا"۔ نظریاتی اعتبار سے یہ وحدت پرستی کی ایک ایسی شکل ہے جو، میرا خیال ہے، اصلاً یورپین نہیں ہے ـــــ جیسے مسٹر مری فرماتے ہیں کہ کلاسیکیت انگریزی چیز نہیں ہے۔ اس کے عملی نتائج کی مثال میں ہوڈی برس[۲] (Hudibras) کی نظم کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

---

[۱] میتھو آرنلڈ "کلچر اور انارکی" میں [۲] سترھویں صدی کے سیمول بٹلر کی ایک طنزیاتی نظم جو پیوریٹن کے خلاف ہے۔

میں اس وقت تک یہ نہیں سمجھتا تھا کہ مسٹر مری ایک قابلِ قدر فرقے کے ترجمان ہیں جب تک میں نے ایک موقر روزنامہ کے ادارتی کالم میں یہ نہیں پڑھ لیا کہ "انگلستان میں کلاسیکی رجحان کے نمائندے عظیم الشان ہیں لیکن انگریزی کردار کے وہی نمائندے نہیں ہیں۔ انگریزی کردار بنیادی طور پر شدت کے ساتھ "پُرمزاح" اور غیر مقلد ہے" یہ لکھنے والا لفظ 'واحد' کے استعمال میں اعتدال پسند ہے اور ناقابلِ اصلاح ٹیوٹن قوم کے مزاج میں "مزاحیہ رجحان" کو شامل کرنے میں سفاکی کی حد تک بے باک ہے۔ مگر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مسٹر مری اور یہ دوسری آواز یا تو حد درجہ خودرائے ہے یا حد درجہ رواداری سوال یہ نہیں ہے اور یہ بنیادی سوال ہے کہ کون سی چیز ہمارے لئے فطری ہے یا کون سی چیز آسان ہے بلکہ کون سی چیز صحیح ہے۔ یا تو ایک رویہ بمقابلہ دوسرے کے بہتر ہے یا وہ ایک دوسرے سے بے تعلق ہے۔ مگر انتخاب کا مسئلہ بے تعلقی پر کیسے مبنی ہو سکتا ہے؟ یقیناً قومی اصل کی طرف اشارہ یا یہ بات کہ فرانسیسی ایسے ہیں اور انگریز ان سے مختلف ہیں اس مسئلہ کو حل نہیں کرتی بلکہ یہ سوال اٹھاتی ہے کہ دونوں متضاد باتوں میں سے کون سی صحیح ہے! میں نہیں سمجھ سکتا کہ آخر لاطینی ممالک میں کلاسیکیت اور رومانیت کے درمیان مخالفت: (جیسا کہ مسٹر مری کہتے ہیں) اتنی گہری ہونے کے باوجود ہمارے لئے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ کیونکہ اگر فرانسیسی 'فطرتاً' کلاسیکی ہیں تو فرانس میں پھر اس کی مخالفت کیوں ہو جیسی کہ ہمارے ہاں ہے؟ اگر کلاسیکیت ان کے لئے فطری نہیں ہے بلکہ انہوں نے اسے حاصل کیا ہے تو ہم بھی اسے کیوں نہ حاصل کر لیں؟ کیا ۱۶۶۰ء میں فرانسیسی کلاسیکی تھے اور انگریز اسی سال رومانوی تھے؛ میرے لئے ایک زیادہ اہم فرق یہ ہے کہ ۱۶۶۰ء میں فرانسیسی زیادہ پختہ نثر پیدا کر چکے تھے۔

(۳)

یہ بحث ہمیں اس مضمون کے موضوع سے بہت دور لے آئی ہے لیکن یہ ضروری تھا کہ میں مسٹر مری کے 'بیرونی اقتدار' اور 'اندرونی آواز' کے تقابل کا جائزہ لوں۔ کیونکہ ان لوگوں کے لئے جو اندرونی آواز کے تابع ہیں (شاید 'تابع' موزوں لفظ نہیں ہے) تنقید

کے سلسلے میں میں جو کچھ بھی کہوں گا وہ ان کے لئے حد درجہ بے وقعت ہو گا۔ کیونکہ انہیں تنقید کے مشترک اصول تلاش کرنے کے سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں ہو گی۔ وہ کہیں گے کہ اصول کیوں تلاش کئے جائیں جب اندرونی آواز موجود ہے؟ اگر مجھے کوئی چیز پسند ہے تو بس یہی وہ چیز ہے جو میں پسند کرتا ہوں اور اگر ہم میں سے کافی لوگ مل کر یہی شور مچائیں اور اسی چیز کو پسند کریں تو بس یہی وہ چیز ہے جو آپ کو (آپ سے مراد وہ لوگ جو اسے پسند نہیں کرتے) بھی پسند کرنی پڑے گی۔ مسٹر کلٹن بروک کا قول ہے کہ فن کا قانون بھی قانونی فیصلے کا قانون ہے۔ اور ہم جس چیز کو پسند کرتے ہیں بلکہ اپنی پسند کے اسباب کی بنا پر اسے پسند کرنے کا اظہار بھی کرتے ہیں اصل میں ہم ادبی کمال سے کوئی سروکار نہیں رکھتے ـــــ کمال کی تلاش کم مائگی کی نشانی ہے کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے بے چوں وچرا اپنی ذات سے باہر ایک روحانی اقتدار کے وجود کو تسلیم کر لیا ہے اور جس کی تقلید میں وہ مصروف ہے۔ ہم دراصل فن میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ ہم کمال کی پرستش نہیں چاہتے۔" کلاسیکی راہبری کا اصول یہ ہے کہ کسی عہدہ یا کسی روایت کی اطاعت کی جائے اور انسان کی نہیں۔" اور ہمیں اصول کی نہیں بلکہ انسان کی ضرورت ہے۔

اندرونی آواز یہ بتاتی ہے۔ یہ ایک آواز ہے جسے ہم سہولت کی خاطر ایک نام دے سکتے ہیں اور وہ نام جو میں تجویز کرتا ہوں "وھگری" (**Whiggery**) ہے۔

(۴)

غرض ان لوگوں کو چھوڑ کر جنہیں اپنے پیشے اور انتخاب پر یقین ہے اور ان کی طرف آتے ہوئے جو بے حیائی کے ساتھ روایت اور صدیوں کی جمع شدہ دانش پر بھروسہ کرتے ہیں اور موضوع بحث کو انہی لوگوں تک محدود کرتے ہوئے جو اس کمزوری میں ایک دوسرے سے ہمدردی رکھتے ہیں ہم ذرا دیر کے لئے 'تنقیدی' اور 'تخلیقی' اصطلاحوں کے استعمال پر اظہارِ خیال کرتے ہیں جنہیں ایک ایسے شخص نے استعمال کیا ہے جس کی ہمدردیاں بحیثیت مجموعی کمزور بھائیوں کے ساتھ ہیں۔ میتھیو آرنلڈ حد درجہ صاف گوئی کے ساتھ ان دونوں سرگرمیوں میں فرق کرتا ہے۔ وہ تخلیقی

کاموں میں تنقید کی زبردست اہمیت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ شاید درحقیقت ایک مصنف کی اپنی تصنیف کے سلسلے میں محنت شاقہ کا بڑا حصہ تنقیدی محنت کا ہوتا ہے یعنی چھانٹنے، جوڑنے، تعمیر کرنے، خارج کرنے، صحیح کرنے، جانچنے کی محنت۔ یہ اذیت ناک محنت جتنی تنقیدی ہوتی ہے اتنی ہی تخلیقی ہوتی ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ایک تربیت یافتہ اور ہنرمند مصنف جو تنقید اپنی تصنیف پر کرتا ہے وہ بے حد اہم اور اعلیٰ درجہ کی تنقید ہے اور (جیسا کہ میرا خیال ہے میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں) کچھ تخلیقی مصنف دوسروں سے محض اس بنا پر بہتر ہیں کہ ان کا تنقیدی شعور اعلیٰ درجہ کا ہے۔ ایک رجحان یہ بھی ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ دھگری قسم کا رجحان ہے، کہ فنکار کی تنقیدی محنتِ شاقہ کی مذمت کی جائے اور یہ نظریہ پیش کیا جائے کہ عظیم فنکار لاشعوری فنکار ہوتا ہے جو لاشعوری طور پر اپنے جھنڈے پر "بالکل کچھ گزرنے" کے الفاظ تحریر کئے ہوتا ہے۔ بہرحال ہم میں سے وہ لوگ جو اندرونی گونگے بہرے ہیں بعض اوقات انکسار پسند ضمیر سے اس کی تلافی کر لیتے ہیں جو، حالانکہ بغیر الہامی مہارت کے ہمیں بہتر سے بہتر کرنے کا مشورہ دیتا ہے، ہمیں اس امر کی یاد دہانی کراتا ہے کہ ہماری تصانیف جہاں تک ممکن ہو، نقائص سے پاک ہوں (ان کی الہامی قوت کی کمی کا ازالہ کرنے کے لئے) اور مختصر یہ ہے کہ ہمارا کافی وقت ضائع کراتا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تنقیدی شعور، جو ہمیں مشکل سے حاصل ہوتا ہے، زیادہ خوش قسمت لوگوں میں تخلیق کی گرمی کے دوران ہی پیدا ہوتا ہے اور ہم یہ تسلیم نہیں کرتے چونکہ تصانیف بغیر ظاہرہ تنقیدی محنت کے وجود میں آگئی ہیں اس لئے ان میں سرے سے کوئی تنقیدی محنت ہی نہیں ہوئی۔ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ وہ کون سی محنتیں اور کون سے تنقیدی عوامل ہیں جو تخلیقی فنکار کے ذہن میں سارے وقت موجود رہتے ہیں۔

لیکن یہ اقرار الٹا ہمارے سر آ پڑتا ہے۔ اگر تخلیق کا اتنا حصہ واقعی تنقید ہے تو کیا جس چیز کو "تنقیدی تصنیف" کہا جاتا ہے اس کا زیادہ حصہ تخلیقی نہیں ہوگا؟ اگر ایسا ہے تو کیا تخلیقی تنقید عام معنی میں وجود نہیں رکھتی؟ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں کوئی مساوات نہیں ہے۔ میں نے کلیہ کے طور پر یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ایک تخلیق، ایک فن پارہ اپنا مقصد خود اپنے اندر رکھتا ہے اور تنقید اپنی تعریف کے مطابق، اپنے علاوہ کسی اور چیز کی بابت ہوتی

ہے۔ لہٰذا آپ تخلیق کو تنقید کے ساتھ ملا کر اس طرح ایک نہیں کر سکتے جس طرح آپ تنقید کو تخلیق کے ساتھ ملا کر ایک کر سکتے ہیں۔ تنقیدی سرگرمی کی ارفع ترین اور حقیقی تکمیل تخلیق کے ساتھ فنکار کی محنت اور دونوں کے ایک قسم کے اتحاد میں ہوتی ہے۔

لیکن کوئی مصنف پورے طور پر صرف اپنی قوتِ بازو سے کام نہیں کر سکتا اور بہت سے تخلیقی مصنف تنقیدی شعور تو رکھتے ہیں لیکن وہ پوری طرح ان کی تصنیف میں شریک نہیں ہوتا۔ کچھ تو اپنی تنقیدی قوتوں کو متفرق کاموں میں لگا کر حقیقی کام کے لئے تیار رکھتے ہیں۔ کچھ ایک تصنیف مکمل کرنے کے بعد اس پر تبادلۂ خیال کر کے تنقیدی عمل کو جاری رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں کوئی عام اصول نہیں ہے اور جیسے ایک انسان دوسرے انسان سے سیکھ سکتا ہے اسی طرح کچھ تنقیدی تصانیف دوسرے مصنفین کے لئے مفید ثابت ہوتی ہیں۔ اور ان میں سے کچھ ان لوگوں کے لئے بھی مفید ثابت ہوتی ہیں جو خود مصنف نہیں ہیں۔

ایک زمانہ میں میں اس انتہا پسندانہ رجحان کا قائل تھا کہ صرف وہی نقاد پڑھنے کے لائق ہیں جنہوں نے اس فن کی، جس کے بارے میں وہ تنقید کر رہے ہیں، مشق بہم پہنچائی ہے اور خوب مشق بہم پہنچائی ہے[1]۔ لیکن مجھے اس خیال کو چند اہم چیزیں شامل کرنے کے لئے پھیلانا پڑا اور اس وقت سے میں ایک ایسے فارمولے کی تلاش میں ہوں جو ہر اس چیز کا، جسے میں شامل کرنا چاہتا ہوں، احاطہ کر سکے خواہ اس میں ان کے علاوہ جن کو میں شامل کرنا چاہتا ہوں کچھ اور بھی کیوں نہ شامل ہو جائے۔ اور سب سے اہم خصوصیت جو مجھے ملی اور جو تنقید کے عالموں کی مخصوص اہمیت کو اجاگر کرتی ہے یہ ہے کہ ایک نقاد میں بہت اعلیٰ درجہ کا ترقی یافتہ حقائق کا شعور ہونا چاہئے۔ یہ شعور کسی طرح بھی کوئی معمولی بات یا عام ساتحفہ نہیں ہے اور نہ یہ ایسی چیز ہے جو آسانی سے عام مقبولیت حاصل کر لیتی ہے۔ حقائق کا شعور

---

[1] اس سلسلے میں BEN JOHNSON کی رائے یہ ہے:

"To Judge of the poets is the virtue of poets and of none but the highest."

ایک ایسی چیز ہے جو بہت آہستہ پیدا ہوتی ہے اور اس کی کامل ترقی کے معنی شاید خود تہذیب کے منتہائے کمال کے ہیں۔ کیونکہ حقائق کے بہت سے پہلو ہیں جن پر پورا عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔ "براؤننگ اسٹڈی سرکل" کے اراکین کے لئے شاعری کے بارے میں شاعروں کی بحث خشک، ٹیکنیکل اور محدود معلوم ہوتی ہے۔ یہ محض اس لئے ہے کہ عاملین شعر نے تمام احساسات کو صاف اور واضح کر کے حقائق کے درجہ پر اس طور سے پہنچا دیا ہے کہ اس سرکل کے اراکین صرف اسے ایک دھوئیں کی شکل میں محسوس کر کے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، خشک تکنیک میں، ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اس پر عبور حاصل کر لیا ہے، وہ سب کچھ پوشیدہ ہے جس پر اسکارکن پھڑک اٹھتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسے ایسی چیز بنا دیا گیا ہے جو زیادہ واضح، زیادہ متعین اور اسکے قبضے میں ہے۔ عامل کی تنقید کی قدر و قیمت کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ حقائق کو واضح کرتا ہے اور ایسا ہی کرنے میں وہ ہماری مدد بھی کر سکتا ہے۔

تنقید کی ہر سطح پر مجھے یہی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ تنقیدی تصنیف کا بڑا حصہ وہ ہے جو کسی مصنف یا تصنیف کی توضیح کرتا ہے۔ یہ توضیح اسٹڈی سرکل والی سطح پر بھی نہیں ہے۔ ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص یا تخلیقی مصنف کے خیالات کی تہہ تک جا پہنچتا ہے اور ایک حد تک وہ دوسروں تک بھی پہنچا دیتا ہے اور جسے ہم صحیح اور بصیرت افروز سمجھتے ہیں۔ خارجی شواہد سے توضیح کا ثبوت بہم پہنچانا مشکل ہے لیکن ایسے شخص کے لئے جو حقائق کے استعمال میں، اس سطح پر، پوری مشق رکھتا ہے اس کے لئے کافی شواہد موجود ہوتے ہیں۔ لیکن اپنی ہی ہنرمندی کا ثبوت خود کون بہم پہنچا سکتا ہے؟ اس قسم کی ایک کامیاب تصنیف کے مقابلہ میں ہزاروں مکر و فریب موجود ہیں۔ بصیرت کے بجائے آپ کو بناوٹی باتیں ملتی ہیں۔ ہمارا معیار یہ ہونا چاہئے کہ اس رائے کا ہم بار بار اصل تصنیف پر اطلاق کر کے اور خود اصل تصنیف کے بارے میں اپنی رائے کے ساتھ ملا کر دیکھیں۔ لیکن اس سلسلے میں چونکہ ہماری اہلیت کی ضمانت دینے والا کوئی نہیں ہے اس لئے ہم ایک بار خود کو دہری مشکل میں پاتے ہیں۔

ہمیں خود ہی طے کرنا چاہئے کہ ہمارے لئے کیا چیز مفید ہے اور کیا مفید نہیں ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ ہم اس بات کا فیصلہ کرنے کے اہل نہ ہوں لیکن یہ بات خاصی یقینی ہے کہ تشریح

توضیح (میں ادب میں جیستانی عناصر کی بات نہیں کر رہا ہوں) اسی وقت صحیح اور معقول ہو سکتی ہے جب وہ بالکل ہی تشریح د توضیح نہ ہو بلکہ قاری کے سامنے حقائق کو پیش کر دے جنکو دیسے وہ چھوڑ جاتا۔ مجھے توسیعی لیکچروں کا کچھ تجربہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ طالب علموں میں کسی چیز کی صحیح پسند پیدا کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے سامنے کسی تصنیف کے بارے میں سیدھے سادے حقائق کا ایک انتخاب پیش کر دیا جائے ــــ یعنی اس تصنیف کے عوامل، اسکا تناظر اور اسکی تخلیقی اصل پر روشنی ڈالی جائے ــــ یا پھر ان کے سامنے تصنیف کو ایک دم سے اس طرح پیش کیا جائے کہ ان میں اس تصنیف کے خلاف تعصب ہی پیدا نہ ہو۔ ایلزبتھن ڈرامے کے سلسلے میں بہت سے حقائق تھے جنہوں نے ان کو سہارا دیا۔ ٹی۔ ای ہیوم کی نظموں کا فوری اثر قائم کرنے کے لئے ان کو باآواز بلند پڑھنے کی ضرورت تھی۔

تقابل اور تجزیہ، میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور ریمی۔ دی گورماں (کہ جو حقائق پر واقعتاً قادر تھا ــــ بعض اوقات، میرا خیال ہے، جب وہ ادب کے دائرے سے باہر چلا جاتا ہے تو حقائق کا منکر ہو جاتا ہے) مجھ سے پہلے کہہ چکا ہے نقاد کے بنیادی اوزار ہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ ان کی حیثیت اوزار کی ہے جنہیں احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے اور اس قسم کی تخلیق پر استعمال نہیں کرنا چاہئے کہ انگریزی ناول میں 'زرافہ' کا لفظ کتنی بار استعمال ہوا ہے۔ بہت سے معاصر مصنف یہ اوزار نمایاں کامیابی کے ساتھ استعمال نہیں کر سکے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ کس چیز کا تقابل کیا جائے اور کس چیز کا تجزیہ۔ پروفیسر کر مرحوم کو ان اوزاروں کے استعمال پر بڑی قدرت تھی۔ تقابل اور تجزیہ کیلئے میز پر لاشوں (Cadavers) کی ضرورت ہوتی ہے لیکن توضیح و تشریح ہمیشہ جسم کے اعضا چھپی ہوئی جگہوں سے نکالتی ہے اور ان کو ان کی جگہ جوڑتی جاتی ہے۔ اور کوئی کتاب، کوئی مضمون، "نوٹس اور سوال" کا کوئی حصہ جو کسی فن پارے کے بارے میں ادنےٰ درجہ کی حقیقت بھی سامنے لائے وہ اس نمائشی صحافی تنقید کے ۹/۱۰ حصہ سے بہتر ہے جو ہمارے رسالوں اور کتابوں میں ملتی ہے۔ یقیناً ہم یہ مانتے ہیں کہ ہم حقائق کے مالک ہیں۔ حقائق کے غلام نہیں اور ہم یہ جانتے ہیں کہ شیکسپیر کے دھوبی کے بلوں کی تلاش ہمارے لئے کچھ زیادہ سود مند نہیں ہوگی لیکن ہمیں اس بے کار تحقیق

کے سلسلے میں اپنی قطعی رائے کا صرف اس امکان کے پیشِ نظر اظہار نہیں کرنا چاہیے کہ کوئی جنیئس ایسا پیدا ہو جو اس تحقیق کے استعمال سے فائدہ اٹھانا جانتا ہو۔ عالمیت (اسکالرشپ) اپنی ادنیٰ ترین شکل میں بھی، اپنے حقوق رکھتی ہے۔ ہم یہ مانے لیتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ اسے کیسے استعمال کیا جائے اور کیسے ترک کیا جائے۔ یقیناً تنقیدی کتابوں اور مضامین کی بہتات، اصل فن پاروں کو پڑھنے کے بجائے فن پاروں کے بارے میں دوسروں کی رائے پڑھنے سے، بے ہودہ مذاق پیدا کر سکتی ہے اور جیسا کہ میں نے دیکھا ہے کہ اس نے پیدا کیا ہے۔ اس طرح وہ آرار تو بہم پہنچاتے ہیں لیکن ذوق کی تربیت نہیں کرتے۔ لیکن حقیقت ذوق کو نہیں لگاڑ سکتی۔ اپنی بدترین شکل میں وہ زیادہ سے زیادہ ذوق کے کسی ایک شعبہ کی طرف لگا سکتی ہے۔ مثلاً تاریخ کا ذوق یا آثار قدیمہ یا سوانح کا ذوق۔ اس فریب کے ساتھ کہ یہ سب علوم ایک دوسرے کے ذوق کو آگے بڑھاتے ہیں، اصل تباہی مچانے والے وہ ہیں جو رائے اور قیاس مہیا کرتے ہیں اور اس سلسلے میں گوئٹے اور کالرج بھی بے قصور نہیں ہیں۔ کیونکہ ہملیٹ کے بارے میں کالرج کا مضمون خود کیا ہے: جہاں تک حقائق اجازت دیتے ہیں کیا یہ ایک ایماندارانہ مطالعہ ہے؟ یا یہ خود کالرج کو دلکش لباس میں پیش کرنے کی ایک کوشش ہے؟

ہم وہ معیار حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے جس سے ہر شخص کام لے سکے۔ ہم متعدد فضول اور تکلیف دہ کتابوں کو داخلے کا حق دینے پر مجبور ہو گئے ہیں لیکن، میرا خیال ہے، کہ ہمیں ایک ایسا معیار، ان لوگوں کے لئے جو اس سے صحیح کام لے سکتے ہیں، ضرور مل گیا ہے جس سے ہم حقیقتاً بے ہودہ کتابوں کو رد کر سکتے ہیں۔ اس معیار کے ساتھ ہم ادب اور تنقید کے نظام کے بنیادی نظریہ کی طرف واپس ہوتے ہیں۔ ان تنقیدی تصانیف کے سلسلے میں، جنہیں ہم نے تسلیم کر لیا ہے، ایک متحد سرگرمی کا امکان موجود ہے۔ اس مزید امکان کے ساتھ کہ ایسے میں ہم اپنی ذات سے "باہر" کسی ایسی چیز تک پہنچ جائیں جسے ہم عارضی طور پر "صداقت" کہہ سکیں۔ لیکن اگر کوئی یہ شکایت کرتا ہے کہ میں نے "صداقت" کی تعریف نہیں کی تو میں معذرت کے ساتھ صرف

یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسا کرنا میرے مقصد میں شامل نہیں تھا بلکہ میرا مقصد تو صرف' ایک ایسی اسکیم تلاش کرنا تھا جس میں، وہ جو کچھ بھی ہوں' یہ سب تصانیف، اگر وہ واقعی موجود ہیں، ٹھیک بیٹھ جائیں۔

(۱۹۲۳ء)

شاعری اور پروپیگنڈا

.... سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی فن، خصوصیت کے ساتھ اور خاص طور پر کوئی ادبی فن، خلا میں پروان نہیں چڑھ سکتا۔ عمل میں ہم سب لوگ مختلف دلچسپیاں رکھنے والی مخلوق ہیں اور ہماری عام دلچسپیوں میں سے بہت سی دلچسپیوں میں بظاہر کوئی ربط نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اس مواد کو پڑھئے جو 'ہُو از ہُو' میں ان حضرات نے بہم پہنچایا ہے جنہوں نے فارم کے اس خانے کو جس پر لفظ 'تفریحات' لکھا ہے اختصار کے ساتھ پُر کیا ہے۔ ایک مثال یوں کہا جاسکتا ہے کہ انعامی مقابلہ کے لئے ایرانی بلیاں پالنے اور دوڑ میں شریک ہونے والی 'کھلونا کشتیوں' میں کوئی ظاہری رشتہ نہیں ہے۔ یہ دلچسپیوں کی بے ربطی کی ایک انتہا ہے۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ ہم اپنی دلچسپیوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کسی شخص کے بارے میں یہ فرض کر لینا کہ وہ صرف 'بہترین' شاعری ہی کو پسند کرتا ہے اور وہ یہ کہ وہ دنیا کی ساری بہترین شاعری کو بھی اسی طرح پسند کرتا ہے اور یہ کہ وہ ساری دوسرے درجہ کی شاعری کو دوسرے درجے کی شاعری ہی سمجھ کر پسند کرتا ہے اور یہاں تک کہ وہ ساری بدترین شاعری سے یکساں طور پر نفرت کرتا ہے، ایک ایسی بات ہے جسے عجوبہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی فن کا کوئی نقاد ایسا ہے یا ہو سکتا ہے جس میں توصیف کا خانہ ہی الگ ہو —— نہایت منصفانہ اور قطعی طور پر اس کی دوسری دلچسپیوں اور ذاتی جذبات سے علیحدہ۔ اگر ایسا کوئی نقاد تھا یا ہے یا ہو سکتا ہے تو وہ نہایت لیچڑ نقاد ہوگا جس کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اور دوسری طرف اس نقاد سے زیادہ کسی لیچڑ اور لغو نقاد کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا جو تمام خارجی معیاروں کو ترک کر دے اور صرف اپنے تاثرات

اور ردِعمل کی رام کہانی سنائیے" "شاہکاروں کے درمیان ایک سفر" میرا خیال ہے، وہ فقرہ ہے جسے اناطول فرانس نے اپنی تنقید کو بیان کرنے کے لئے استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ محض اس کے اپنے احساسات کا بیان ہے ـــــ تاہم یہ فقرہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ سفر شروع ہونے سے قبل شاہکار بحیثیت شاہکار پہلے سے موجود تھے۔

لیکن یہ ظاہرہ قولِ محال' ـــــ ایک چیز کو مقصد بنانا تاکہ دوسری چیز حاصل ہو سکے ـــــ ریاکاری اور خود فریبی کا یہ ظاہرہ مسلک، اس لئے صحیح ہے کہ خود انسانی روح کی فطرت میں یہ بات موجود ہے اور اتحاد و کمال حاصل کرنے کی ضرورت و خواہش میں یہ بات مضمر ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم مختلف فنون میں اپنے مذاق کو ایک اکائی کی شکل میں مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور بالآخر ایک نظریۂ حیات تک پہنچنا چاہتے ہیں اور جہاں تک ہمارا شعور ساتھ دیتا ہے ہم (فنون کے ساتھ) اپنی اس لطف اندوزی اور مذاق کو فلسفہ میں تبدیل کر لیتے ہیں اور اپنے فلسفہ کو اس طور پر مذہب سے ملا دیتے ہیں کہ ذاتی امور غیر ذاتی امور میں مل کر مکمل ہو جاتے ہیں۔ اس عمل سے ذاتی امور ختم نہیں ہو جاتے بلکہ زیادہ گہرے زیادہ وسیع، زیادہ ترقی یافتہ، اپنے آپ سے زیادہ، کچھ اور بن کر وہ اور زیادہ ذاتی ہو جاتے ہیں۔

میرے اندازے کے مطابق شاعری میں دلچسپی رکھنے والے ایک آدھ نہیں بلکہ لاتعداد افراد ہیں۔ میرے خیال میں تنقیدی نظریہ کی غلطیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ ایک طرف ایک فرضی شاعر کا تصور کر لیتی ہے اور دوسری طرف ایک فرضی قاری کا۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ شاعر کے صحیح محرکات اور ساتھ ساتھ قاری کے صحیح ردِعمل میں بہت زیادہ فرق ہے لیکن ان کے اس فرق میں ایک ممکن ترتیب، ایک ممکن ربط بھی موجود ہے۔ اس سلسلے میں ایک طرف مسٹر بلجبون کو اور دوسری طرف مسٹر رچرڈس کو رکھ کر دیکھئے۔ ایک انتہا یہ ہے کہ شاعری کو محض معنی کے اعتبار سے پسند کیا جا رہا ہے یعنی محض اس لئے پسند کیا جا رہا ہے کہ یہ ہمارے اپنے عقائد و تعصبات کا اظہار کر رہی ہے ـــــ جس کے معنی یہ ہوئے کہ شاعری کی 'شاعری' پر توجہ نہ دی جائے۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ شاعری کو محض اس لئے پسند

کیا جارہا ہے کہ شاعر نے اپنے مواد کو مکمل فن کی شکل دے دی ہے ـــــ جس کے معنی یہ ہوئے کہ مواد سے عدم توجہی برتی جائے اور شاعری سے ہماری لطف اندوزی کو زندگی سے الگ کردیا جائے۔ جہاں تک پہلی انتہا کا تعلق ہے وہ سرے سے (شاعری سے) لطف اندوزی ہی نہیں ہے اور دوسری انتہا ایک مجرد تصور سے لطف اندوزی ہے جسے محض شاعری کا نام دے دیا گیا ہے لیکن ان دو انتہاؤں کے درمیان توصیف کا ایک مربوط سلسلہ واقع ہے جن میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی محدود اہمیت ہے۔

توصیف کے اس سلسلے کی اہمیت کا اندازہ مختلف شعراء کے بنیادی عوامل کا جائزہ لینے سے ہوجاتا ہے۔ ہم سہولت کے لئے تین مختلف قسم کے شاعروں کا تقابل کرتے ہیں۔ ایک طرف فلسفیانہ شاعر ہیں جیسے لُکریشس اور دانتے جو ایک فلسفۂ حیات کو پہلے سے مانتے ہیں اور جو اپنی نظموں کی تعمیر ایک خیال کے مطابق کرتے ہیں۔ دوسری طرف شیکسپیر یا سوفوکلس جیسے شاعر ہیں جو رائج الوقت خیالات کو قبول کر لیتے ہیں اور انہیں اپنے تصرف میں لے آتے ہیں لیکن جن کے کلام میں عقیدہ کا مسئلہ بہت حیلہ باز اور بہت چکرانے والا ہے۔ آخر میں ایک اور قسم بھی ہے، جس کی مثال میں گوئٹے کو پیش کیا جاسکتا ہے، ـــــ جو کسی مخصوص نظریہ کو پورے طور پر نہیں مانتے اور زندگی کے مختلف نظریوں کو اس لئے دیکھتے ہیں کہ انہیں شاعری میں استعمال کیا جائے بلکہ جو اپنی ذات میں کم و بیش فلسفی اور شاعر کا منصب ملا کر ایک کر لیتے ہیں ـــــ یا شاید ولیم بلیک یعنی وہ شعراء جن کے اپنے خیالات اور اپنے عقیدے ہیں اور جن پر وہ پورا ایمان رکھتے ہیں۔

کچھ شاعروں کی ایسی ملی جلی قسم بھی ہے کہ یہ کہنا ناممکن ہوجاتا ہے کہ وہ کہاں تک اپنی شاعری کی بنیاد اپنے خیالات و عقائد پر رکھتے ہیں اور محض اپنی شاعری میں استعمال کرنے کی وجہ سے کسی چیز پر وہ کس حد تک ایمان رکھتے ہیں۔ اگر میں سچے شاعر کے یہ امکانی محرکات پیش کرنے میں حق بجانب ہوں (اور بالکل اسی طرح شاعری کے قاری کے بھی)، تو مسٹر بلجیون اور مسٹر رچرڈس کے نظریات میں قابلِ قدر تبدیلی کرنی پڑے گی۔ کیونکہ "غیر ذمہ دار پروپگنڈا" بہ اوقات کم غیر ذمہ دار ہوتا ہے اور بعض اوقات کم پروپگنڈا بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر

لکریشس اور دانتے ایسے شاعر ہیں جنہیں یقیناً مسٹر ملبجون "پروپیگنڈا باز" کہیں گے۔ لیکن درحقیقت یہ وہ لوگ ہیں جو خاص طور پر ذمہ دار اور باشعور ہیں۔ دانتے کے مقصد سے واقف ہونے کے لئے صرف **Convivio** تھا اور **Can—Grande** کے نام اس کا خط پڑھ لینا کافی ہے۔

ملٹن بھی شعوری طور پر پروپیگنڈسٹ تھا لیکن یہاں ہمیں ایک اور فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ لکریشس اور دانتے کے فلسفے، جیسے کہ وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اب بھی انسانیت پر اثر انداز ہونے کی پوری قوت رکھتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ آج کوئی بھی قاری ملٹن کے دینی نظریات سے متاثر ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ لکریشس اور دانتے دونوں اپنی عظیم شاعری میں ان دو نظریات کا نچوڑ پیش کر رہے ہیں جو مغرب کے ذہن کی تاریخ میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ ملٹن عظیم شاعری میں صرف و محض وہ نظریہ پیش کر رہا ہے جو بڑی حد تک اس کی اپنی ایجاد ہے اور ایک ایسی نرالی بدعت کا اظہار کر رہا ہے جو اس کے اپنے دماغ میں پیدا ہوئی تھی۔ ملٹن کے کلام میں شاعری کی عظمت کو اس کی فکر سے، جو وقیع ہے، الگ کرنا بہت زیادہ آسان ہے۔ اسی لئے ملٹن، رچرڈ مس کے نقطۂ نظر سے، بہت زیادہ قابلِ فہم ہے۔ کیونکہ ملٹن کو پڑھتے وقت، میرا خیال ہے، ہم دینیات یا فلسفہ کی طرف مائل ہوئے بغیر شوکتِ شاعری میں کھو جاتے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا ایک ادبی فنکار ایک غیر ذمہ دار پروپیگنڈسٹ ہے یا نہیں ہمیں مختلف زمانوں کے تعلق سے مقصد کے تنوع اور اثر کے تنوع دونوں پر نظر رکھنی ہوگی۔ ملٹن کا یہ زبردست اثر، میرا خیال ہے، صرف ایک زمانے کے لئے مخصوص تھا اور لکریشس اور دانتے کا اثر ہر زمانے کے لئے ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ملٹن اب بھی وہ اثر رکھتا ہے۔ عمومی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی ادب پارے کے حقیقی اثر میں پروپیگنڈا کے عنصر کا انحصار یا تو نظریہ اور اصولوں کی دائمیت پر ہوگا یا پھر ادب پارے کی زمانی قربت پر۔ "دی وے اوف آل فلیش" جیسی کتاب کا اثر مجھے یقین ہے، بٹلر کے فوراً بعد آنے والی نسلوں پر تو حسبِ منشا ہوا لیکن دوسری نسلوں پر اس کا وہ اثر ہرگز نہیں ہوا۔

آپ اس سے شاید یہ نتیجہ اخذ کریں کہ اس طرح کسی فن پارے سے لطف اندوز ہونا
(یا اسے پرکھنا) ناممکن ہے تاوقتیکہ اتنا وقت نہ گزر جائے کہ وہ نظریہ ہی فرسودہ ہو جائے
تاکہ ہم صرف اسے دیکھیں اور قبول کر لیں۔ مسٹر رچرڈس ہم سے یہی مطالبہ کرتے ہیں: چند سو
سال انتظار کیجئے اور پھر ہمیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کوئی ادب پارہ کتنا اچھا ہے۔ اس کی
کئی وجوہ ہیں جن کی بنا پر یہ سیدھا سادا حل کام نہیں دے سکتا۔ ایک تو یہ کہ جب ایک
مصنف، زمانی یا نسلی اعتبار سے، ہم سے اتنا دور ہو کہ ہم اس کے مواد کے بارے میں کچھ نہ
جانتے ہوں اور اس کے عقائد کو بالکل سمجھ نہ سکتے ہوں تو اس صورت میں ہم اس کے کلام
سے بھی بحیثیت شاعری لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ ہومر کی شاعری سے لطف اندوز ہونے
کے لئے ہمیں یونانی لغت، یونانی قواعد گردان اور صرف و نحو سے زیادہ کچھ اور جاننے کی
ضرورت ہے اور جتنا زیادہ ہم خود کو قدیم یونان کی زندگی میں رچاتے بساتے جائیں گے اور
جتنا زیادہ ہم اس دنیا کو اپنے تخیل میں از سر نو تخلیق کرتے جائیں گے اتنا ہی زیادہ ہم اس
دنیا کی شاعری کو بہتر طریقہ پر سمجھتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے جائیں گے۔ دوسرا سبب
یہ ہے کہ محض زمانہ لازمی طور پر بے تعلقی پیدا نہیں کرتا۔ وہ یا تو محض چند ایسے تعصبات کا
بدل بن جاتا ہے جو فنکار کی حمایت میں چلتے ہیں یا چند ایسے تعصبات کا جو اس کے خلاف جاتے
ہیں۔ مسٹر رچرڈس کے شاگردوں کی وہ رائے دلچسپ ہے جو "عملی تنقید" میں ڈان کی عظیم سانیٹ
کے بارے میں دی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان طالب علموں کی یہ غلط فہمی ڈان کے زمانے کی
دینیات سے لاعلمیت کی وجہ سے اتنی نہیں ہے جتنی کم و بیش دوسرے قسم کے اُن عقائد کو
بالا ارادہ قبول کرنے کی وجہ سے ہے جو ہمارے دور میں رائج ہیں۔

میں نے لکریشس اور دانتے کو ذمہ دار پروپیگنڈسٹ کہا ہے مگر کچھ شاعر ایسے بھی
ہیں جنہیں پروپیگنڈسٹ کہنا زبردستی کی بات ہے۔ شیکسپیئر ہی کو لیجئے۔ وہ اول الذکر
کی طرح کبھی کوئی مخصوص فلسفیانہ نظام پیش نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں کہ ایسی بہت
کوششیں کی گئی ہیں اور آئندہ بھی کی جاتی رہیں گی کہ جن میں اس نظریۂ زندگی کو
اور واضح نثر میں پیش کیا گیا ہے جس پر شیکسپیئر ایمان رکھتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں

ندگی کے بہت سے نظریئے شیکسپیر کے کلام سے اخذ کئے جا چکے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا
ایسی کوششیں بے جا یا سرے سے بے کار ہیں۔ شیکسپیر کی بابت فلسفہ بنانے کا رجحان
ناہی فطری ہے جتنا خود زندگی کے بارے میں فلسفہ بنانے کا رجحان۔ فرق صرف یہ ہے
شیکسپیر کا فلسفہ دانتے کے فلسفے سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ
بیتھووِن کے فلسفے سے زیادہ قریب ہے۔ اس بات سے میرا مطلب یہ ہے کہ ہم میں
ے ان لوگوں کو جو بیتھووِن سے محبت کرتے ہیں اس کی موسیقی میں ایک ایسی چیز ملتی ہے
ے ہم موسیقی کے 'معنی' کہہ سکتے ہیں۔ حالانکہ ان 'معنی' کو ہم الفاظ میں بیان کرنے سے
صر ہیں لیکن یہی وہ معنی ہیں جو کسی نہ کسی طرح ہماری پوری زندگی میں ٹھیک بیٹھتے ہیں۔ یہ
ز محض بیتھووِن کی فنی مہارت کی توصیف نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو اسے
زبانی عمل میں تبدیل کر کے ایک دستور العمل بنا دیتی ہے۔ شیکسپیر بھی یقیناً ہم پر اثر انداز
تا ہے لیکن وہ چونکہ ہر شخص کی تعلیم، مزاج اور ادراک و شعور کے مطابق اثر انداز ہوتا ہے
ر چونکہ ہمیں کوئی ایسا نشان نہیں ملتا جس سے کسی شخص کے ذہن پر اس اثر کا، جو شیکسپیر
رنا چاہتا تھا، پتہ چل سکے اس لئے اسے پروپیگنڈا کہنا ایک عجیب و غریب بات
ی گی۔

جب ہم مسٹر وہائٹ ہیڈ کے مرشد یعنی شیلی اور ورڈز ورتھ کو دیکھتے ہیں تو
عاملہ کچھ اور دکھائی دیتا ہے۔ مسٹر وہائٹ ہیڈ پر ان لوگوں کے اثر کو دیکھتے ہوئے ہم
قیناً انہیں غیر ذمہ دار پروپیگنڈسٹ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ وہائٹ ہیڈ
یسے انسان پر ان کا اثر راست ان کے خیالات کے ابہام سے تعلق رکھتا ہے یا پھر اس
ی کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ چند چیزوں کی تفصیل بیان کرنے کے بجائے انہیں بلا ثبوت کے
ان لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر کٹر عیسائی مشکل سے دانتے کو عیسائیت کی توثیق کرنے والا
یں گے۔ کٹر مادہ پرست بمشکل لکریشس کو مادیت یا جوہریت کا علمبردار تسلیم کریں گے۔
انتے اور لکریشس کی شاعری میں اسے جو کچھ ملے گا وہ 'جمالیاتی' توثیق ہے یعنی فن میں
ندگی کے ان نظریوں کا جزوی جواز جن کے یہ دونوں علمبردار ہیں اور اس میں کوئی شک

نہیں ہے کہ ہم شدید طور پر جمالیاتی توثیق کے اسی پہلو سے متاثر ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ کوئی نظام یا کوئی بھی نظریۂ حیات جو عظیم فن کو پروان چڑھائے ہمارے لئے بمقابلہ اس نظام یا نظریۂ حیات کے جو کمتر درجے کے فن کو جنم دے یا پھر سرے سے کسی فن کو ہی جنم نہ دے، زیادہ قابلِ قبول ہے۔ اس کے برخلاف میں نہیں سمجھتا کہ کوئی عیسائی پورے طور پر بدھ فن کو یا کوئی بدھ کسی عیسائی فن کو پورے طور پر سمجھ سکتا ہے۔

مجھے شبہ ہے کہ مسٹر وھائٹ ہیڈ جمالیاتی توثیق کا وہ استعمال نہیں کر رہے ہیں جسے میں معقول سمجھتا ہوں۔ آپ اقوال یا حکیمانہ مقولوں کی تلاش میں کسی شاعر کا مطالعہ کر کے بھی اسے حاصل نہیں کر سکتے یا پھر آپ ان شعراء سے ہاتفِ غیبی کی الہامی صفات وابستہ کر کے بھی اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ آپ صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شاعر نے اپنی شاعری کی تخلیق میں ان خیالات کو استعمال کیا ہے اور اس طرح یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ خیالات کچھ اقدار کو جنم دے سکتے ہیں بلکہ انہوں نے کچھ اقدار کو جنم دیا بھی ہے۔ نتیجے کے طور پر یہ خیالات صرف ایک نظریہ کے طور پر اہم نہیں ہیں بلکہ فن کے ذریعہ انہیں زندگی میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے کسی شیلی یا کسی ورڈز ورتھ کے فن کی قدر و قیمت متعین کی جائے یعنی سوال کیا جائے کہ شاعر نے جو فلسفہ استعمال کیا ہے وہ کتنا مکمل، کتنا دانشمندانہ اور کتنا واضح ہے اور شاعرانہ سطح پر اسنے اس فلسفہ کو کس کمال تک پہنچایا ہے پھر یہ بھی کہ یہ نظریہ اسنے کہاں سے حاصل کیا اور یہ خود زندگی کا کس قدر احاطہ کرتا ہے؟ اس قسم کے سوالات ہمیں پہلے اٹھانے ہوں گے۔ کسی فلسفہ کی بابت شاعری جو کچھ ثابت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں زندگی کا کتنا امکان موجود ہے ــــ کیونکہ زندگی میں فلسفہ اور فن دونوں شامل ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فلسفہ کی عظمت اور جامعیت حقیقی یا نظریاتی اعتبار سے شاعری کی عظمت سے کوئی تعلق رکھتی ہے؟ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ایک شاعر کسی ادنےٰ فلسفہ کو ادبی فن میں پوری طرح اور زیادہ استادانہ مہارت کے ساتھ استعمال کر کے اسکو زیادہ وقیع بنا رہا ہے اور دوسرا شاعر بہتر فلسفہ کو کام میں لانے کے باوجود کم تسلی بخش طریقے پر

بروئے کار لا رہا ہے۔ تاہم اس بات پر شک نہیں کیا جا سکتا کہ صحیح ترین' فلسفہ عظیم ترین شاعروں کے لئے بہترین مواد فراہم کرتا ہے۔ اس لئے آخر کار شاعر کی اہمیت اس فلسفہ سے بھی متعین ہو گی جسے وہ اپنی شاعری میں بروئے کار لا رہا ہے اور ساتھ ساتھ فنی عمل پذیری کی تکمیل اور موزونیت سے بھی۔ کیونکہ شاعری ـــــ اور یہاں مجھے مسٹر رچرڈسس کی رائے سے اتفاق ہے ـــــ اس بات کا اقرار نہیں ہے کہ فلاں چیز صحیح ہے بلکہ شاعری کسی صداقت کو زیادہ اصلی اور زیادہ حقیقی بنانے کا نام ہے۔ شاعری ایک حسی تجسیم کی تخلیق کا نام ہے۔ یہ لفظوں کو گوشت پوست دینے کا کام ہے۔ یہ بات واضح سی ہے کہ شاعری کے لئے لفظوں میں مختلف خوبیاں اور مختلف کیفیات ہوتی ہیں اور ساتھ ساتھ گوشت پوست کی بھی مختلف خوبیاں اور مختلف سیرتیں ہیں۔ حقیقتاً جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے' کچھ اقسام کی شاعری کے لئے ضروری ہے کہ شاعر اس فلسفہ پر ایمان رکھتا ہو جس کو وہ استعمال میں لا رہا ہے۔ بہر حال میں فلسفہ کی اہمیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینا نہیں چاہتا یا اس سلسلے میں ایسی بات نہیں کرنا چاہتا گویا فلسفہ ہی شاعر کے لئے خصوصی مواد فراہم کرتا ہے۔ جب ہم لکریشس اور دانتے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ شاعر نے فلسفے اور اپنے فطری احساسات کے درمیان' ایسا اتحاد پیدا کر دیا ہے کہ ایک طرف فلسفہ حقیقی ہو گیا ہے اور دوسری طرف احساسات بلند، گہرے اور شاندار ہو گئے ہیں۔

اور ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شاعری کا استعمال' بھی بنی نوع انسان کے لئے وہی کام کرتا ہے جو فلسفہ کا استعمال۔ جب ہم انسانی دستور العمل کے طور پر فلسفہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم ایسا صرف اس لئے نہیں کرتے کہ ہم ایک فلسفہ چھانٹ لیں اور پھر اسے صحیح' مان کر اختیار کر لیں یا پھر ہم سارے فلسفوں کو ملا کر اپنا ایک الگ فلسفہ بنا لیں۔ ہم زیادہ تر ایسا مفروضہ کی مشق کے لئے کرتے ہیں یا پھر خیالات سے دل بہلانے کے لئے۔ ذہن کی مشق کے لئے جب ہم کسی فلسفی کی فکر کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اسی کی طرح سوچنے لگتے ہیں اور اس طرح ایک تجربے سے دوسرے تجربے میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ اور

اس طرح بغیر ایمان لائے، صرف فکر کی مشق کے طور پر، جہاں تک ایسا ممکن ہے، ہم کسی بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں جہاں پہنچ کر ہم ایمان بھی لے آتے ہیں اور اس کا ادراک بھی کر لیتے ہیں۔ یہی حال اس تجربے کا ہے جو شاعری سے ملتا ہے۔ ہم علمی طور پر ایسی شاعری میں پناہ لیتے ہیں جو شاعرانہ سطح پر ہمارے اس عقیدہ کا اظہار کرے جس پر ہم خود ایمان رکھتے ہیں مگر ہم شاعری سے اس وقت تک ہمکنار نہیں ہو سکتے جب تک ہم آزادی کے ساتھ شعری تخلیق کی متنوع دنیاؤں میں سے نہ گزر چکے ہوں۔ عملاً ہمارے ادبی فیصلے ہمیشہ خطا پذیر ہوتے ہیں کیونکہ لازمی طور پر ہم ایسی شاعری کی بڑھا چڑھا کر تعریف کرتے ہیں جو کسی ایسے نظریۂ حیات کی تجسیم کرتی ہو جسے ہم سمجھتے اور قبول کرتے ہیں۔ لیکن ہم ایسی شاعری کو واقعتاً اس وقت تک اتنا بلند مقام نہیں دے سکتے جب تک ہم شاعری کی ان دنیاؤں میں داخل ہونے کی کوشش نہ کریں، جہاں ہماری حیثیت ایک اجنبی کی ہو۔ شاعری یہ ثابت نہیں کرتی کہ فلاں چیز صحیح ہے۔ شاعری تو صرف 'کُل' کے تنوع کو تخلیق کرتی ہے جو ذہنی و جذباتی عناصر سے مرکب ہوں جن میں جذبات فکر کا جواز پیش کر رہے ہوں اور فکر جذبات کا۔ شاعری یا تو کامیابی کے ساتھ یہ بات پایۂ تصدیق کو پہنچا دیتی ہے کہ فکر و خیال کے کچھ عالم ممکن ہیں یا پھر وہ اس میں ناکام رہتی ہے۔ شاعری احساس کیلئے ذہنی توثیق کا کام کرتی ہے اور فکر کے لئے جمالیاتی توثیق مہیا کرتی ہے۔

(سنہ ۱۹۳۰ء)

بودلیئر

وہ چیز جسے بودلیئر کی صحیح توصیف کہہ سکتے ہیں انگلستان میں ذرا دیر سے پیدا ہوئی اور خود فرانس میں اب بھی ناقص اور جانب دارانہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ بودلیئر کی قدر و قیمت اور اس کا مقام متعین کرنے کی مشکلات کے خاص وجوہ ہیں۔ ایک چیز تو یہ ہے کہ بودلیئر کچھ باتوں میں اپنے زمانے کے نقطۂ نظر سے کافی آگے تھا اور اس کے باوجود شدت سے اپنے زمانے کا ایک جزو تھا اور بڑی حد تک اپنے زمانے کی اچھائیوں، برائیوں اور فیشن میں برابر کا شریک رہا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ اس نے اپنے بعد آنے والے شعراء کی نسل کی تشکیل میں بڑا اہم حصہ لیا۔ ایک طرح سے یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ انگلستان میں پہلی بار فرنخدلی کے ساتھ سوئن برن کے ذریعہ اس کا تعارف ہوا اور پھر سوئن برن کے پیروکاروں نے اسے اپنا لیا۔ وہ ایک آفاقی شاعر تھا اور اسی کے ساتھ اس فیشن میں محصور بھی تھا جسے پیدا کرنے میں خود اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ دائمی کو عارضی سے الگ کرنا، خود آدمی اور اس کے 'اثر' میں فرق کرنا اور پھر آخر میں انگریزی شعراء کی اس مجلس سے اسے الگ کرنا کہ جس نے سب سے پہلے اس کی تعریف و توصیف کی تھی، کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اس کی 'جامعیت' بذاتِ خود مشکلات پیدا کرتی ہے کیونکہ اب بھی حمایتی نقادوں کو بودلیئر کی یہ جامعیت اس بات کی ترغیب دیتی ہے کہ وہ اس کو خود اپنے عقیدوں کا سرپرست سمجھیں۔

اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ بودلیئر کے نثری کارناموں کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔

اس مقصد کا جواز اس کی ایک تصنیف[1] کے انگریزی ترجمے سے بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کا مطالعہ اس کی شاعری کے طالب علم کے لئے بے حد ضروری ہے۔ اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ کیا بودلیئر "بدی کے پھول" کے مصنف کے علاوہ بھی کچھ اور قابلِ قدر پہلو رکھتا ہے تاکہ ہم اس کتاب کے بارے میں کسی قدر اپنے خیالات پر نظرِ ثانی کر سکیں۔ بودلیئر اس وقت سامنے آیا جب "فن برائے فن" ایک مسلمہ اصول تھا۔ وہ احتیاط جو اس نے اپنی نظموں میں برتی اور اپنے زمانے کے رجحان کے برخلاف، جو انگلستان اور فرانس دونوں میں اس وقت پایا جاتا تھا، اس نے صرف ایک دیوان، شائع کرنے پر اکتفا کیا، اس خیال کو پیدا کیا کہ بودلیئر ایک ایسا فن کار ہے جو کلیتہً "فن برائے فن" کا قائل ہے۔ فی الحقیقت یہ نظریہ کسی بھی شخص پر پورا نہیں اترتا۔ کسی نے بھی اسے پیٹر سے کم اہمیت نہیں دی کہ جس نے متعدد سال نہ صرف اس نظریہ کی تشریح میں بلکہ اسے ایک نظریۂ حیات کے طور پر پیش کرنے میں صرف کئے۔ کسی چیز کی تشریح کرنے اور اسے نظریہ کے طور پر پیش کرنے میں فرق ہے۔ لیکن وہ ایک ایسا اصول ضرور تھا جس نے توصیف و تنقید کو بھی متاثر کیا ہے اور ساتھ ساتھ بودلیئر کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں بھی مشکلات پیدا کی ہیں۔ وہ فی الحقیقت اس سے کہیں زیادہ کامل شاعر تھا جتنا کہ اب تک اسے سمجھا جاتا رہا ہے حالانکہ شاید وہ اس قدر جامع شاعر نہیں تھا۔

بودلیئر کو میرا خیال ہے کہ "نامکمل دانتے" کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا ہے۔ اس بات کو جو بھی معنی چاہے دے لیجئے۔ یہ بات صحیح ہے کہ بہت سے لوگ جو دانتے کی شاعری سے لطف اندوز ہوتے ہیں بودلیئر سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن دونوں کے درمیان فرق بھی اتنا ہی اہم ہے جتنی دونوں کے درمیان مشابہتیں اہم ہیں۔ بودلیئر کی "انفرنو" اپنی خصوصیات اور اہمیت کے اعتبار سے دانتے سے بہت مختلف ہے۔ لیکن، میرا خیال ہے، سب سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ بودلیئر کو بعد کے دور کا اور زیادہ محدود گوئٹے کہا جائے۔ جیسا کہ ہم نے اب اسے سمجھنا شروع کیا ہے وہ بھی اپنے دور کی اسی طرح نمائندگی کرتا ہے جس طرح گوئٹے نے اس

---

[1] Journaux Intimes مترجمہ کرسٹوفر اشروڈ۔ مطبوعہ بلیک مور پریس۔

سے پہلے اپنے دور کی کی تھی۔ موجودہ نسل کے نقاد کی حیثیت سے پیٹر کوئی نیل نے حال ہی میں اپنی کتاب "بودلیئر اور اشاریت پسندی" میں کہا ہے کہ:

"اس میں اپنے زمانے کا شعور گہرا تھا۔ اسنے اس وقت اس کا سانچہ متعین کر لیا تھا جب وہ ابھی نامکمل ہی تھا۔ اور ــــ کیونکہ حال کے بارے میں یہ صرف ہماری غلط خیالی ہے جو ہمیں مستقبل قریب کو دیکھنے سے باز رکھتی ہے اور چھوٹے میلانات اور تقاضوں کے علاوہ حال اور اس کے اصل تقاضوں کے بارے میں ہماری عدم واقفیت ہے ـــ اسنے جمالیاتی اور اخلاقی دونوں سطح پر ان بہت سے مسائل کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا جن سے جدید شاعری کی قسمت آج بھی وابستہ ہے۔"

ایسے ہی اس آدمی کا، جو اپنے دور کا ایک گہرا شعور رکھتا ہو، تجزیہ کرنا دشوار ہے۔ وہ اپنے دور کی حماقتوں میں شریک ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دور کی ایجادات کا پورا احساس رکھتا ہے۔ بودلیئر اور ساتھ ساتھ گوئٹے دونوں میں اپنے زمانے کی قدامت پسند لغویات موجود ہیں۔ جرمن شاعر کہ جو ہر اعتبار سے ہمیشہ 'مکمل صحت'، اور آفاقی تجسس کی علامت رہا ہے اور فرانسیسی شاعر کہ جو مریضانہ ذہنیت اور کام میں مخصوص محویت کی علامت رہا ہے، کے درمیان مشابہت بظاہر مہمل سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد اب دونوں آدمیوں میں 'صحت' اور 'مریضانہ ذہنیت' کے درمیان فرق برائے نام رہ گیا ہے۔ اب ہمیں گوئٹے کی 'صحت مندی' میں تصنع اور عالمانہ تنگ نظری معلوم ہوتی ہے بالکل ویسے ہی جیسے بودلیئر کی مرض پسندی میں۔ ہم 'صحت' اور 'مرض' دونوں کے رجحان سے اب آگے نکل گئے ہیں اور اب یہ دونوں صرف محض بے قرار، نکتہ رس اور متجسس ذہن کے نمائندہ ہیں کہ جو اپنے زمانے کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ دونوں آدمی ایسے تھے جن میں حد درجہ فہم و ذکاوت بھی تھی اور بصیرت بھی۔ یہ بات صحیح ہے کہ گوئٹے ایسے بہت سے موضوعات میں دلچسپی رکھتا تھا جنھیں بودلیئر نے ہاتھ تک نہیں لگایا لیکن بودلیئر کے زمانے تک یہ بات

ضروری بھی نہیں رہی تھی کہ آدمی اپنے دور کا شعور حاصل کرنے کے لئے اتنی مختلف چیزوں میں دلچسپی لے۔ اب جو ہم گزشتہ زمانے پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں گوئٹے کا ذوقِ مطالعہ علمی ظاہرداری کا ایک کھیل معلوم ہوتا ہے (حالانکہ یہ بات بھی تمامتر صحیح نہیں ہے) بودلیئر کی بیشتر نثری تحریریں (پو کے تراجم کے علاوہ، جو انگریزی داں قاری کے لئے زیادہ اہم نہیں ہیں) اتنی ہی اہم ہیں جتنی گوئٹے کی بیشتر تحریریں۔ یہ تحریریں یقیناً "بدی کے پھول" کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں لیکن مصنف کے بارے میں ہماری توصیف کو بھی بے انتہا وسیع کر دیتی ہیں۔

ایک زمانے میں بودلیئر کی 'بدی' پر سنجیدگی سے غور کرنے کا رواج تھا جیسے آج کل بودلیئر کو ایک سنجیدہ کیتھولک عیسائی کے طور پر پیش کرنے کا رجحان ہے۔ آرار کے اختلاف میں ضرورت اس امر کی ہے کہ Journaux Intimes کی تمہید کے طور پر کچھ اظہار خیال کیا جائے۔ میرے خیال میں یہ بات کہ بودلیئر بنیادی طور پر عیسائی ہے اول الذکر بات کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہے۔ لیکن اس میں بھی معقول احتیاط کی ضرورت ہے۔ جب بودلیئر کے بدی کے تصور کو اس کے کم قابلِ قدر لوازمات سے الگ کر دیا جاتا ہے تو اس کا یہ نظریہ عیسائیت کے ایک حصے کا، حالانکہ یہ حصہ بھی بہت اہم ہے، مبہم الہامی تصور بن کر رہ جاتا ہے۔ بدی بذاتِ خود، اگر یہ محض ظاہرداری نہیں ہے، عیسائیت میں چور دروازے سے داخل ہونے کی ایک کوشش تھی۔ حقیقی الحاد، جو صرف زبانی جمع خرچ نہ ہو بلکہ اصل میں حقیقی ہو، جانبدارانہ عقیدہ کی پیداوار ہے۔ حقیقی الحاد پکے ملحد کے لئے بھی اتنا ہی ناممکن ہے جتنا ایک پکے عیسائی کے لئے۔ یہ دراصل عقیدے کے اقرار ہی کا ایک طریقہ ہے۔ جانب دارانہ عقیدہ کا یہ عمل Journaux Intimes کی سطر سطر سے ظاہر ہوتا ہے۔ بودلیئر کے سلسلے میں جو بات اہم ہے وہ اس کی دینی معصومیت ہے۔ وہ اپنے لئے عیسائیت کو دریافت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ اسے ایک فیشن کے طور پر اختیار نہیں کر رہا ہے یا سماجی اور سیاسی اسباب میں نہیں تول رہا ہے یا کسی مصلحت کی بنا پر ایسا نہیں کر رہا ہے۔ وہ ایک طرح سے اس کی ابتدا کر رہا ہے اور دریافت کنندہ ہونے کے باعث، اسے پورے طور پر یقین نہیں ہے کہ وہ کیا دریافت کر رہا ہے اور وہ کہاں پہنچے گا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک فرد ہو کر بھی

نہ کام کررہا ہے جو بیسیوں نسلوں کی متفقہ کوششوں سے پورا ہوتا ہے۔اسکی عیسائیت متبدیانہ اور اچھوتی ہے۔زیادہ سے زیادہ اس کی بے اعتدالیاں ٹرٹولین[1] کی طرح ہیں (حتیٰ کہ ٹرٹولین کو بھی پورے طور پر کٹر اور متوازن نہیں کہا جاسکتا) اس کا منشا یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ عیسائیت کی پابندی کرے اور اس پر عمل کرے بلکہ ـــ جو اسکے اپنے زمانے کے لئے بہت زیادہ ضروری تھا۔اسکی 'ضرورت' کو واضح کرے۔

بودلیئر کی مرض پسندی کے مزاج کو یقیناً نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور کوئی بھی شخص جس نے کریپے کی تحریروں کو پڑھا ہے یا فرانسوے پورشے کے مختصر سوانحی مطالعے پڑھے ہیں، مرض پسندی کے اس مزاج کو نہیں بھول سکتا۔ اگر ہم نے اسے افسوسناک مرض سمجھ کر نظرانداز کرنے یا اسکی تحریروں سے صحت مند عناصر کو غیر صحت مند عناصر سے الگ کرنے کی کوشش کی تو ہم بھٹک جائیں گے مرض پسندی کے بغیر اس کی کوئی بھی تحریر نہ وجود میں آسکتی تھی اور نہ وہ بامعنی ہوسکتی تھی۔اسکی کمزوریاں کو ملا کر ایک طاقتور اکائی بنائی جاسکتی ہے۔میرے اس ادعا میں یہ بات مضمر ہے کہ نہ گوئٹے کی 'صحت' اور نہ بودلیئر کی 'بیماری' بذات خود کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ جو بات اہم ہے وہ یہ کہ ان دونوں آدمیوں نے اپنی صلاحیتوں سے کس طرح فائدہ اٹھایا۔ دنیا کی نظر میں اور مناسب طور پر نجی زندگی کے امور میں بودلیئر قطعی طور پر سخت ناقابلِ برداشت اور اوندھی کھوپڑی کا انسان تھا۔ ایسا انسان جس میں احسان فراموشی اور غیر معاشرت پسندی کی طرف خاص رجحان تھا ـــ ناقابلِ برداشت حد تک بددماغ۔ اور جس میں ہر کام کو خراب کردینے کی خچر کی سی قوتِ ارادہ تھی۔اگر اس کے پاس روپیہ ہوتا تو وہ اسے بے طرح لٹا دیتا۔ اگر دوست ہوتے تو انہیں ناراض کردیتا اور اگر کوئی چیز خوش قسمتی سے حاصل ہوجاتی تو اس سے نفرت کرتا۔ اس میں ایسے شخص کا تکبر تھا جو اپنے اندر بڑی کمزوریاں اور بڑی قوتیں محسوس کرتا ہو۔ عظیم 'جینئس' ہونے کے باوجود اس میں صبر تھا اور نہ وہ قوت کہ اپنی کمزوریوں پر حاوی آسکے۔ برخلاف اس کے اس نے

---

[1] رومن عالم دین Apologeticus اس کی اہم ترین تصنیف ہے۔

اسے نظریاتی مقاصد کے حصول پہ لگا یا۔ ایسے عمل کے اخلاقی پہلو پر بے انتہا بحث ممکن ہے
مگر بودلیئر کے لئے یہ ذہنی قوتوں کو آزاد کرانے کا ذریعہ تھا اور یہی وہ میراث اور یہی وہ
سبق ہے جو اسنے ہمیں دیئے ہیں۔

وہ ایسے لوگوں میں تھا جو عظیم قوت رکھتے ہیں لیکن محض "تکلیف اٹھانے" کی قوت
وہ نہ تو تکلیف سے فرار حاصل کر سکا اور نہ اس سے ماورا ہو سکا۔ لہٰذا اسنے اپنی تکلیف کو
اپنی ذات میں سمولیا، مگر اس بے انتہا منفعل قوت اور ادراک سے، جس کو کوئی درد
بگاڑ نہ سکتا تھا، وہ جو کچھ کر سکا یہ تھا کہ خود اپنی تکلیف کا مطالعہ کرے۔ اور اس کمزوری
میں وہ دانتے سے بالکل مختلف ہے حتیٰ کہ وہ دانتے کے جہنم کے کسی کردار کی طرح بھی نہیں
ہے۔ مگر برخلاف اسکے وہ تکلیف جو بودلیئر نے اٹھائی ایک مثبت روحانی مسرت کا امکان
بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ حقیقتاً اس کے تکلیف اٹھانے کے طریقہ میں ایک قسم کے مافوق الفطرت
اور کامل انسان کا وجود نظر آتا ہے۔ وہ ہمیشہ خالص انسانی اور خالص فطری امور کو رد کر
دیتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر نہ وہ "فطرت پسند" ہے اور نہ "انسانیت پسند"۔ یا تو اس لئے کہ
وہ خود کو حقیقی دنیا کے مطابق بنانے سے قاصر ہے اور وہ اسے جنت اور جہنم میں تبدیل کر لیتا
ہے یا اس لئے کہ وہ جنت و جہنم کا ایسا تصور رکھتا ہے کہ وہ موجودات کو رد کر دیتا ہے۔
یہ دونوں باتیں اس کے کلام سے ثابت ہیں۔ اس کے اقوال میں بہت کچھ رومانی رجحان ہے:
"یہ دیو کے سے پر زمین پر چلنے میں حارج ہیں"۔ یہ بات وہ شاعر اور الباٹروس[1] دونوں کے
بارے میں کہتا ہے مگر وثوق کے ساتھ نہیں۔ مگر اس بات میں اس کی ذات اور دنیا کے متعلق
اہم حقیقت نظر آتی ہے۔ اس کی اس بیزاری کو اسی طرح سمجھایا جا سکتا ہے جس طرح ہر چیز
نفسیاتی اور حیاتیاتی اصطلاحوں کے ذریعہ سمجھائی جا سکتی ہے۔ مگر مخالف نقطۂ نظر سے یہ اس
تیزابیت کی صحیح شکل ہے جو روحانی زندگی کی طرف ناکامیاب جدوجہد سے پیدا ہوتی ہے

---

[1] ایک بہت بڑا پرند جسے ملاح Cape sheep بھی کہتے ہیں۔ اس پرند کے متعلق بہت سی حکایتیں
مشہور ہیں مثلاً یہ کہ وہ ہوا میں سوتا ہے کیونکہ اڑتے وقت اسکے پر بظاہر حرکت نہیں کرتے۔ ملاحوں کے خیال
میں اسے مارنا مہلک ہے۔

(۲)

میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ محض نظموں سے بودلیئر کے ذہن کے مفہوم اور معنی کو سمجھنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ ان نظموں کی ہیئت کی خوبی، ان کے فقروں کا کمال اور ان کی سطحی ہم آہنگی سے ظاہرہ طور پر ایک مخصوص اور مکمل ذہن کا تاثر پیدا ہو سکتا ہے۔ حقیقتاً مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلاسیکی فن کی ظاہرہ ہیئت ان میں موجود ہے لیکن اندرونی ہیئت نہیں ہے۔ یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ہیئت کے کمال کی طرف انیسویں صدی کے کچھ رومانی شاعروں کی احتیاط صرف اس بات کی کوشش تھی کہ اپنی اندرونی ابتری و ہیجان کو عام نظروں سے چھپایا جائے۔ فنکار کی حیثیت سے بودلیئر کا اصل دعویٰ یہ نہیں ہے کہ اس نے ایک سطحی ہیئت حاصل کر لی بلکہ یہ ہے کہ وہ زندگی کی ہیئت کی تلاش میں تھا۔ کمتر درجہ کی ہیئت میں وہ حقیقتاً تھوفائل گوتیئر کی بھی برابری نہ کر سکا جس کے نام اس نے "بڑے معنی خیز انداز میں" اپنی نظمیں معنون کی ہیں۔ گوتیئر کی معمولی نظموں میں سے جو بہترین ہیں ہمیں ایک تسکین ملتی ہے۔ ہیئت اور اندرونی جذبات کے درمیان توازن نظر آتا ہے جو ہمیں بودلیئر کے ہاں نہیں ملتا۔ بودلیئر میں تکنیکی صلاحیت گوتیئر سے زیادہ تھی مگر اسکے جذبات کا جوش ہمیشہ برتن کو توڑتا نظر آتا ہے۔ اس کے آلات، جن سے میری مراد قدرتِ الفاظ اور عروض سے نہیں ہے، بلکہ امیجری کے ذخیرے سے ہے (اور ہر شاعر کی امیجری کا ذخیرہ کہیں نہ کہیں آکر محدود ضرور ہو جاتا ہے) نہ تو پورے طور پر رد کر دینے کے قابل ہیں اور نہ انہیں کافی کہا جا سکتا ہے۔ اس کی رنڈیاں، خانگیاں، یہودنیں، سانپ، بلیاں، لاشیں مل کر ایک ایسا عالم بناتی ہیں جو زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ اس کا شاعر، ڈون ژواں ایک ایسے رومانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کا بہت آسانی کے ساتھ سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ بودلیئر کے ذخیرے سے 'ویتا نووا' (Vita Nauva) یا کاوالسنتی کی امیجری کے ذخیرے سے مقابلہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی صدی قبل کے لوگوں کے برابر بھی اس کے کلام میں زندہ رہنے کی قوت نہیں ہے۔ اس کا مقابلہ، جس حد تک یہ مقابلہ مفید ہو، دانتے اور شیکسپیئر سے کیجئے تو وہ نہ صرف کمتر درجے کا شاعر معلوم ہوگا بلکہ ایسا شاعر بھی جس کے کلام میں فناپذیر عناصر کا

بہت زیادہ حصہ شامل ہو گیا ہے۔

اس بات سے یہ کہنا مقصود ہے کہ بودلیئر ایک مخصوص دور کا شاعر ہے۔ یقیناً وہ رومانیت کی پیداوار تھا اور اپنی فطرت سے وہ شاعری میں رومانیت کا پہلا باغی بھی تھا۔ وہ ہر شخص کی طرح صرف اس مواد سے کام لے سکا جو موجود تھا۔ یہ واضح رہے کہ رومانی دور کا کوئی شاعر، چند رجحان کے علاوہ، کلاسیکی شاعر ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر شاعر مخلص ہے تو وہ عام ذہنی کیفیت کا اظہار، انفرادی فرق کے ساتھ، ضرور کرے گا ـــــ فرض کے طور پر نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ اس میں شریک ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ ایسے شاعروں کے سلسلے میں ہمیں اکثر ان کی نثری تصانیف بلکہ ڈائریاں اور نوٹس پڑھ کر بہت مدد مل سکتی ہے ـــــ ایسی مدد جس سے ان کے دل و دماغ کے ذرائع اور مقاصد، مواد اور نصب العین کے درمیان فرق کیا جا سکے۔

وہ بات، جو بودلیئر کی شاعری کو اس بدقسمتی سے بچائے رہی جس کا انیسویں صدی کے زیادہ تر فرانسیسی شاعر اس وقت تک شکار ہو چکے ہیں اور جیسا کہ ایم ویلیری نے "بدی کے پھول" پر اپنے حالیہ دیباچہ میں کہا ہے کہ وہ ایک جدید فرانسیسی شاعر ہے جو غیر ممالک میں مقبول ہے، آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک حد تک یہ اس تکنیکی کمال کی وجہ سے ہے جس کی تعریف ممکن نہیں اور جس نے بعد کے شاعروں کے لئے اسکی شاعری کو، نہ صرف اس کی اپنی زبان میں ایک کبھی ختم نہ ہونے والا مطالعہ بنا دیا ہے۔ ہم یہ سطور پڑھ کر

اُس دنیا میں (وہ) روحیں جو یہاں غلام کھیل کھیل رہی ہیں
وہاں اندھیارے میں اور عالمِ فراموشی میں
بہت دور ان جرموں اور ان گناہوں سے
ان کے غم پھول کی طرح کھِل رہے ہیں۔
اور ان کی بھینی خوشبو ایک راز کی طرح
تنہائی کی گہرائیوں میں آ رہی ہے۔

ایک لمحے کے لئے محسوس کرتے ہیں کہ یہ میلارمے کا تحریر کردہ ایک زیادہ صاف و رواں ٹکڑا

اور الفاظ کی ترتیب ایسی اچھوتی ہے کہ ہم گرے کی ایلی جی سے سرقے کو آسانی سے نظر انداز کر جاتے ہیں۔ جب ہم پڑھتے ہیں۔

ناچ رہے ہیں غم زندگی اور تھکن کے اثرات

تو ہم لافورگ کے پیرس میں پہنچ جاتے ہیں۔ بودلیئر نے فرانسیسی شاعروں کو اسی فیاضی سے حصہ تقسیم کیا جس فراخدلی سے اپنے انگریزی اور امریکی شاعروں سے لیا تھا۔ راسین کے عروض کی نئی تشکیل کا اکثر ذکر کیا جاتا رہا ہے۔ یہ حقیقی ضرور ہے مگر ممکن ہے اس پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا رہا ہو کیونکہ بعض اوقات یہ ایک کرتب سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ مگر اس کے بغیر بھی بودلیئر کا تنوع، اس کی سوجھ بوجھ اور حاضر دماغی نہایت وسیع دیرپا پایاں رہے گی۔

علاوہ بریں امیجری کے اس ذخیرے کے علاوہ، جو اس نے استعمال کئے اور جو اب فرسودہ معلوم ہوتے ہیں، اس نے شاعری کو معاصر زندگی کی امیجری کے نئے ذخیرے سے نئے امکانات دئے۔

..... پرانے محلے کے بیچوں بیچ پُرپیچ راہوں میں
جہاں انسانیت خشمناک قوت کے ساتھ، پھلی جارہی ہے
مجھے ایک بوڑھا عیاش دکھائی دیتا ہے جو سر کو نیہوڑائے چلا جارہا ہے۔
پریشان ہے اور دیواروں کو حسرت سے تک رہا ہے جیسے کوئی شاعر۔

یہ سطور ایک نئی چیز کا اضافہ کرتی ہیں ــــ ایک ایسی چیز کا جو جدید زندگی میں آفاقی ہے (آخری سطر کا مقابلہ، جو اپنی طنز کی بنا پر کو رہبیر کی پیش بینی کرتی ہے بودلیئر کی نظم 'برکت' (بینی ڈکشن) سے، جس سے کتاب شروع ہوتی ہے، کیا جاسکتا ہے)، نہ صرف عام زندگی کی امیجری کے استعمال ہی سے نہیں اور نہ صرف ایک جدید بڑے شہر کی فرومایہ زندگی کی امیجری سے بلکہ اس امیجری میں رفعت اور شدتِ احساس پیدا کر دینے سے ــــ ان کو جوں کا توں پیش کر دینے کے باوجود ان کو کچھ اور بنا دینے سے ــــ بودلیئر نے دوسرے

ــــــــــــ

[1] And Leaves the world to Darkness and tome—Gray.

لوگوں کے لئے آزادی اور طرزِ ادا کا ایک طور قائم کر دیا۔

زبان کی یہ ایجاد ایسے وقت پر جب فرانسیسی شاعری ایسی ایجاد کے لئے بھوک سے بے قرار تھی، بودلیئر کو عظیم شاعر اور شاعری میں اسے سنگِ میل کا درجہ دینے کے لئے کافی ہے۔ دنیا کی ہر زبان کی جدید شاعری میں حقیقتاً بودلیئر عظیم ترین مثال ہے کیونکہ اس کی نظم اور اس کی زبان اس مکمل تجدد سے قریب ترین ہے جس کا ہم لوگوں نے تجربہ کیا ہے۔ لیکن زندگی کے بارے میں طرزِ فکر کا یہ تجدد بھی کم انقلاب آفرین اور کم اہم نہیں ہے۔ اپنی شاعری میں وہ اب اتنا قابلِ تقلید نمونہ نہیں رہا ہے یا ایک ایسا سرچشمہ نہیں رہا ہے جس سے پیاس بجھائی جاسکے بلکہ 'خلوص' کے فرض کی یاد دہانی کرانے والا ہے' جو ایک مقدس کام ہے۔ بنیادی خلوص کی راہ سے وہ کبھی نہ ہٹ سکا۔ خلوص کے سطحی نشان (میرے خیال میں یہ بات اب تک نہیں کہی گئی) اسکے ہاں اکثر دبیشتر نظر نہیں آتے۔ جیسا کہ میں نے اظہار کیا ہے اس کی بہت سی نظمیں اپنے رومانی مخرج سے ناکافی حد تک دور ہیں اور بائرن کے خاندان اور ابلیسی اخوت کا پتہ دیتی ہیں۔ 'سیاہ گروہ' کی ابلیس پرستی بہت کچھ فضا میں موجود تھی۔ اس کی نمائش کرنے میں بودلیئر اپنے دور کی آواز ہے مگر میں یہ کہوں گا کہ بودلیئر کے ہاں، اور یہ بات کسی اور کے ہاں نہیں ملتی، اسکو کچھ اور معنی دے کر نجات دلائی گئی ہے۔ وہ دہی آلات اور سازوسامان استعمال کرتا ہے لیکن ابلیس پرستی کی اشاریت کو اپنے شعور کی حدوں تک محدود نہیں کر سکتا۔ اس کا مقابلہ ہیوسمین کی نظموں میں **La Bas, En Route, A Rebours** سے کیجئے۔ ہیوسمین، جو اپنے دور کا بہترین واقعیت پسند تھا، اپنی شیطنت کو صرف اس وقت دلچسپ بنانے میں کامیاب ہوتا ہے جب وہ اسے سطحی طور پر برتتا ہے اور جب وہ اسے محض اپنے دور کے اظہار کا ذریعہ بناتا ہے (جیسا کہ میں سمجھتا ہوں)، ایسے امور میں اسکی دلچسپی، عیسائیت میں اس کی دلچسپی کی طرح، ایک حقیر چیز ہے۔ ہیوسمین صرف ایک دستاویز پیش کرتا ہے۔ بودلیئر اگر اس مضحکہ خیز شعبدہ بادی میں مصروف بھی ہوتا تو بھی وہ ایسا نہ کرتا۔ حقیقت میں بودلیئر کو بھوتوں، سیاہ گروہ اور رومانی بے دینی سے تعلق نہیں ہے بلکہ اسکے سامنے خیر و شر کا حقیقی مسئلہ ہے۔ یہ وقتی اتحاد سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ وہ الحاد کی رائج الوقت امیجری اور الفاظ استعمال کرتا ہے۔

یسویں صدی کے وسط کا وہ دور (جو بہترین عالم میں تھی)، گوئٹے کے الفاظ میں تیز رفتاری،
وگراموں، پلیٹ فارموں، سائنسی ترقی، انسانیت پسندی اور انقلابات کا دور ہے، جسنے
وئی اصلاح نہیں کی بلکہ تیزی سے ترقی معکوس کی طرف لے گیا۔ بودلیئر نے دیکھ لیا کہ جو
یزیں حقیقتاً اہم ہیں وہ گناہ اور نجات ہیں۔ یہ اس کی دیانت داری کا ثبوت ہے کہ وہ
س طرف اتنا ہی بڑھا جتنا وہ ایمان داری کے ساتھ بڑھ سکتا تھا۔ اس سے زیادہ نہیں۔
یک ایسے شخص کے لئے جو مابعدِ والتیئر (وہ والتیئر جو نوکروں کا راہبر تھا) کے فرانس کا مشاہدہ
ر رہا ہے۔ ایک ایسے شخص کے لئے جس نے نیپولین حقیر کی دنیا کو بمقابلہ وکٹر ہیوگو کے زمانے کے
یادہ واضح طور پر دیکھا ہے، ایک ایسے شخص کے لئے جو اسی کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے
Saint Sulpicerie سے کوئی نسبت نہیں رکھتا گناہ کی حقیقت
یک "نئی زندگی" کی معرفت ہے اور مردود ہونے کا امکان انتخابی اصلاح، استصواب رائے
بنی اصلاح دلباس کی اصلاح کی دنیا میں ایک ایسی زبردست تسکین کا باعث ہے کہ مردود
ونا بذاتِ خود نجات کا ایک فوری طریقہ معلوم ہوتا ہے ـــ جدید زندگی کی بیزاری سے نجات
ا کیونکہ آخرکار یہ زندگی میں کچھ نہ کچھ معنی ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہی وہ چیز
ے جسکے اظہار کی بودلیئر کوشش کر رہا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اسے شیلی اور بائرن کی جدید
پسند پروٹیسٹن ازم سے ممتاز کر دیتی ہے۔ سوئن برن کے معنی میں یہ بظاہر گناہ ہے لیکن عیسائیت
کے دائمی نظریۂ گناہ کے معنی میں یہ ایک حقیقی گناہ ہے اور یہی وہ تصور ہے جو بودلیئر کے ذہن
پر حاوی رہتا ہے۔

تاہم، جیسا کہ میں نے کہا، شر کا تصور خیر کے تصور میں پوشیدہ ہے یہاں بھی (جیسا
کہ بودلیئر بظاہر الجھا دیتا ہے اور شاید وہ ضرور الجھا دیتا ہے) بدی کو بدی کی نمائشی علامتوں سے
الجھا دیتا ہے اور یہ تاثر دیتا ہے کہ بودلیئر کو نیکی کے تصور پر پختہ یقین نہیں ہے۔ اسکے ہاں
محبت کا رومانی تصور کبھی پورے طور پر غائب نہیں ہوتا، لیکن وہ کبھی پورے طور پر اس کے
سامنے ہتھیار بھی نہیں ڈالتا۔ La Balcon میں، جسے ایم دلیری بودلیئر کی خوبصورت ترین
نظم شمار کرتا ہے، اور میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک ہے، سارا رومانوی خیال موجود ہے لیکن اسکے

علاوہ کچھ اور بھی ہے یعنی کسی ایسی چیز کی طرف بڑھنا جو ذاتی رشتوں کے اندر نہیں پائی جا سکتی لیکن جو ایک حد تک ان رشتوں کی بدولت، جزوی طور پر ظہور میں آسکتی ہے۔ درحقیقت بیشتر رومانی شاعری کی یاسیت اس وجہ سے ہے کہ انسانی رشتے انسانی خواہشات کے لئے کافی نہیں ہیں۔ لیکن یہ یاسیت بمقابلہ ان خواہشات کے، جو انسانی ہونے کے باعث، ان کو آسودہ کرنے میں ناکام رہتی ہیں بلند تر مقصد سے وابستہ انسانی خواہشات پر بے اعتقادی کی وجہ سے ہے۔ انسانی ہستی کی ناخوشگوار ضروریات میں سے ایک یہ ہے کہ ہمیں خود ہی چیزوں کو تلاش کرنا پڑتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو دانتے کا بیان، کم ازکم شاعروں کے لئے ناقابلِ قبول ہوتا۔ بودلیئر کے ہاں ساری رومانوی غم انگیزی ملتی ہے لیکن وہ ایک نئے قسم کی رومانوی مُہرک ایجاد کرتا ہے ــــــ فرار کی شاعری اور غلاظت پسندی کی شاعری اس کی اسی مہرک کا ایک حصہ ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے ایک خوبصورت پیراگراف میں جس کی سرخی "میرا دل ننگا کر کے رکھ دیا" ہے وہ تصور کرتا ہے کہ جہاز یہ کہہ رہے ہیں کہ "ہم سے کب یہ خوشی اور سکون چھین لیا جائے گا؟" اور اس کا چھوٹا جانشین لافورگ استعجاب سے یوں کہتا ہے "جتنے وہ حسین ہیں اتنے ہی وہ جھٹلا دیئے جاتے ہیں۔" فراریت کی شاعری جو معاصر فرانس میں ویلیری لاربان کے شاعر اے۔ او بارنابوتھ کی نظموں کی مرہونِ منت ہے بنیادی طور پر اس میں بودلیئر کے اس پیراگراف کو سامنے رکھتے ہوئے، روحانی مسرت کے رجحان کا ایک مبہم اقرار ملتا ہے۔

لیکن فطری کو روحانی سے، وحشی کو انسانی سے اور انسانی کو مافوق الفطرت سے ہم آہنگ کرنے میں بودلیئر دانتے کے مقابلہ میں نااہل معلوم ہوتا ہے۔ بہتر سے بہتر اور بڑی حد تک جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ جانتا تھا وہ اسنے خود ہی تلاش کیا۔ اپنی تصنیف Journaux Intimes میں اور خصوصاً "میرا دل ننگا کر کے رکھ دیا" والے حصہ میں وہ بہت کچھ عورت اور مرد کی محبت کے بارے میں کہتا ہے۔ ایک مثل جو خاص اہمیت رکھتی ہے یہ ہے: "محبت کے انوکھے اور اعلےٰ ترین جذبات کا مزا بدی کے یقین سے آتا ہے۔" میرے خیال میں اس کا مطلب یہ ہے کہ بودلیئر نے سمجھ لیا تھا کہ جو چیز مرد اور عورت کے رشتوں اور جانوروں کی مجامعت میں امتیاز پیدا کرتی ہے وہ خیر و شر، نیکی و بدی کا ادراک ہے (اخلاقی

اور بدی کا ادراک جو فطری نیکی اور بدی یا پیورٹین صحیح اور غلط سے مختلف چیز ہے) نیکی کا مبہم اور نامکمل رومانوی تصور رکھتے ہوئے وہ اس بات کو سمجھنے کی اہلیت ضرور رکھتا تھا کہ جنسی فعل، بدی کی حیثیت سے، جدید دنیا کی فطری، حیات آفریں، زندہ دل مشین کے مقابلہ میں زیادہ باوقار اور کم بیزار کن ہے۔ کیونکہ بودلیئر کے لئے جنسی فعل کم از کم ایسی چیز ضرور ہے جو منک سلیمانی سے ہرگز مماثل نہیں ہے۔

جب تک ہم انسان ہیں ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ یا تو شر ہوگا یا خیر۔ اور جب تک ہم اپنے عمل سے خیر و شر کو جنم دیتے رہتے ہیں ہم انسان رہتے ہیں اور یہ بہتر ہے کہ ہم شر کو جنم دیں بجائے اسکے کچھ نہ کریں۔ اس سے اس بات کا تو پتہ چلتا ہے کہ ہم زندہ ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ انسان کی عظمت نجات حاصل کرنے کی صلاحیت میں پوشیدہ ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس کی عظمت اس کے مردود ہونے کی صلاحیت میں بھی پوشیدہ ہے۔ بدترین بات جو ہم اپنے مجرموں ـــــ مدبّروں سے لے کر چوروں تک ـــــ کے بارے میں کہہ سکتے ہیں یہ ہے کہ وہ اتنے آدمی بھی نہیں ہیں کہ انہیں مردود ہی قرار دیا جا سکے۔ بودلیئر اتنا آدمی ضرور تھا کہ اسے مردود قرار دیا جا سکے۔ آیا وہ مردود ہے بھی یہ بالکل دوسرا مسئلہ ہے اور دعائے مغفرت کے لئے ہمیں کون روک سکتا ہے۔ دوسرے آدمیوں کے ساتھ اپنے سارے شرمناک بیوپاریں، وہ اپنے بلند مرتبہ پیشہ کو انجام دیتے ہوئے، بے خوف و خطر گذر گیا اور وہ اس پھٹکار کا مستحق تھا جس کے دروازے سیاست دانوں اور پیرس کے اخبار کے مدیروں پر بند تھے۔

(۳)

بودلیئر کا روحانی مسرت کا تصور یقیناً پھیکی سیٹی بے مزہ گفتگو سی معلوم ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنی ایک خوبصورت ترین نظم 'ایک سفر کی دعوت' میں وہ بمشکل فرار کی شاعری سے تجاوز کرتا ہے اور چونکہ اس کی بصیرت یہاں بہت محدود ہے اس لئے اسے انسانی محبت اور خدائی محبت کے درمیان ایک خلا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ہاں انسانی محبت متعین اور مثبت

ہے اور خدا کی محبت مبہم اور غیر یقینی ہے۔ اسی لئے وہ محبت کی بدی پر اصرار کرتا ہے اور اسی لئے وہ عورت ذات کو مسلسل سخت سست کہتا ہے۔ اس بات میں نفسیاتی اور مریضانہ اسباب کی تلاش کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ یہ تلاش یقیناً بے محل اور مہمل ہے۔ کیونکہ عورت کے بارے میں اس کا رویہ اُس نقطۂ نظر کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہے جس تک وہ پہنچا تھا اگر وہ عورت ہوتا تو بلاشبہ مردوں کے بارے میں بھی اسی کے یہی خیالات ہوتے۔ اسے اس بات کا شعور تھا کہ عورت کو کسی حد تک ایک 'علامت' ہونا چاہئے۔ لیکن وہ اپنے تجربے کو اپنی عملی ضروریات سے ہم آہنگ نہیں کر سکا تھا۔ جہاں تک مرد اور عورت کے رشتے کا تعلق ہے دیٹا نووا اور طربیۂ خداوندی[1] Journaux Intimes کی تکمیل اور تصحیح کا درجہ رکھتی ہیں۔ لیکن ___ میں اس بات پر زیادہ زور نہیں دے سکتا ___ بودلیئر کا نظریۂ زندگی جیسا کہ وہ ہے، خارجی طور پر قابلِ فہم ہے یعنی بودلیئر کی عجیب و غریب انوکھی صفات اسکے نظریۂ زندگی کو جزوی طور پر واضح تو کر سکتی ہیں لیکن اس کی تاویل نہیں کر سکتیں اور یہ نظریۂ زندگی ایسا ہے جس میں شان و شوکت اور دبدبہ بھی ہے اور جس سے مردانگی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ یہ چیز اس کے زمانے اور ہمارے اپنے زمانے کے لئے ایک مقدس پیغام کا درجہ رکھتی ہے۔ اسنے لکھا ہے کہ "سچی تہذیب نہ گیس کی ایجاد میں ہے نہ بھاپ میں ہے۔ نہ گھومتے ہوئے اشتہاروں میں۔ یہ تہذیب گناہِ اول کے نقوش مٹانے میں ہے۔" یہ بات پورے طور پر واضح نہیں ہے کہ یہاں 'مٹانے' کے کیا معنی ہیں لیکن اس کا رجحان فکر واضح ہے اور اس کا پیغام صرف چند منتخب لوگوں کے لئے ہی قابل قبول ہے۔ نصف صدی سے کچھ عرصہ بعد ٹی۔ ای ہیوم نے ایک پیراگراف تحریر کیا جسے بودلیئر یقیناً پسند کرتا:

> "ان مطلق اقدار کی روشنی میں خود انسان کے بارے میں
> یہ کہا جاتا ہے کہ وہ محدود اور نامکمل ہے۔ وہ ازلی گناہ سے
> معمور ہے لیکن گاہ گاہ وہ ایسے کارنامے ضرور انجام دیتا ہے

---

[1] دانتے کی نظمیں

جو اسے کاملیت عطا کرتے ہیں لیکن وہ خود کبھی کامل نہیں ہو سکتا۔
معاشرہ میں عام انسانی عمل کے تعلق سے کچھ ثانوی نتائج اس سے
ضرور پیدا ہوتے ہیں لیکن انسان بنیادی طور پر 'بد' ہے۔ وہ
کوئی قابلِ قدر کارنامہ صرف اخلاقی و سیاسی نظام عمل کے ذریعہ
ہی انجام دے سکتا ہے۔ اس طرح کوئی بھی نظامِ عمل صرف منفی
نہیں ہوتا بلکہ وہ تخلیقی اور نجات دہندہ بھی ہوتا ہے۔ ادارے[1]
ازبس ضروری ہیں۔"

سنہ ۱۹۳۰ء

---

[1] ایلیٹ ایک اور جگہ کہتا ہے۔
"Institutions are necessary because men are evil"

ادب اور عصرِ جدید

لوگ اپنے زمانے سے بہت زیادہ واقف ہوئے بغیر بھی اس کا شعور رکھ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم میں سے زیادہ تر لوگ تاریخ کے ایک قسم کے جبری تصور سے متاثر ہیں۔ اور یہ اثر ہمارے اپنے اندازے سے کہیں زیادہ ہے۔ مارکسیوں کے بارے میں تو یہ بات ٹھیک ہو سکتی ہے اس لئے کہ ان کے پاس ایک مدلل نظریہ ہے لیکن غیر شعوری مفروضہ کے طور پر یہ بھی بے فائدہ ہے۔ یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ ترقی کے ناگزیر ہونے کا مفروضہ اپنی انیسویں صدی والی شکل میں اب مسترد ہو چکا ہے اور اب لے دے کر **Dean Inge** جیسے مقبول فلسفیوں کا مطمح نظر بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت، جو کچھ ہم نے مسترد کیا ہے، وہ ترقی کے اسی نظریہ کی ایک خاص قسم ہے جو ڈارون، ٹینی سن، آزاد تجارت اور گذشتہ صدی کے آخری حصہ کی صنعتی ترقی کے ساتھ وابستہ ہے۔ مختصراً جسے آپ حریت پسندی (لبرل ازم) کا نام دیتے ہیں۔ ہمارے عقائد واضح طور پر متزلزل ہو چکے ہیں: مثال کے طور پر اب کوئی بھی شخص سائنسی ایجاد کے خودکار فائدہ پر ایمان نہیں رکھتا۔ ممکن ہے ایجاد سے بجائے تخلیقی سرگرمیوں کے تخریب کا کام لیا جائے۔ یہ لوگوں کو بے روزگار کر دے۔ پیداوار تو بڑھا دے لیکن صرف کو کم کر دے: یہ عام سی باتیں ہیں۔ لیکن اسکے باوجود ہم ترقی کے نظریہ پر بنیادی طور پر ایمان ضرور رکھتے ہیں۔ گویا 'حال' پر ہمارا ایمان نہیں رہا ہے۔

مستقبل پر ایمان رکھنے کے نظریہ کو، ابتدائی شکل میں مقبول بنانے میں، میرا خیال ہے، ایچ جی۔ ویلز کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس کے سطحی فلسفہ کا اثر بہت وسیع تھا۔ مسٹر ویلز واضح طور پر اس کی تردید میں جو کچھ بھی کہیں میرا خیال ہے کہ ان کی تحریروں کا اثر کچھ اس

م کا ہے کہ حال کی قدر و قیمت صرف و محض مستقبل کی خدمت میں مضمر ہے اور اخلاقیات
ار و مدار، آئندہ آنے والی نسلوں کی "خوشی" پر ہے (خوشی بھی نمایاں طور پر روحانی قسم
ہیں) اور یہ کہ خوشی کا احساس ہمیں سائنٹیفک کاموں سے حاصل ہو سکتا ہے جس سے مستقبل
انسانیت کو فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔ رہے دوسرے تو ان کے لئے زندگی بس سے کوئی
چیز کام میں لائی جا سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا میری بات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے اس
یہ کہتا چلوں کہ یہ نہیں ہے کہ ہمیں مستقبل کی نسلوں سے کسی قسم کا سروکار نہیں رکھنا چاہئے۔
و ہمارا فرض منصبی ہے۔ مجھے تو اعتراض اقدار کے مکمل طور پر اپنی جگہ سے ہٹ جانے پر ہے۔
رف یہی ضروری نہیں ہے کہ ہم مستقبل ہی کے لئے سب کچھ کرتے رہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ
اپنا بھی اتنا ہی خیال رکھیں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہم بحیثیت انسان فرداً فرداً اتنے ہی
ل قدر ہیں جتنا خود مستقبل کا انسان۔ مسٹر ویلز نظریۂ ارتقا کے حیرت انگیز و بے جا انکسار
بلیغ کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو حیثیت بے دُمے بندروں کی ہماری نظر
ہے وہی حیثیت مستقبل کے انسان کی نظر میں ہماری ہے اور جیسی عزت ہمارے اپنے حیوانی
راد (خواہ وہ بے دمے بندر ہوں یا لیمور[1] اور اپوسم[2]) کی ہماری نظر میں ہے ویسی ہی عزت مستقبل
انسان ہماری کرے۔ یہ دراصل دائمی ارتقا کے سیدھے سادے عقیدہ کا ایک بالکل فطری
یہ ہے جو انسان اور حیوان کے درمیان واضح حد فاصل قائم کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس
ح انسانی روح کی نفی بھی کرتا ہے۔

اب اس کا ایک اثر تو یہ ہے جیسا کہ ہم آج کل دیکھتے ہیں، کہ انسانیت سے نفرت
جذبہ کا جواز تلاش کیا جائے اور ساتھ ساتھ ہر قسم کے ذرائع کا اقرار، (خواہ انسانی وقار
اس کی کتنی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے) جو اس قسم کے مستقبل کو وجود میں لائے جس کا
نقشہ مسٹر ویلز انتہائی سرخوشی کے عالم میں پیش کرتے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس سے

---

[1] لیمور مڈگاسکر کا بندر کی قسم کا ایک دودھ پلانے والا شب رو جانور۔ [2] اپوسم۔ ایک قسم کا تھیلی دار
دودھ پلانے والا جانور جو پانی میں یا درختوں میں رہتا ہے اسکے پچھلے پیروں میں انگوٹھا بھی ہوتا ہے۔

متفق نہیں ہو سکتا کہ آخر ہم کیوں انسان کی ایک ایسی نسل پیدا کرنے کے لئے خود اسقدر تکلیف برداشت کریں جو ہزار سال بعد ہمیں بے ڈھبے بندر، لیمور، اور اپوسم سمجھ کر نفرت کی نظر سے دیکھے۔ مجھے تو یہ ایک لغو سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ مستقبل کی اہمیت حال کی اہمیت سے ہرگز زیادہ نہیں ہے۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ ہمیں عارضی اقدار کے برخلاف ابدی اقدار پر ایمان رکھنا چاہیئے ــــ ایسی ابدی اقدار جو ماضی میں بھی حاصل ہوئی ہیں اور حال میں بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اور یہ ہمارا فرض ہے کہ ایک ایسے مستقبل کو وجود میں لانے کی کوشش کریں جہاں ان اقدار کے حصول میں عام انسانیت کے لئے، جیسا کہ آج کل ہے، کم سے کم مشکلات ہوں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ مشکلات کچھ ٹھوس قسم کی نہیں ہیں یہ تو خود ہمارے اپنے اندر موجود ہیں۔ ممکن ہے ایسے میں ہمارا اپنا روّیہ، مسٹر ویلز کے مقابلے میں، کچھ زیادہ حوصلہ مندانہ نظر نہ آرہا ہو لیکن یہ زیادہ واضح ضرور ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ان بیچارے والدین کا ہوتا ہے جو چاہتے ہیں کہ ان کے بچہ کو زندگی میں ان سے بہتر مواقع میسر آئیں اور وہ ان سے بہتر زندگی بسر کرے۔

میں نے شروع ہی میں اس بات کا اظہار کر دیا تھا کہ یہ جدید مسئلہ معاد[۱] امید کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور نا امیدی پر ختم ہوتا ہے۔ لیکن یہ کہہ کر میں کوئی ایسا اخلاقی نتیجہ اخذ نہیں کر رہا ہوں جو ایسے صاحب حیثیت اخذ کرتے ہیں جن کا خرمن بھرا ہوا ہے صریحاً ہم ایک دور کے اختتام پر کھڑے ہیں۔ بدنظمی اور زوال کے احساس سے چُور ہیں اور ساتھ ساتھ اس تبدیلی سے خوف زدہ بھی جو آنے والی ہے۔ چونکہ کچھ نہ کچھ تبدیلی تو آخر ہونی ہی چاہیئے۔ اور چونکہ ہمارے ذہنوں کو مستقبل کے تصور سے معمور رکھنے کی ضرورت کا احساس ہونا ہی چاہیئے ــــ ایسے تصورات سے جو ہمارے آنے والے کل کے عمل کو شاید متاثر کریں اور خصوصاً جبکہ ہمارا ضمیر اس احساس سے کہ جو ہمیں اپنے بارے میں ہے اور جو کچھ ہمارے اندر ہے، 'مجروح ہے' ایسے میں یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے اوسان قائم رکھیں اور احساس اقدار پر جمے رہیں۔ اس

---

۱ Eschatology

سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم ان چیزوں کو مضبوطی سے پکڑے رہیں کہ جو تھیں، جو ہیں اور جو ہوں گی ـــــ اس دنیا کا کوئی اختتام نہیں ہے۔

بہرحال میرا فوری کام تو یہ ہے کہ یہ دیکھوں کہ حال کو مستقبل کی اخلاقی غلامی میں دیدینے اور اقدار کے متزلزل ہو جانے سے جدید ادب پر کیا اثر پڑا ہے۔ ایک مشیر کی حیثیت میں اور ساتھ ساتھ ایک باصلاحیت منتظم کی طرح مجھے اس پر بھی اچھی طرح نظر رکھنی چاہیئے کہ جو کسی شکل میں مجھ سے کم عمر ادیب لکھ رہے ہیں۔ بہتر لکھنے والوں میں ایک قسم کا سماجی احساس اور یہ احساس کہ ادب کو سماج کے لئے مفید ہونا چاہیئے مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ گیا ہے۔ کمتر درجہ کے لکھنے والوں میں یہی احساس ایک عزم کی شکل اختیار کر گیا ہے کہ کہیں ریل نہ چھوٹ جائے۔ لیکن میں اعتماد کے ساتھ اس بات کا یقین دلا سکتا ہوں کہ ان لوگوں میں بھی خلوص کا مناسب تناسب موجود ہے۔ لیکن سماجی بہبود کے اس جذبہ میں بھی اقدار کے متزلزل ہو جانے کا عمل اسی طرح موجود ہے جس طرح مستقبل کی خدمت کے جذبہ میں موجود تھا اور میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں کسی نتیجہ پر پہنچ جاؤں کہ آج کے شاعر کا اس کی ذات اور سماج سے کیا صحیح رشتہ ہے یہ درست ہے کہ یہ حسنِ ظن ناگزیر ہے۔ لیکن (اصل مسئلہ یہ ہے) کہ اسے مستقل اقدار سے کیسے ہم آہنگ کیا جائے جن کا حصول ادب کا مقصد ہے۔

ہم اب اصل موضوع کی طرف آئے ہیں۔ کیا ایک ادبی فنکار کو سماجی ذمہ داریوں کا شدید احساس اس حد تک ہونا چاہیئے کہ وہ ادب کے ذریعہ ایک پیغام پہنچانے پر مجبور ہو جائے؟ اگر ایسا ہے تو یہ "پیغام" فن کے لئے کب مفید ہے اور کب مضر؟

میرا خیال ہے کہ اس دور کے اہلِ قلم کو اس کا شعور تو ہونا ہی چاہیئے۔ لیکن فنکار کیلئے بڑا خطرہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ وہ وہ کچھ محسوس کرنے کی کوشش کرے جو در اصل وہ محسوس ہی نہیں کرتا۔ اب میں یہاں یہ نتائج اخذ کرنے کی کوشش کروں گا: جو بات حسن ہے وہ فنکار کے انفرادی، ذیلی انفرادی، جذبوں کے درمیان اور سماجی خیالات اور احساسات کے درمیان جن کی وہ تبلیغ کرنا چاہتا ہے، ہم آہنگی ہے۔ اس ہم آہنگی میں وہ نہ تو اپنے نظریہ کو اپنی شخصیت کے آلہ کار کے طور پر استعمال کرتا ہے اور نہ وہ اپنی شخصیت کو سماجی نظریئے کے مطابق ڈھالنے

کی کوشش میں کچلنا یا مسخ کرتا ہے۔ یہ بات ذرا سی وضاحت چاہتی ہے۔
ایک آدمی ایک فرد بھی ہے اور ساتھ ساتھ رکن بھی۔ "فرد" کے بجائے میں "شخص" کا لفظ استعمال کروں گا۔ اس کی 'شخصیت' اصل چیز ہے اور اسے مجروح نہیں کرنا چاہئے لیکن ساتھ ساتھ وہ سماج کا ایک 'رکن' بننے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ جب سماج کو صرف و محض افراد کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے تو اسی کے ساتھ آزاد خیال جمہوریت کا انتشار بھی جنم لیتا ہے۔ جب شخص سماج کا قطعی طور پر ماتحت ہو جاتا ہے تو اسی کے ساتھ فاشزم یا کمیونزم کا انسانیت سے محروم کرنے کا عمل بھی پیدا ہوتا ہے۔ یہ دو انتہائیں بہر حال مل سکتی ہیں۔ کیونکہ آزاد خیال جمہوریت فی الحقیقت جو کچھ تسلیم کرتی ہے وہ دراصل "اشخاص" کا نہیں بلکہ "افراد" کا مجموعہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اشخاص کی رنگا رنگی اور اصلیت کو تسلیم نہیں کرتی بلکہ اسے پرانے فیشن کا مادی فرد قرار دیتی ہے یا ڈیموقریطوسی انداز کا ایک جزو قلیل۔ اور "یہ شخص" کی تذلیل ہے۔ کیونکہ کوئی شخص بھی شخص نہیں رہتا اگر وہ پورے طور پر فرقہ سے الگ ہو جائے۔ اور کوئی فرقہ فرقہ نہیں رہتا اگر وہ اشخاص کا مجموعہ نہیں ہے۔ آدمی بھی آدمی نہیں رہتا تا وقتیکہ وہ رکن نہ ہو اور وہ ایک رکن بھی نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ وہ الگ اپنا وجود نہ رکھتا ہو۔ آدمی کی رکنیت اور اس کی تنہائی ساتھ ساتھ چلنی چاہئیں۔ ایسے لمحے بھی آتے ہیں، شاید جس کا علم ہر ایک کو نہ ہو، جب آدمی اپنی تنہائی کی وحشت ناک آگاہی سے پس کر سب سے منقطع ہو جائے۔ مجھے ایسے میں واقعی رحم آتا ہے جب وہ اس طرح اپنے تک اور اپنی ذلت و بے مائگی تک محدود ہو کر اکیلا رہ جائے ـــــ اکیلا بغیر خدا کے۔ ایسے ہی لمحوں کے بعد، خدا کے ساتھ اکیلے اور اپنی اس اہلیت سے آگاہ، جو لعنت کے سوا کچھ نہیں ہے، ہم انتہائی تشکر و توصیف کے ساتھ اپنی رکنیت سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ ہماری توصیف و شکر گزاری اس وقت تک بے معنی ہے جب تک ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں 'گرجا' اسے تسلیم کر چکا ہے اور اس توازن کو صرف گرجا ہی نے برقرار رکھا ہے۔ گو اس بات کو تسلیم نہیں کیا جاتا لیکن یہ سیاسی رجحان کے ختم نہ ہونے والے اونچ نیچ کے کھیل سے ظاہر ہو جاتا ہے جو کبھی انارکی اور کبھی تشدد کی شکل میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا کھیل ہے جو، میرا خیال ہے، 'لادینی دنیا

میں کبھی ختم نہیں ہوتا۔

ممکن ہے یہ باتیں خارج از بحث معلوم ہو رہی ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہی توازن اپنی سطح پر، فنکار کی سرگرمیوں میں موجود رہنا چاہیئے۔ کیونکہ فنکار اس وقت تک خلوص نیت کے ساتھ اپنے مقصد سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جب تک (توازن کے اس عمل سے) اس کا وجود بن سنور نہ رہا ہو اور اس کی تکوین نہ رہی ہو۔ فن کار اپنی ذات کے بارے میں لکھتے ہوئے بھی، جیسا کہ ریمی دی گارماں نے کہا ہے، اپنے زمانے کے بارے میں لکھتا ہے۔ لیکن اس مقولہ میں اگر ہم اس بات کا اضافہ اور کرلیں کہ بعض مرتبہ اپنے زمانے کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ اپنی ذات کے بارے میں بھی لکھ جاتا ہے تو یہ بھی ایک ہی بات ہوگی۔ لیکن اسے (یہ سب کچھ) اپنی ذات سے ہی شروع کرنا چاہیئے۔ بعض اوقات چیزوں کو انتہائی شکل میں پیش کرنا بھی معاون ثابت ہوتا ہے اور اسی لئے یہ ایک خطرناک طریقہ (بھی) ہے۔ مجھے اب یہ کہنا ہے کہ ایک طرح سے ایک سچا فنکار آرٹ پیدا کرنے کی غرض سے خالصاً ان چیزوں کو بھی اپنے 'تصرف' میں لے آتا ہے جن پر وہ ایمان رکھتا ہے لیکن اگر وہ یہی کام 'شعوری طور پر' کر رہا ہے تو وہ ایک جھوٹا فنکار ہے۔

جب کہ ڈی۔ ایچ۔ لارنس جیسا فنکار اپنے فلسفہ کو اپنی نجی خواہشات کے مطابق ڈھالنے اور اپنی کمزوریوں کا جواز پیش کرنے کا خطرہ مول لیتا ہے تو ایک خارجی عقیدہ کا پیروکار اپنی ذات کو اپنے عقیدہ کے مطابق ڈھالنے کی غرض سے اسے مسخ کرنے اور اس کی نفی کرنے کا خطرہ مول لیتا ہے اور اس طرح متضاد ریاکاری ممکن ہو جاتی ہے۔ یہی خطرہ عیسائی کے لئے ہے۔ اور یہی کمیونسٹ کے لئے اور خاص طور پر ایسے لمحوں میں جب (اس کی اپنی) تخلیقی آنچ ناکارہ ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے عقیدہ کو اپنی ذات سے یا اپنی ذات کو اپنے عقیدہ سے مماثل کرنے کے لئے کہاں تک جا سکتا ہے؟ یا تو اس شخص کی نشو ونما بری طرح متاثر ہو جائے۔ یا پھر اس عقیدہ کی پاکیزگی ہی آلودہ ہو جائے۔ میرے خیال میں اگر ایک عیسائی اپنے مذہب کو سمجھتا ہے تو اس کے پاس ایسے تحفظات ہوتے ہیں جن سے ایک سماجی انقلاب پسند محروم ہوتا ہے۔ میرا مطلب شخصی جذبات کے تحفظات سے ہے۔ مثال کے طور پر صرف سماجی جوش وخروش، خواہ وہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، شاعری کی تخلیق کے لئے مواد فراہم نہیں کر سکتا۔ آخر

دانتے کی شاعری میں، جب وہ اپنے زمانے کی خرابیوں پر ملامت کرتا ہے اور شیلے کی شاعری میں، جب وہ بادشاہوں، جابروں اور پادریوں پر ملامت کرتا ہے کیا فرق ہے؟ شیلی کا جوش وخروش اس کے اپنے دماغ کا حصہ ہے۔ اور اسی لئے وہ ایسی آوازیں نکالتا ہے بلکہ خواہ مخواہ متوجہ کرنے والی ایسی آوازیں پیدا کرتا ہے جو ذہن کی ناموزوں آوازوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ برخلاف اسکے دانتے اپنے دکھوں اور اپنی تکلیفوں کو خود اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ معین رنجشیں اور معین ذلتیں، جو اس نے مخصوص لوگوں کے ہاتھوں اٹھائی ہیں اور جنکا اسے شدت سے احساس ہے وہ ذاتی کینے، وہ ذاتی عناد اور محرومیاں، جنہیں آپ مادی کہہ لیجئے، لیکن اصل میں حقیقی۔ اور یہی بنیادی بات ہے۔ صرف عظیم ترین یہودی پیغمبر ہی اس سے مبرّا ہو سکتے ہیں اور خدا کی رضا وہدایت پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ عام انسانی شاعروں میں ذاتی "نقصان، ذاتی کینہ وعناد اور تلخیاں اور تنہائی کا احساس تو موجود رہنا ہی چاہئے۔ حتیٰ کہ جب شاعر اپنے ذاتی احساس کے سوا نہ کسی اور چیز سے آگاہ ہوا اور نہ دلچسپی رکھتا ہو تو یہی چیزیں، اتنی شدت کے باعث، ایک نمائندہ قدر وقیمت کی حامل ہو جاتی ہیں تاکہ ہم دی یو کی طرح[۱]، اسکے نقطۂ نظر سے غور کر سکیں۔ اس طرح نہیں کہ وہ اپنے ذاتی دکھوں میں دب کر رہ جائے بلکہ انہیں نمایاں کرتے ہوئے، بغیر کچھ چھپائے۔ خدا سے پرجوش طلب کے ساتھ۔ اور بالآخر یہ کوئی دوسرا کبھی تو نہیں سکتا۔ لیکن عظیم ترین شاعروں میں یہی نجی جذبات، معروضی اخلاقی اقدار کے پرجوش اعتقاد اور انسانوں کے درمیان انصاف کی جستجو اور روح کی زندگی کی تلاش کے ساتھ مل کر مکمل ہو جاتے ہیں۔

اب لادینی انقلاب کا رجحان شخص کی قدر وقیمت کو کم کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایسے میں فوراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک ایسی دنیا میں جہاں عام طور پہ ناانصافی اور تشدد پھیلا ہوا ہے شخصی احساس اور نجی دکھوں کا اظہار ایسی کونسی اہمیت رکھتا ہے؟ اور یہی لادینی نقطۂ نظر (جس کے معنی یہ ہوئے) کہ ایک آدمی کی کیا اہمیت ہے جب سارے سماج کی جان جوکھوں میں

---

[۱] قرونِ وسطیٰ کے آخری دور کا فرانسیسی شاعر جسے انیسویں صدی کے رومانوی شعراء اور ناو
نگاروں نے حد درجہ شہرت دی۔

پڑی ہو۔ یہ بات کہہ کر ہم جدید مسئلہ معاد کی طرف لوٹ آئے ہیں جس کے مقبول مبلغ مسٹر ویلز ہیں۔ کچھ تو یہ کہتے ہیں کہ موجودہ نظام ہی ناقص و ناکارہ ہے۔ جتنی تسکین ہم حاصل کر سکتے ہیں ہمیں حاصل کر لینی چاہئے۔ کچھ کہتے ہیں کہ موجودہ نظام ناقص و ناکارہ ہے مستقبل کی خاطر ہمیں قربانی دینی چاہئے۔ اپنی مسرتوں کی نہیں بلکہ اپنے آپ کی، خود کی۔ عین ممکن ہے کہ کوئی ان دونوں نتائج ہی کو فوراً تسلیم کر لے۔ اس کے پیچھے وہ زبردست تصور کام کر رہا ہے جو بغیر کسی مزاحمت کے ہمارے اپنے زمانے میں جاری و ساری ہے اور جو بدعت کی شکل میں ہمیشہ ہماری تاک میں رہا ہے ـــــ یعنی "جماعتی شعور" کا تصور۔ جو اس نام کے ساتھ یقیناً صحیح، معقول اور سائنٹفک معلوم ہوتا ہے۔

"اصل مسئلہ" کے عنوان سے اپنے ایک حالیہ مضمون میں، جسے میں نے دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور پسند کیا ہے، کرسٹوفر ڈوسن نے چند معقول باتیں غیر طبقاتی سماج میں فرد کی حیثیت کے بارے میں کہی ہیں:

> "کٹر کمیونسٹ اس بات سے انکار کرے گا کہ نظام مملکت کی خاطر انسانیت کی مکمل اطاعت و ایثار کمیونزم کا بنیادی تصور ہے۔ کیونکہ مارکس اور لینن واضح طور پر یہ بتلاتے ہیں کہ پرولتاریوں کی ڈکٹیٹر شپ ایک عارضی چیز ہے اور مملکت کا وجود بذات خود جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ اور جلد ہی اس کی جگہ غیر طبقاتی اور غیر مملکتی معاشرہ لے لے گا۔ لیکن (سوال یہ ہے) یہ سب کچھ کیسے حاصل ہو گا؟ یہ صرف اسی وقت حاصل ہو سکے گا جب فرد اس حد تک معاشرتی مزاج کا حامل ہو جائے کہ وہ جبلی طور پر اپنی ساری صلاحتیں سماج کے لئے وقف کر دے اور سوائے معاشی نظام کے، جس کا وہ ایک حصہ ہے، باقی ہر مقصد کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دے۔ ایسے نظام میں مملکت کی ضرورت اس سے زیادہ باقی نہیں رہتی جتنی

شہد کی مکھیوں یا چیونٹیوں کے لئے مملکت کی ضرورت ہے۔
لیکن یہ ایک انسانی نظام ہے اور کیا انسانیت کے لئے ممکن
ہے کہ وہ اس سطح تک اٹھ جائے یا اس حد تک ڈوب جائے۔"

میں یہاں ڈوسن کے خیال سے متفق ہوں کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ لیکن میں اگر اسے ممکن نہیں سمجھتا تو مجھے چاہئے کہ اس تصور پر لعن طعن کرنے کی زحمت بھی نہ کروں۔ یہ چیز بے رحم، ترکیب باز فلسفیوں اور سیاست دانوں کی چالاکی سے وجود میں نہیں آئے گی بلکہ یہ تو احساس ذمہ داری اور انسان ہونے کے بوجھ سے بنی نوع انسان کی فطری بیزاری سے پیدا ہوگی۔ کیونکہ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ دو ٹانگ والے جانور کے لئے بڑی مشکل بات ہے کہ وہ سیدھے کھڑے ہونے پر اصرار کرے۔ یہ ایک جسمانی اور اس سے زیادہ ایک اخلاقی بوجھ ہے۔ حرکات و سکنات اور آواز خواہ میکانکی آلات کی مدد سے ہو یا بغیر آلات کی مدد کے، زیادہ تر لوگ اپنے وقت کا بیشتر حصہ انسانی ذمہ داریوں سے بچنے میں صرف کرتے ہیں اور صرف چند لوگوں کے مسلسل ایثار کے طفیل ہی ہم انسان کہلائے جانے کے مستحق رہتے ہیں۔ اور "جماعتی شعور" ــــ وہ بدعت جو آزاد خیالی کی تضادی بدعت کے ساتھ پروان چڑھی ہے، اپنے اندر ایک دلفریب کشش رکھتی ہے کیونکہ یہ ہمیں اپنی ذمہ داریوں کے بوجھ سے سبکدوش ہونے میں مدد دیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ عمل ادنیٰ درجہ کے شعور کی طرف مراجعت ہے نہ کہ بلندی کی طرف ایک قدم۔ درحقیقت یہ اس نظریہ کا طفیل ہے جو ابتدائی نسلِ انسانی کے مطالعہ پر زور دیتا ہے اس نظریہ کے لئے ہم درخیم اور لیوی برحل جیسے مصنفین کے ممنون احسان ہیں۔ جو کچھ میں نے اب تک کہا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانیت کی یہ حالت اور یہ فضا شاعری کے لئے ناسازگار ہے۔ لیکن یہ بات بذاتِ خود بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اور بھی بہت سے مسائل ہیں جو نئی شاعری کی متواتر تخلیق سے کہیں زیادہ اہم ہیں حالانکہ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ لوگ جن کے ہاں نئی چیزوں کی تخلیق بند ہو جاتی ہے وہ 'پرانی' کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ جو بات اہم ہے وہ یہ کہ شاعری کی تخلیق 'شخص' کی حفاظت اور فرد، خدا اور سماج

کے ساتھ اس کے باہمی رشتے پر منحصر ہے۔
آج کی شاعری میں بہت سی آرزوئیں اور امیدیں پنہاں ہیں جن سے مجھے پوری ہمدردی ہے۔ جب ہم آج کی شاعری کا مقابلہ، پچھلی صدی کے آخری حصے یعنی چالیس سال پہلے کی شاعری سے کرتے ہیں تو میرا خیال ہے کہ انفرادی شعراء کی خصوصیات کا مقابلہ کئے بغیر (خواہ وہ مقابلہ ہمارے لئے نقصان دہ ہی ثابت کیوں نہ ہو) ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ سماجی سنجیدہ پن اور بے اطمینانی جس کا اظہار کچھ عرصہ سے شاعری میں ہو رہا ہے، خود ہمارے فائدے میں ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شاعری نے ایک نئی سنجیدگی اور ایک نئی سماجی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ یہ بات شاید غیر اہم نہیں ہے کہ ہمارے عظیم شاعر مسٹر ولیم۔ ڈبلیو بی ییٹس نے جو دونوں ادوار سے تعلق رکھتے ہیں، اپنی اعلیٰ ترین شاعری پچھلے سالوں میں تخلیق کی ہے۔ جن چیزوں کے لئے ہم ان کے احسان مند ہیں وہ اپنی جگہ ہیں لیکن میں ییٹس کو اپنا ہم عصر سمجھتے ہوئے خود کو ایک گونہ مشکل میں پاتا ہوں۔ اور اگر کوئی شخص اس وقت مجھے ییٹس کا ہم عصر سمجھے جب میں اس کی موجودہ عمر کو پہنچوں تو یہ میرے لئے انتہائی ستائش کی بات ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ جو بات ہم سمجھنے سے قاصر رہے ہیں اور جس کے لئے ہم جدوجہد کرتے رہے ہیں یہ ہے کہ شاعری ایک مختصر تعداد کے لوگوں کے لئے، جو اس کا صحیح مذاق رکھتے ہیں، ایک نفیس انبساط نہیں ہے بلکہ وہ کوئی ایسی چیز ہے جس کی سماجی قدر و قیمت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شاعر کو معلم اخلاق کا کردار ادا کرنا چاہئے اور اسی طرح سماج سے اپنے رشتے کو آشکار کرنا چاہئے۔

بہرحال میرے خیال میں سماجی راست بازی کا جذبہ بالآخر بذاتِ خود تسلی بخش ثابت نہیں ہوگا۔ وہ خطرہ جسے میں نے جدید مسئلہ معاد کا نام دیا ہے، عارضی اقدار کے مقابلہ میں دائمی اقدار کو، سماجی کے مقابلہ میں شخصی کو نظر انداز کرنے کا خطرہ وہ خطرہ ہے جس میں شاعر بھی ہر ایک کے ساتھ شریک ہے۔ لیکن اس کی ایک اچھوتی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ ایسے میں دھوکا نہ کھائے۔ تاہم میں آپ سے یہ کہوں گا کہ آپ اس کی مشکلات کے ساتھ کچھ ہمدردی ضرور رکھیں۔ تغیر کے دور اور جنگ کے مسلسل خطرے

کے زمانے میں شاعری کے لئے کچھ ساز گار ماحول نہیں ہوتا۔ ایسے میں تبدیلی کو قبول کرنے
اور اپنے ذہن کو 'عمل' کے امید شکن فلسفہ میں غرق کر دینے کی ترغیب اپنے طور پر موجود
ہوتی ہے۔ ایسے کئی فلسفے ہمارے سامنے پیش کئے جارہے ہیں۔ ماضی سے نفرت حتیٰ کہ عدم تو
مسلسل بڑھ رہی ہے اور بہت سے لوگ لامحدود تجربے کے لئے تیار ہیں۔ ہم ہوشمند
تغیر کو اس وقت تک متاثر نہیں کر سکتے جب تک ہم شاعری کے مستقل اجزا کو اپنی
گرفت میں نہ لے لیں۔ ساتھ ساتھ اس بات کی فہم بھی ضروری ہے کہ کن کن اجزا کو مضبو
سے گرفت میں رکھا جائے اور کن کن اجزار کو ترک کر دیا جائے۔ اس طرح ہم ان تبدیلیو
کو بروئے کار لانے کے لئے بہتر طور پر تیار ہو سکتے ہیں جن کی ضرورت ہے اس طرح
بغیر کسی تاسف کے ہم ماضی کو بھی سمجھ سکتے ہیں اور بغیر کسی خوف کے مستقبل کو بھی۔

(۱۹۳۵ء)

صحافت اور ادب

'صحافت' اور 'ادب' کے درمیان امتیاز بالکل بیکار سی بات ہے تاوقتیکہ ہم ایا
حنت مقابلہ نہ کر رہے ہوں جیسے گبن کی "تاریخ" اور آج شام کے اخبار کے درمیان ہے!
ور یہ مقابلہ بذاتِ خود اس قدر شدید ہے کہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ آپ صحافت اور ادب
کے درمیان کوئی مفید امتیاز صرف ادبی اقدار کی ترازو میں رکھ کر نہیں کر سکتے۔ یہ امتیاز
یک عمدہ تحریر اور ایک انتہائی عمدہ تحریر کے درمیان فرق کرنے سے بھی پیدا نہیں ہوتا۔
یک دوسرے درجے کا ناول صحافت نہیں ہے لیکن یقیناً اسے ادب بھی نہیں کہا جا سکتا۔
صحافت' کی اصطلاح گزشتہ تیس سال میں زوال پذیر ہوئی ہے اور یہ خاص طور پر
ناسب ہے کہ اِس مضمون میں صحافت کے زیادہ مستقل مفہوم کو تازہ کرنے کی کوشش
ی جائے۔ میرے خیال میں اِس اصطلاح کی موزوں ترین اور ساتھ ساتھ وسیع المعنی تعریف
س شخص کے ذہن کی کیفیت و مزاج کو سامنے رکھ کر کی جا سکتی ہے جس کی تحریر کو ہم سب
بہترین' صحافت تسلیم کرتے ہیں۔ ذہن کی ایک قسم ایسی بھی ہے' اور مجھے اس سے پوری
ہمدردی ہے' جو لکھنے یا اپنی بہترین تحریر پیش کرنے کی طرف' کسی فوری واقعہ کے دباؤ کے
زیر اثر ہی مائل ہو سکتا ہے؛ اور ذہن کی یہی وہ قسم ہے جسے میں صحافی کا ذہن سمجھنے کی تجویز
کرتا ہوں۔ بنیادی اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ اس کا سبب حالات حاضرہ سے سرگرم
وابستگی ہو سکتا ہے یا' جیسا کہ میرے ساتھ ہے' اس کا سبب داخلی سکون یا کاہلی ہو سکتا

ہے جسے (حرکت میں لانے کے لئے) فوری محرک کی ضرورت پڑتی ہے۔ یا وہ عادت، جو
اوائل عمری میں جلدی جلدی چھوٹی چھوٹی رقمیں کمانے کی ضرورت سے پیدا ہو جاتی ہے
یہ بات نہیں ہے کہ صحافی دوسرے لکھنے والوں سے مختلف مواد سے استفادہ کرتا ہے
بلکہ وہ ایک مختلف مقصد سے کام کرتا ہے جو اکثر (دوسرے محرکات سے) اہم نہیں بلکہ زیادہ موثر ہوتا
عام طور پر جو بُرائی صحافی کے سر تھوپی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا کام وقتی دلچسپی
کا حامل ہوتا ہے جس کا مقصد فوری طور پر گہرا اثر پیدا کرنا ہوتا ہے اور جس کا مقدر، جب وہ
فوری اثر پیدا ہو جائے، دائمی فراموشی ہے۔ بہر حال صرف اتنا کہہ دینے کے معنی یہ ہیں کہ
ان عوامل کو نظر انداز کر دیا جائے جن کے باعث کوئی تحریر "عارضی" کہی جاسکتی ہے اور
بذات خود اس صفت کے ڈھیلے ڈھالے استعمال کو بھی نظر انداز کر دیا جائے اور
ساتھ ساتھ اس عجیب اتفاق کو بھی جو کسی تحریر کو فراموشی سے بچا لیتا ہے۔ وہ لوگ
جو جوناتھن سوئفٹ کی زبردست قوّتِ کشش سے شدید طور پر متاثر ہیں اور دی ڈریپیرس لیٹرز
(The Drapier's Letters) کو سحر انگیز مسرت کے ساتھ بار بار پڑھتے،
بھول جاتے ہیں کہ یہ خطوط، صحافت کی میری اپنی تعریف کے مطابق جس کی طرف میں
اشارہ کیا ہے، صحافت ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ لیکن دی ڈریپیرس لیٹرز اب انگریزی
مکاتیب میں اتنی اہمیت کی چیز ہیں اور ہر اس شخص کے لئے، جو انگلستان کے ادب میں رہنا
رکھنا چاہتا ہے، اتنے ضروری ہیں کہ ہم اس اتفاق کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے
بھی ہم انہیں پڑھتے ہیں۔ اگر سوئفٹ نے "گلورس ٹریولز" نہ لکھی ہوتی اور اگر اس
سیاسی زندگی میں اتنا نمایاں اور ڈرامائی کردار ادا نہ کیا ہوتا اور اگر اس حیرت انگیز خبطی آ
نے ان دعووں کو اپنی انتہائی دلچسپ نجی زندگی سے دائمیت نہ بخشی ہوتی تو اب دی ڈریپیرس
لیٹرز، کا کیا مقام ہوتا؟ اب زیادہ سے زیادہ ان کی تعریف، کبھی کبھار اینگلو آئرش تا
کے اس دور کا کوئی طالب علم کرتا جس میں کسی عجیب اتفاقی مطابقت کی وجہ سے خ
ادبی فراست بھی ہوتی۔ اور ان (خطوط) کو اسکے علاوہ اور کوئی نہ پڑھتا۔ یہی جنرل ڈی

لٹ بازی کا ہوتا اگر وہ رابن سن کروسو یا مول فلینڈرز کا مصنف نہ ہوتا یا یہی حشر
مول جونسن کی پمفلٹ بازی کا ہوتا اگر وہ بوزویل کا ہیرو نہ ہوتا۔ اب انگریزی زبان کے
ں مختلف قسم کے، ایک دوسرے عظیم ادیب کو لیجیے۔ فرض کیجیے کہ جون ہنری نیو مین
یزی چرچ کا عظیم رہنما نہ ہوتا جس کے ارتداد کو گلیڈ سٹون نے ' تباہ کن سانحہ ' کہا ہے' اور
نے انیسویں صدی میں وہ ممتاز رول ادا نہ کیا ہوتا جو اسنے کیا ہے ۔ یہ بھی فرض کرتے ہوئے
س کی ' ایپولوجیا (Apologia) کا نفسِ مضمون اتنا ہی مردہ اور بے روح ہوتا جتنا
ینڈہیں ووڈ کی بے وقعت تصانیف کا ہے، تو سوائے اسلوب کے رسیا چند نکتہ رس
اب ذوق کے اس کی کتاب آج یا ایک صدی بعد کون پڑھتا ؟۔ اور نیو مین کی ' ایپولوجیا '
ئاً اسی قدر صحافت کے ذیل میں آتی ہے جتنی سوئفٹ، ڈیفو اور جونسن کی
افت ہے۔

اب ایک بالکل متضاد مثال لیجیے۔ مارٹن مارپریلیٹ (Martin Marprelate)
رسالوں میں یقیناً اتنی اعلےٰ نثر نہیں ملتی جتنی سوئفٹ، ڈیفو، جونسن یا نیو مین کی
رین تحریروں میں ملتی ہے ۔ یہ رسالے ایک غیر پختہ دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اسکے
و دحقیقتاً ان میں اعلےٰ معیار کی بہت سی عبارتیں موجود ہیں اور ساری بحث ایک اعلیٰ ادبی
ر ملتی ہے۔ انہیں اب کون پڑھتا ہے ؟ سوائے ان چند لوگوں کے، جو اس دور کے مذہبی
رڈوں سے دلچسپی رکھتے ہیں، اور ان لوگوں کے جو اس دور کے نثری اسلوب سے دلچسپی
تے ہیں۔ یہ رسالے اب انگریزی زبان بولنے والے مہذب لوگوں کی ضروری تعلیم کا جزو نہیں
۔ ادبی اسلوب بعض اوقات طلماتی خصوصیات کا حامل سمجھا جاتا ہے یا اس کتاب کی زندگی
سرار محافظ سمجھا جاتا ہے جس سے اب کسی کو دلچسپی نہیں رہی۔ لیکن یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔
اسلوب کسی تحریر کو زندہ نہیں رکھ سکتا۔ اچھا اسلوب صرف مستقل دلچسپی کے موضوع کے ساتھ ملکر
ا تحریر کو زندہ رکھ سکتا ہے۔ دوسرے سارے تحفظ، جیسے کہ سوئفٹ یا ڈیفو کی صحافت میں
ہیں، ایک مبارک اتفاق کا نتیجہ ہیں حتیٰ کہ شاعری بھی اس سے محفوظ نہیں ہے حالانکہ شاعری عام
ہر چیز کے مقابلے میں، زیادہ بسیط اور زیادہ مستقل موضوعات سے تعلق رکھتی ہے۔ آخر اب کون، سوائے

چند علماء اور چند خطیبوں کے جو فطرتاً اس قسم کی تصنیف سے ہمدردی رکھتے ہیں یا جنہوں نے صحیح طور پر سمجھنے کے لئے بالا ارادہ اسکا مطالعہ کیا ہو، پوری فیری کوئین (The Faerie Queen) کو لطف لے کر پڑھ سکتا ہے۔

"چارلس وھبلے" (سنہ ۱۹۳۱ء)

ٹی ایس ایلیٹ

کاک ٹیل پارٹی

ڈرامہ

ترجمہ
سراج الحق

(فٹ نوٹ ڈرامے کے آخر میں دیکھیے)

"میرا ڈرامہ" دی کوک ٹیل پارٹی" جب پہلے پہل اسٹیج کیا گیا تو اس کے بعد مہینوں تک متعدد خطوط موصول ہوتے رہے جن میں اس ڈرامے کے معنی کی وضاحت کے لئے نئے نئے حل اور نئی نئی تشریحات پیش کی گئی تھیں۔ ان خطوط سے یہ بات واضح تھی کہ خط لکھنے والوں کو اس معمہ سے، جو ان کا خیال تھا کہ ڈرامہ میں موجود ہے، کوئی شکایت نہیں ہے۔ لیکن وہ خود اس بات سے بے خبر تھے کہ حل تلاش کرنے کی خاطر یہ معمہ انہوں نے خود ہی گھڑ لیا تھا۔"

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ

کاک ٹیل پارٹی

کردار

ایڈورڈ چیمبرلین

جولیا (مسز شٹل تھو ویٹ)

سیلیا کوپل اسٹون

الگزانڈر میک کولکی گبس

پیٹر کوئلپ

ایک انجانا مہمان جو بعد میں سر ہنری ہارکورٹ

رائلی نکلتا ہے

لیونیا چیمبرلین

ایک نرس سکریٹری

کیٹرر کے دو ملازم

سین : لندن شہر

پہلا ایکٹ
(سین اول)

لندن میں چیمبرلین کے فلیٹ کا ڈرائنگ روم۔ شام سے کچھ قبل۔
جولیا شٹل تھوویٹ، سیلیا کوپل اسٹون۔ پیٹر کوئلپ۔
الیگزنڈر میک کولگی گبس اور ایک انجانا مہمان۔

الکز :۔ تم اس نکتہ کو بالکل نہیں سمجھیں، جولیا: وہاں شیر تھے ہی نہیں۔ یہی تو اصل نکتہ تھا۔
جولیا :۔ تو پھر تم لوگ وہاں درخت پر چڑھے ہوئے کیا کر رہے تھے: تم اور مہاراجہ؟
الکز :۔ افوہ، میری عزیز جولیا! لو، یہاں تو قصہ ہی تمام ہو گیا۔ تم نے بات ٹھیک سے سنی ہی نہیں۔
پیٹر :۔ پھر تو آپ کو پورا قصہ پھر سے بیان کرنا ہوگا، الکز!
الکز :۔ میں ایک ہی کہانی کو دہرایا نہیں کرتا جناب۔
جولیا :۔ مگر میں تو جاننا چاہتی ہوں کہ آخر ہوا کیا؟ میں تو یہ جانتی ہوں کہ یہ قصہ شیروں کی کہانی سے شروع ہوا تھا۔
الکز :۔ میں نے کہہ تو دیا کہ کوئی شیر وِیر نہیں تھے۔
سلیا :۔ ارے، ختم بھی کرو اب اس جھگڑے کو۔ جولیا، اب تمہاری باری ہے۔ ہمیں تو تم وہی قصہ سنا دو جو تم نے اس دن سنایا تھا، وہی لیڈی کلوتز اور شادی کے کیک والا قصہ۔
پیٹر :۔ ہاں وہی جس میں بٹلر نے اسے باورچی خانہ میں دیکھا تھا کہ وہ اپنے منہ کو شیمپین سے بھگو کر ذائقہ ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہاں، مجھے وہ قصہ واقعی پسند ہے۔
سلیا :۔ مجھے بھی وہ قصہ بہت ہی پسند ہے۔
الکز :۔ اور میں، بھئی میں تو اس قصہ کو سننے سے کبھی نہیں تھکتا۔

جولیا :۔ اچھا ـــــ، آپ سب لوگ اس قصہ کو پہلے سے جانتے ہیں!
سیلیا :۔ کیا واقعی ہم سب لوگ اسے جانتے ہیں؟ لیکن جب تم بیان کرتی ہو، تو ہم اس سے کبھی بیزار نہیں ہوتے۔ اور مجھے تو یہ بھی یقین نہیں ہے کہ یہاں سب لوگ اس سے واقف ہیں۔ (انجانے مہمان سے) آپ تو نہیں جانتے ہوں گے۔ ٹھیک ہے نا؟
انجانا مہمان :۔ نہیں، میں نے کبھی نہیں سنا۔
سیلیا :۔ لو جولیا، تمہارے سامعین میں ایک کا اضافہ ہو گیا۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ ایڈورڈ کو اس کا کوئی علم ہے۔
ایڈورڈ :۔ میں نے شاید کبھی سنا ہو۔ مجھے کچھ ٹھیک سے یاد نہیں۔
سیلیا :۔ صرف جولیا ہی اسے سنا سکتی ہے پھر وہ نقلیں بھی تو کیسی اچھی اتارتی ہے۔
جولیا :۔ کیا واقعی میں اتنی اچھی نقلیں اتارتی ہوں؟
پیٹر :۔ اور کیا۔ تم تو کمال کی نقلیں اتارتی ہو۔ اور پھر تم سے کوئی چیز چھوٹتی بھی تو نہیں۔
الکز :۔ ہاں اس سے کوئی چیز نہیں چھوٹتی۔ بشرطیکہ وہ خود کسی چیز کو چھوڑنا نہ چاہے۔
سیلیا :۔ اور خاص طور پر لتھوئی لہجہ۔
جولیا :۔ لتھونیا؟ اور لیڈی کلوننز؟
پیٹر :۔ میں تو انہیں بیلجین سمجھتا تھا۔
الکز :۔ اس کا باپ تو کسی بالٹک خاندان سے تھا۔ یہ خاندان بالٹک کے قدیم ترین خاندانوں میں سے ایک تھا جس کی ایک شاخ سویڈن میں تھی اور دوسری ڈنمارک میں۔ اس کی کئی ایک انتہائی حسین و خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ معلوم نہیں ان کا کیا بنا۔
جولیا :۔ کسی زمانے میں لیڈی کلوننز بھی بہت ہی خوبصورت تھی۔ کیا زندگی تھی اس کی بھی۔ میں اس سے کہا کرتی تھی۔ "گرٹیا! تمہارے اندر کیفِ حیات کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہے۔ مگر اسنے زندگی کا حظ بھی خوب اٹھایا (انجانے مہمان سے) کیا آپ لیڈی کلوننز کو جانتے ہیں؟

نا مہمان :۔ جی نہیں، مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

سیلیا :۔ بھئی، اب تو شادی کے کیک کا قصہ سنا ہی ڈالو۔

لیا :۔ اچھا مگر درحقیقت اس قصہ کی اصل راوی میں نہیں ہوں۔ مجھے تو پہلی بار ڈیلیا ویرنڈر نے بتایا تھا۔ وہ اس وقت وہاں موجود تھی جب یہ واقعہ پیش آیا۔

(انجانے مہمان سے) آپ ڈیلیا ویرنڈر سے واقف ہیں؟

نا مہمان :۔ جی نہیں، میں انہیں نہیں جانتا۔

لیا :۔ چلئے اچھا ہوا۔ قصہ سنانے سے پہلے ایسی احتیاط برتے بغیر کچھ کہنا بھی تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

لکز :۔ ڈیلیا ویرینڈر؟ یہ وہی خاتون تو نہیں جن کے تین بھائی تھے۔

لیا :۔ کتنے بھائی تھے؟ میرے خیال میں تو صرف دو ہی تھے۔

لکز :۔ نہیں، تھے تو تین ہی۔ مگر تم شاید تیسرے بھائی کو نہیں جانتیں۔ اسے وہ لوگ ذرا الگ ہی رکھتے تھے۔

لیا :۔ اچھا تو تمہارا مقصد اس بھائی سے ہے۔

الکز :۔ ضعیف الدماغ تھا وہ۔

ولیا :۔ ارے وہ ضعیف الدماغ نہیں تھا؛ وہ تو محض ایک بے ضرر انسان تھا۔

الکز :۔ چلو بے ضرر سہی۔

لیا :۔ گھڑیوں کی مرمت کرنے میں وہ بہت ہوشیار تھا۔ اور پھر اس کی سماعت غضب کی تھی ــــــ میرے ملنے والوں میں وہ واحد شخص تھا جو چمگادڑوں کی آواز سن سکتا تھا۔

یٹر :۔ چمگادڑوں کی آواز سنتا تھا۔

ولیا :۔ جی ہاں، وہ چمگادڑوں کی آواز سن سکتا تھا۔

سیلیا :۔ مگر تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ چمگادڑوں کی آواز سن سکتا تھا؟

ولیا :۔ وہ خود ہی کہتا تھا اور میں نے یقین کر لیا۔

سیلیا :۔ اگر وہ اتنا . . . . . اتنا بے ضرر تھا، تو تمہیں یقین کس طرح آگیا؟ یہ محض

اسکے تصورات بھی تو ہو سکتے ہیں۔

جولیا :۔ میری پیاری سیلیا۔ اتنا مشکوک ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ شمال کی طرف جو اُن کا قلعہ ہے نا، مجھے ایک مرتبہ وہاں ٹھہرنے کا موقع ملا تھا۔ ہائے، وہ بے چارہ کس قدر کرب میں مبتلا تھا۔ ان لوگوں کو اس کے لئے ایک ایسا جزیرہ تلاش کرنا پڑا، جہاں چمگادڑیں نہیں تھیں۔

الکس :۔ کیا وہ اب تک وہیں ہے؟ ..... جولیا واقعی معلومات کا بحرِ بیکراں ہے!

سیلیا :۔ دنیا میں ایسی چیزیں بہت کم ہیں، جو لیا کو جن کا علم نہ ہو۔

پیٹر :۔ بھئی، وہ شادی کے کیک کا قصہ تو بیان کرو۔

(اس موقع پر ایڈورڈ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا جاتا ہے)

جولیا :۔ ابھی نہیں۔ ایڈورڈ کو واپس آنے دو۔ اس وقت تک انتظار کیجئے۔ میں بھی اب تھوڑی دیر کے لئے ستانا چاہتی ہوں۔ کیا کچھ کاکٹیل باقی ہیں؟

پیٹر :۔ آپ قصہ تو شروع کیجئے۔ ایڈورڈ کو جانے دیجئے۔ وہ توجہ ہی کب دے رہا تھا۔

جولیا :۔ یہ صحیح ہے کہ وہ سن نہیں رہا تھا۔ عجیب دردِ سر قسم کا آدمی ہے وہ! خاص طور پر اس وقت جب لیونیا اسکے ساتھ نہ ہو! پھر تو وہ ناقابلِ برداشت آدمی ہے۔ اب پارٹی کو قائم رکھنے کی تمام ذمہ داری مجھ غریب پر ڈال کر خود چلتا بنا۔ کیا میزبان ہے! کھانے کے لئے کوئی سلیقے کی چیز موجود ہی نہیں۔ مجھ جیسی چٹوری بڑھیا کے لئے کاکٹیل پارٹی کا واحد مقصد تو یہی ہے کہ کھانے کے لئے کچھ چٹپٹی چیزیں اچھی مقدار میں مل جائیں۔ پینے کو تو میں گھر میں بھی بیٹھ کر پی سکتی ہوں۔

(ایڈورڈ ایک کشتی لئے برآمد ہوتا ہے)

ایڈورڈ، ان مزے دار زیتونوں میں سے ایک آدھ اور مجھے دے دو۔ اور یہ کیا ہے؟ آلو کے قتلے؟ نہیں یہ تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ اچھا، خیر میں لیڈی کلوتز کا قصہ چھیڑنے والی تھی۔ ہاں، کئی سال پہلے کی بات ہے، ونس ویل کی شادی کا موقع تھا۔

(انجانے مہمان سے)

آپ ولنس ویل خاندان کو جانتے ہیں؟

مہمان :- جی نہیں، میں ولنس ویل والوں کو نہیں جانتا۔

یا :- خیر اب تو وہ دونوں مر چکے ہیں۔ لیکن میں دریافت کر لینا چاہتی تھی۔ اگر وہ لوگ آپ کے دوست ہوتے، تو میں یہ قصہ سنا نہ پاتی۔

ٹر :- کیا یہ ٹونی ولنس ویل کے والدین کا ذکر تو نہیں؟

لیا :- جی ہاں۔ ٹونی ان کا نتیجہ ضرور تھا۔ لیکن وہ ان کے مسئلے کا حل نہ تھا! اس نے تو حالات کو اور مشکل بنا دیا۔ تم ٹونی ولنس ویل کو جانتے ہو۔ تمہاری ملاقات آکسفورڈ میں تو نہیں ہوئی؟

ٹر :- نہیں، آکسفورڈ میں تو اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ گزشتہ سال کیلی فورنیا میں اس سے مڈھ بھیڑ ہو گئی تھی۔

لیا :- کیلی فورنیا جانے کی خواہش میرے دل میں بھی مدت سے کروٹیں لے رہی ہے۔ پر تم یہ تو بتاؤ کہ تم کیلی فورنیا میں کیا کر رہے تھے؟

یلیا :- ایک فلم بنا رہے تھے۔

یٹر :- فلم بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔

لیا :- کیا فلم تھی وہ؟ میں کہہ نہیں سکتی کہ میں نے دیکھی تھی ہے یا نہیں۔

یٹر :- ارے نہیں، آپ نے کبھی نہیں دیکھی ہوگی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ فلم بنی ہی نہیں انہوں نے ایک فلم بنائی ضرور تھی لیکن اس کی کہانی کچھ اور تھی۔

لیا :- وہ نہیں جو تم نے لکھی تھی۔

یٹر :- کہانی تو وہ نہیں تھی جو میں نے لکھی، مگر میں نے خوب مزے لوٹے۔

سلیا :- اچھا بھئی، اب تو شادی کے کیک کا قصہ شروع کرو۔

لیا :- ایڈورڈ، تم تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ بھی جاؤ۔ میں جانتی ہوں کہ تم ہمیشہ سے ایک بہترین میزبان ہو۔ لیکن اب تھوڑی دیر کے لئے یہ ڈھونگ رچا لو جیسے تم لیونیا

کی پارٹی میں ایک مہمان کی حیثیت سے آئے ہو۔ میں تم سے کئی سوالات پوچھنا چاہتی ہوں۔ اب جب کہ لیونیا موجود نہیں ہے، تو یہ موقع بڑا اچھا ہے۔ میں ہمیشہ کہتی تھی "کاش ایڈورڈ کہیں مجھے اکیلا مل جائے تو اس سے جی بھر کر چند سنجیدہ باتیں کر لوں!" میں نے لیونیا سے بھی یہی کہا تھا ایک مرتبہ۔ اس نے مجھ سے اتفاق کیا اور کہا۔ "میں بھی چاہتی ہوں کہ آپ ان سے بات کر لیں" اور یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تمہیں لیونیا کے بغیر دیکھا ہے، علاوہ اس واقعہ کے جب وہ غسل خانہ میں مقفل ہو گئی تھی اور باہر نہ نکل سکی تھی میں جانتی ہوں کہ تم اس وقت کیا سوچ رہے ہو۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم اس وقت یہ بھی سوچ رہے ہو کہ میں کتنی احمق بڑھیا ہوں۔ مگر میں ایک بہت سنجیدہ عورت ہوں۔ لیونیا بھی مجھے سنجیدہ سمجھتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں یہی وجہ ہے کہ آج وہ یہاں سے چلی گئی تاکہ میں تم سے کچھ کہلوا سکوں۔ شاید وہ اس وقت بھی باورچی خانہ میں بیٹھی ہماری باتیں سن رہی ہو۔

ایڈورڈ :۔ نہیں، وہ باورچی خانہ میں تو نہیں ہے۔

سیلیا :۔ کیوں ایڈورڈ، وہ کیا کافی عرصہ باہر رہے گی۔

ایڈورڈ :۔ جب تک وہ مجھے اطلاع نہ دے میں کہہ نہیں سکتا۔ اگر اس کی خالہ واقعی بہت بیمار ہے، تو شاید اسے کافی عرصہ تک وہاں رہنا پڑے۔

سیلیا :۔ جب تک وہ باہر ہے تم اپنا کیا انتظام کرو گے ؟

ایڈورڈ :۔ میں خود بھی نہیں جانتا۔ شاید میں خود بھی چلا جاؤں۔

سیلیا :۔ تم خود بھی چلے جاؤ گے !

جولیا :۔ کیا تمہاری بھی کوئی خالہ ہیں ؟

ایڈورڈ :۔ نہیں۔ میری کوئی خالہ والہ تو نہیں۔ لیکن پھر بھی شاید میں چلا ہی جاؤں۔

سیلیا :۔ مگر ایڈورڈ ..... اوہ میں کیا کہنا چاہتی تھی ؟ بھول گئی۔ سن رسیدہ خواتین کے لئے گاؤں میں رہنا بھی ایک مصیبت ہے۔ اور وہاں کوئی نرس ملنا تو قطعاً ناممکن ہے۔

جولیا:۔ اس کی خالہ ـــــ لارا تو نہیں۔
ایڈورڈ:۔ نہیں، کوئی اور خالہ ہیں۔ اس کی ماں کی بہن ہیں اور راہبہ کی سی زندگی گذار رہی ہیں۔
جولیا:۔ کیا یہ ان کی چہیتی خالہ ہیں؟
ایڈورڈ:۔ بلکہ وہ ہی خالہ کی چہیتی بھانجی ہے۔ وہ بڑا پریشان کرتی ہیں جب کبھی بیمار پڑتی ہیں، لیونیا کو بلانے پر مصر ہو جاتی ہیں۔
جولیا:۔ میں نے اس سے پہلے یہ کبھی نہیں سنا کہ وہ بیمار رہتی ہیں!
ایڈورڈ:۔ ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ وہ تو ماشاء اللہ ہمیشہ تندرست و توانا رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ذرا بیمار پڑتی ہیں واویلا مچا دیتی ہیں۔
جولیا:۔ اور پھر وہ لیونیا کو بلا بھیجتی ہیں۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ کیا ان سے کچھ توقعات وابستہ ہیں۔
ایڈورڈ:۔ نہیں۔ انہوں نے تو اپنی پوری جائیداد کو سالیانہ میں منتقل کروا دیا ہے۔
جولیا:۔ یہ تو لیونیا کی بے لوثی کا ثبوت ہے۔ ویسے وہ ہے بھی اس طبعیت کی مگر ایڈورڈ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں۔ ممکن ہے کہ لیونیا کو وہاں ہفتوں رہنا پڑے، یا یہ کہ وہ واپس لوٹ آئے اور پھر بلا لی جائے۔ میں ان سخت گیر بڑھیاؤں کو خوب سمجھتی ہوں۔ میں خود جو ایسی ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس ہیمپشائر میں رہنے والی خالہ کے متعلق میں سب کچھ جانتی ہوں۔
ایڈورڈ:۔ ہیمپشائر؟
جولیا:۔ تم نے ہیمپشائر ہی تو کہا تھا نا؟
ایڈورڈ:۔ نہیں، میں نے ہیمپشائر کا ذکر تو نہیں کیا۔
جولیا:۔ تو کیا ہیمپسٹیڈ کہا تھا؟
ایڈورڈ:۔ نہیں، میں نے ہیمپسٹیڈ بھی نہیں کہا تھا۔
جولیا:۔ مگر وہ کہیں تو رہتی ہو گی؟
ایڈورڈ:۔ وہ تو اسیکس میں رہتی ہیں۔

جولیا :۔ کہیں کولچیسٹر کے آس پاس؟ لیونیا کو وہاں کے جھینگے بہت پسند ہیں۔

ایڈورڈ :۔ نہیں۔ وہ اسیکس کے "نشیبوں" میں رہتی ہیں۔

جولیا :۔ چھوڑیئے، ہمیں اس میں جانے کی ضرورت نہیں۔ مگر تمہارے پاس ان کا پتہ اور ٹیلی فون کا نمبر تو ہوگا نا؟ میں یہ سوچ رہی تھی کہ کارنوال جانے وقت، درمیان میں لیونیا سے جاکر مل لوں گی۔ خیر، اب کچھ سنجیدہ ہونا چاہیئے: ایک تو یہ کہ تم مجھے اپنی کنواری خالہ تسلیم کرلو ـــــ صرف سالانہ آمدنی کی بنا پر رہنے والی خالہ۔ میں اب تمہیں مجبور کرنے والی ہوں کہ تم جمعہ کی شام کو کھانا آکر میرے ہاں کھاؤ اور مجھ سے ہر موضوع پر گفتگو کرو۔

ایڈورڈ :۔ ہر موضوع پر۔

جولیا :۔ بھولے مت بنو۔ تم میری بات اچھی طرح سمجھ گئے ہو۔ موضوع تو آئندہ الیکشن ہوگا۔ اور پھر اپنے معاملات کے راز بھی مجھ سے بیان کرنا۔

ایڈورڈ :۔ میرے راز زیادہ تر بہت ہی غیر دلچسپ ہیں۔

جولیا :۔ تم چاہے کچھ کہو، مجھ سے بچ کر نہ جا سکو گے۔ یہ بات بالکل پکی ہے۔ تم جمعہ کو رات کا کھانا میرے ہاں کھاؤ گے۔ میں نے تو اُن لوگوں کا بھی انتخاب کرلیا ہے جن سے وہاں تمہاری ملاقات ہوگی۔

ایڈورڈ :۔ مگر آپ نے مجھ سے تو تنہا کھانا کھانے کو کہا تھا۔

جولیا :۔ جی ہاں، بالکل تنہا! یعنی لیونیا کے بغیر! تم باقی مہمانوں سے مل کر مسرت محسوس کروگے۔ البتہ باتیں تمہیں مجھ سے کرنی ہوں گی۔ طے ہوگئی نا بات؟ اور اب میں چلوں گی۔

ایڈورڈ :۔ واقعی جانا چاہتی ہیں آپ؟

پیٹر :۔ مگر کیا آپ لیڈی کلوتنز کا قصہ نہیں سنائیں گی؟

جولیا :۔ کونسی لیڈی کلوتنز؟

سیلیا :۔ اور وہ شادی کے کیک کا قصہ؟

جولیا :۔ شادی کا کیک! میں اس کی شادی میں شریک ہی نہیں ہوئی تھی۔ ایڈورڈ! بھئی بڑی مسرت افزا شام گذری: وہ آلو کے قتلے تو بہت ہی اچھے تھے۔ ذرا میں دیکھ لوں کہ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی؟ کتنی پیاری پارٹی ہے یہ۔ میں بھی ایسی ہی پارٹی دینا چاہتی ہوں۔ تم لوگ بھی سب کے سب جمعہ کو میرے ہاں کھانے پر کیوں نہیں آجاتے؟ ..... لیکن نہیں، مجھے ڈر یہ ہے کہ میری نوکرانی مسز بیٹن مجھے نوٹس دے دیگی۔ اچھا اب مجھے چلنا چاہئے۔

الکز :۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے بھی جانا چاہئے۔

پیٹر :۔ سیلیا۔ کیا میں تمہارے ساتھ چلا چلوں؟

سیلیا :۔ نہیں پیٹر، مجھے معاف کرنا مجھے ٹیکسی سے جانا ہے۔

جولیا :۔ تم میرے ساتھ آؤ، پیٹر۔ تم میرے لئے ٹیکسی لا سکتے ہو۔ اور میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گی۔ ایڈورڈ، میں جمعہ کو تمہاری منتظر رہوں گی۔ اور سیلیا، تم سے بھی مجھے بہت جلد ملنا ہے۔ ارے یہ کیا، میرے جانے سے تم سب الگ کیوں جا رہے ہو۔ خدا حافظ ایڈورڈ!

ایڈورڈ :۔ خدا حافظ، جولیا!

(جولیا اور پیٹر باہر چلے جاتے ہیں)

سیلیا :۔ خدا حافظ، ایڈورڈ! کیا تم سے جلد ہی کوئی ملاقات ہو سکتی ہے؟

ایڈورڈ :۔ شاید مجھے معلوم نہیں۔

سیلیا :۔ شاید تمہیں کچھ معلوم نہیں؟ چلو یونہی سہی۔ اچھا خدا حافظ۔!

ایڈورڈ :۔ خدا حافظ، سیلیا۔

الکز :۔ خدا حافظ، ایڈورڈ! مجھے امید ہے کہ تمہیں لیونیا کی خالہ کے متعلق کوئی اچھی خبر ملے گی۔

ایڈورڈ :۔ کیا ..... ہاں ہاں شکریہ، خدا حافظ، الکز، تم نے آکر مجھ پر بڑی عنایت کی۔

(الکز اور سیلیا باہر چلے جاتے ہیں)

(انجانے مہمان سے)

آپ ابھی نہ جائیں، تھوڑی دیر رک جایئے۔ آیئے ہم اس کاکٹیل کو ختم کرلیں یا آپ وہسکی سے شوق فرمائیں گے۔

انجانا مہمان: میں جن لوں گا۔

ایڈورڈ:۔ کچھ ملا کر دوں؟

انجانا مہمان:۔ صرف تھوڑا سا پانی ڈال دیجئے۔

ایڈورڈ:۔ آج شام کی محفل کیلئے میں معافی چاہتا ہوں۔ دراصل میں نے اس پارٹی کو ملتوی کرنے کی بہت کوشش کی تھی۔ صرف یہی لوگ تھے جنہیں میں ٹال نہیں سکا کیونکہ میں بر وقت ان تک پہنچ نہ سکا۔ اور پھر مجھے یہ بھی تو علم نہیں تھا کہ آپ آرہے ہیں۔ میں تو یہی سمجھ بیٹھا تھا کہ لیوینا نے مجھے ان تمام لوگوں کے نام بتادیئے تھے جن کو اسنے مدعو کیا تھا۔ لیکن ان لوگوں میں بھی سوائے اس آفت کے پرکالہ بڑھیا کے مجھے کسی اور کے آنے پہ کوئی اعتراض نہ تھا۔

(دروازے کی گھنٹی بجنے لگی ہے۔ ایڈورڈ یہ کہتا ہوا دروازہ کی طرف جاتا ہے)

مگر وہ ہر اس جگہ پہ پہنچ جاتی ہے جہاں وہ سب سے کم مطلوب ہے۔

(دروازہ کھولتا ہے)

جولیا، تم! (جولیا اندر آجاتی ہے)

جولیا:۔ ایڈورڈ! کتنی خوش قسمتی کی بات ہے کہ باہر مینہ برس رہا ہے اس سے مجھے اپنا چھاتا یاد آگیا۔ وہ رہا اُدھر! یہ تم دونوں یہاں بیٹھے کیا سازش کررہے ہو؟ اچھا ہوا کہ یہ میرا ہی چھاتا نکلا، الیگزینڈر کا نہیں۔ بہت باتونی آدمی ہے وہ! مگر میں دوسروں کے معاملات میں دخل ہرگز نہیں دیتی۔ اچھا خدا حافظ اب میں بھی اپنی راہ لوں تو اچھا ہے

(باہر چلی جاتی ہے)

ایڈورڈ:۔ معاف کیجئے گا، میرے خیال میں، میں تو آپ کا نام بھی نہیں جانتا۔
انجانا مہمان:۔ اب مجھے بھی چلا جانا چاہئے۔
ایڈورڈ:۔ نہیں، ابھی نہ جایئے۔ میں کسی سے بیٹھ کر باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اور کسی ایسے آدمی سے باتیں کرنا آسان ہے، جسے انسان نہ جانتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ لیو نیا مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے!
انجانا مہمان:۔ آپ کی بیوی آپ کو چھوڑ کر چلی گئی ہے؟
ایڈورڈ:۔ اور وہ بھی اطلاع دیئے بغیر ــــ اور عین اس موقع پر جب اسنے کاکٹیل پارٹی کا انتظام کیا تھا ــــ پھر کو جب میں گھر لوٹا تو وہ جا چکی تھی۔ ایک رقعہ میرے نام چھوڑ گئی ہے جس میں لکھا ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ گئی کہاں ہے؟
انجانا مہمان:۔ یہ ایک اہم موقع ہے ــــ کیا میں کچھ اور پی سکتا ہوں؟
ایڈورڈ:۔ وہسکی؟
انجانا مہمان:۔ جِن۔
ایڈورڈ:۔ اسکے ساتھ کوئی اور چیز۔
انجانا مہمان:۔ پانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں آپکے لئے بھی یہی نسخہ تجویز کرتا ہوں .... اگر اجازت دیں تو میں آپکے لئے بھی یہی بنا لاؤں .... تیز تو ضرور ہوگی.... آپ ذرا آہستہ آہستہ چسکیاں لے کر پیجئے...... اور بیٹھ کر پیجئے۔ گہری سانسیں لیجئے اور ایک آرام دہ کیفیت پیدا کر لیجئے۔ ہاں، یوں ٹھیک ہے۔ اب کچھ سوالات پوچھ لوں ــــ شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے۔
ایڈورڈ:۔ پانچ سال۔
انجانا مہمان:۔ بچے وچے؟
ایڈورڈ:۔ کوئی نہیں۔
انجانا مہمان:۔ پھر تو آپ اس واقعہ کے روشن پہلو پر بھی نظر ڈالیں۔ آپ یہی کہہ رہے تھے نا کہ

آپ کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں گئی ہیں؟

ایڈورڈ :۔ نہیں، مجھے معلوم نہیں۔

انجانا مہمان: آپ کو معلوم ہے کہ اسکے پیچھے کون شخص ہے؟

ایڈورڈ :۔ کوئی اور شخص نہیں تھا ـــــ میرے علم میں تو کوئی نہیں۔

انجانا مہمان:۔ یا کوئی دوسری عورت جس کے لئے اس کا خیال ہو کہ وہ اس کی رقیب ہے۔

ایڈورڈ:۔ اسنے میرے چال چلن میں کوئی بات قابلِ شکایت نہیں پائی۔

انجانا مہمان:۔ پھر تو بیشک یہ سب باتیں آپ کے فائدے کی ہیں۔ اگر کوئی اور شخص ہے، تو ممکن ہے اسنے غلط آدمی چنا ہو اور پھر آپ کے پاس واپس آنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ اگر کوئی عورت ہے، تو شاید وہ آپ کو معاف کر دے۔ اور اس طرح اسے ایک فوقیت حاصل ہو جائے۔ اگر کوئی دوسری عورت نہیں ہے اور نہ کوئی اور شخص، پھر تو کوئی اور بہت گہری وجہ ہو سکتی ہے اور آپ کے لئے امید کی گنجائش ہے کہ وہ قطعاً واپس لوٹ کر نہیں آئے گی۔ اگر کوئی اور شخص ہے، تو پھر آپ دوسری شادی کرنا چاہیں گے تاکہ دنیا پر یہ ثابت ہو جائے کہ کوئی اور بھی آپ کو چاہتا ہے، اور معاملہ اگر کسی اور عورت کا ہے، تو آپ کو اس سے شادی کرنی ہوگی۔ آپ چاہے یہ تصور کر لیں کہ آپ درحقیقت اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔

ایڈورڈ:۔ لیکن مجھے تو اپنی بیوی واپس چاہئے۔

انجانا مہمان: یہ تو عین فطری ردعمل ہے۔ خفت اور کوفت کی بات تو ضرور ہے۔ اس معاملے پر جھوٹ بولنا بڑی تکلیف دہ بات تو تھی کیونکہ ٹیلی فون پر آپ جھوٹ نہیں بول سکتے۔ اس معاملے میں وقت درکار ہے جو آپ کو ٹھیک سے میسر نہیں۔ اس کے باوجود میں آپ سے پوچھتا ہوں .....

ایڈورڈ:۔ مجھ سے مت پوچھئے۔

انجانا مہمان: تو پھر میں یہ تجویز کروں گا کہ .....

ایڈورڈ:۔ براہ کرم کچھ تجویز نہ کیجئے۔ میں نے یہ اصطلاحیں گواہوں سے استغاثہ میں اکثر استعمال

کی ہیں، اس لئے مجھے پسند نہیں ہیں۔ ہیں آپ سے کچھ پوچھوں؟ میں یہ تو جانتا ہوں
کہ گفتگو کے اس سلسلے کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ ہیں
کون۔ میں گفتگو کے اس پہلو کا متوقع نہیں تھا۔ جو کچھ اب تک چھپاتا رہا، اسکو
کسی شخص پر ظاہر کر کے، میں محض اپنے ذہن کو کسی قدر ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ اب تو میں
یہ بھی جاننا نہیں چاہتا کہ آپ کون ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ ساتھ ایک بات میں ضرور
کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر آپ میری بیوی کو میرے قیاس سے بھی زیادہ بہتر طریقے
پر جانتے ہیں، یا یہ کہ ہم دونوں کے متعلق آپ کو اس سے زیادہ علم ہے جتنا کہ بظاہر
معلوم ہوتا ہے — پھر تو خیر کوئی بات نہیں، ورنہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی قیاس آرائیاں
بہت تکلیف دہ ہیں۔

انجانا مہمان: میں آپ کو اتنا ہی اچھی طرح جانتا ہوں جتنا آپ کی بیوی کو! میں یہ بھی جانتا ہوں
کہ آپ کی تمنا محض یہ تھی کہ کسی اجنبی سے دل کی گہرائیوں کی باتوں کا انکشاف کرکے
ذہنی تعیش حاصل کریں۔ اس لئے مجھے اجنبی رہنے دیجئے۔ لیکن ایک بات میں آپ
پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اجنبی کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش، غیر متوقع کو دعوت
دینے، کسی نئی قوت کو آزاد کرنے، یا بوتل میں بند جن کو رہا کر دینے کے مترادف ہے۔
یہ واقعات کے اس سلسلے کی ابتدا کرنے کی مانند ہے جو آپ کے ضابطہ اور قابو سے
باہر ہیں۔ اس لئے مجھے بات جاری رکھنے دیجئے۔ اب میں یہ کہوں گا کہ آپ ایسی
طمانیت محسوس کر رہے ہیں جس سے شعوری طور پر آپ واقف نہیں ہیں۔ آپ کو یہ
اندازہ رفتہ رفتہ ہوگا: جب آپ صبح کو بیدار ہوں گے، جب آپ رات کو سونے لگیں
گے، تو آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ اپنی آزادی سے لطف اندوز ہونے لگے ہیں!
جب آپ اس کے بغیر اپنی حیات کو زیادہ مطمئن و فرحت بخش پائیں گے جو آپ کے
لئے ایک باضابطہ نقاد تھی، جو بڑے استقلال کے ساتھ غلط فہمی میں مبتلا رہتی تھی۔
جو زندگی کو کچھ ایسے بہتر طریقے پر ترتیب دیتی رہی، جو آپ کی پسند سے بالاتر تھی، جو
ایسے دوستوں کو ترجیح دیتی تھی جو آپ سے بہتر ہوں، جو آپ کے دوستوں سے اسطرح

پیش آتی تھی کہ وہ آپ سے زیادہ اس کو چاہنے لگیں! اور پھر جب ماضی کو باربار
آپ ذہن میں دہرائیں گے تو آپ کو حیرت ہوگی کہ آپ اتنا عرصہ یہ سب کچھ بھگتتے
رہے۔ اور پھر شاید کبھی کبھار آپ کو رشک سا محسوس ہوگا کہ اسنے یہ سب کچھ
آپ سے پہلے ہی جان لیا اور اس میں اتنی ہمت تھی کہ اس سلسلہ کو توڑ ڈالے ۔۔
اور اس طرح اسنے خود کو ایک مستقل سبقت دیدی۔

ایڈورڈ :۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو، اسکے باوجود.....

انجانا مہمان :۔ کیا آپ یہ کہنے والے ہیں کہ آپ اس سے محبت کرتے ہیں؟

ایڈورڈ :۔ اس کا کیا سوال ہے۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ ہم دونوں ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں۔ میں نے
اس پر کبھی غور نہیں کیا کہ کسی اور عورت کے ساتھ میں زیادہ خوش بھی رہ سکتا ہوں۔
محبت کا ذکر کیوں کیجئے، ہم ایک دوسرے کے عادی ہو چکے تھے اس لئے ایک لمحہ کے
نوٹس پر، کسی افہام و تفہیم کے بغیر، محض ایک رقعہ لکھ کر وہ جا رہی ہے اور پھر کبھی
واپس لوٹ کر نہیں آئے گی، سچ پوچھئے تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کوئی شخص اسرار دل
میں گرفتار رہنا پسند نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ کتنا..... نامکمل ہے۔

انجانا مہمان :۔ جی ہاں، نامکمل تو ہے! اور کوئی شخص اسراروں میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ مگر اسکے
علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ یہاں تو اپنی شخصیت کھو دینے کا مسئلہ ہے؛ یا یوں کہئے کہ
آپ اس شخص سے اپنا ربط کھو بیٹھے ہیں، جس کے بارے میں آپ کا خیال تھا کہ وہ خود
آپ ہیں۔ اب آپ اپنے آپ کو پورے معنوں میں انسان نہیں محسوس کرتے۔ آپ
اچانک گھٹ کر کسی شے کی حیثیت پر آ گئے ہیں ۔۔ ایک زندہ شے، جس کی حیثیت
اب ایک شخص کی نہیں رہی۔ یہ ہمیشہ ہوتا رہتا ہے کیونکہ انسان ایک شے بھی ہے
اور ایک شخص بھی۔ لیکن ہم اس بات کو حتی الامکان بہت جلد بھول جاتے ہیں جب
آپ کسی دعوت میں شریک ہونے کے لئے تیار ہوتے ہیں اور آپ سیڑھی سے
نیچے اترنے لگتے ہیں، اس وقت آپ کا احاطہ کرتی ہوئی تمام چیزیں ایک ایسی ترتیب
لئے ہوتی ہیں، جو آپ کو اپنے منتخب کردہ کردار کو قائم رکھنے میں مدد کرتی ہیں۔ اور

پھر بعض اوقات، جب آپ آخری زینہ پر پہونچتے ہیں، توخلاف توقع ایک اور زینہ نکل آتا ہے اور آپ دھڑام سے نیچے گر جاتے ہیں۔ اس وقت لمحہ بھر کے لئے آپ کو ایک ایسی شے ہونے کا تجربہ حاصل ہوجاتا ہے جو ایک بدباطن سیڑھی کے رحم وکرم پر تھی۔ یا پھر ایک عملِ جراحی کو لیجئے۔ ایک ڈاکٹر اور ایک سرجن سے مشورہ کرتے ہوئے کسی نرسنگ ہوم میں بیماروں کے بستر پر دراز ہوتے ہوئے، یا میٹرن سے باتیں کرتے ہوئے ـــــ اس وقت تک آپ یقیناً 'حقیقت' کا موضوع و مرکز ہیں۔ لیکن جب آپ کو میز پر لٹا دیا جاتا ہے، تب آپ کے اردگرد موجود لوگوں اور ان نقاب پوش اداکاروں کے لئے آپ کی حیثیت محض فرنیچر کے ایک ٹکڑے کی سی ہے، جو کسی مرمت کرنے والے کی دکان میں پڑا ہوا ہو؛ آپ کا تو صرف جسم وہاں موجود ہے اور باقی جو کچھ 'آپ' ہیں، وہاں سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ کیا میں کچھ شراب اور لے سکتا ہوں؟

ایڈورڈ :۔ اوہ، معاف کیجئے گا۔ آپ کیا پی رہے تھے؟ وسکی؟

انجانا مہمان: جِن

ایڈورڈ :۔ اور اسکے ساتھ

انجانا مہمان:۔ پانی۔

ایڈورڈ :۔ ان باتوں کا اصل مقصد کیا ہے۔

انجانا مہمان: اس کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ آپ درحقیقت کیا ہیں۔ آپ درحقیقت کیا محسوس کرتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے درمیان آپ حقیقتاً کیا ہیں۔ اکثر و بیشتر ہم اپنے وجود کو بلا ثبوت مان لیتے ہیں، چونکہ ہمیں یہ کرنا پڑتا ہے اور ہم جو کچھ تھے، اسکے متعلق بہت کم علم پر ہم زندہ رہتے ہیں۔ اس وقت آپ کون ہیں؟ اسکے متعلق آپ بھی اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا میں جانتا ہوں، بلکہ آپ تو کمتر ہی جانتے ہیں۔ آپ تو فرسودہ تاثرات کے ایک مجموعہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ صرف ایک چیز جو کرنی ہے وہ یہ ہے کہ کچھ نہ کیا جائے۔ انتظار کرنا چاہیئے۔

ایڈورڈ :۔ انتظار! انتظار کرنا ہی تو ایک چیز ہے جو ناممکن ہے۔ علاوہ اسکے، آپ دیکھ

نہیں رہے ہیں کہ اس نے مجھے مضحکہ خیز بنا دیا ہے؟

انجانا مہمان۔ مضحکہ خیز ہونے کا علم آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ آپ تو اپنے احمق ہونے پر قناعت کرلیں۔ یہ بہترین مشورہ ہے جو میں آپ کو دے سکتا ہوں۔

ایڈورڈ:۔ مگر انتظار کیسے کروں گا جب کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کس چیز کے انتظار میں ہوں؟ کیا میں اپنے دوستوں سے یہی کہہ دوں کہ "میری بیوی چلی گئی ہے"؟ اور جب وہ پوچھیں کہ "کہاں؟" تو میں کہوں کہ "مجھے معلوم نہیں"! پھر وہ کہیں کہ "وہ واپس کب ہوگی؟" اور میں جواب دوں کہ "مجھے معلوم نہیں کہ وہ لوٹ کر آبھی رہی ہے"۔ پھر وہ پوچھیں کہ "اچھا تو تم اس کے متعلق کیا کروگے؟" اور میں جواب دوں کہ "کچھ بھی نہیں"۔ ایسے جوابات سے وہ مجھے پاگل سمجھیں گے یا محض قابلِ نفرت۔"

انجانا مہمان:۔ یہ سب آپ کے لئے بہتر ہے۔ آپ یہ معلوم کرلیں گے کہ آپ ذلت کے بعد بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ اور یہ ایک بے حد قیمتی تجربہ ہے۔

ایڈورڈ:۔ بس، بہت ہو چکا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ جو کچھ آپ نے کہا ہے، بالکل صحیح ہے۔ لیکن صرف یہی سب کچھ نہیں ہے آج صبح ناشتہ کرتے وقت میں نے اسے دیکھا تھا مگر اب اس وقت مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میری بیوی کی شکل وصورت کیسی تھی۔ اگر میں پولیس سے اسے تلاش کرنے کے لئے کہنا چاہوں، تو مجھے یہ بھی پورا یقین نہیں ہے کہ میں اسکے حلیہ کو صحیح بیان کرسکوں گا۔ مجھے یہ بھی ٹھیک سے یاد نہیں کہ جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تو وہ کیا پہنے ہوئے تھی۔ اور اسکے باوجود میں اسے واپس حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اسے واپس حاصل کرنا میرے لئے ازبس ضروری ہے تاکہ میں یہ معلوم کرلوں کہ ہماری شادی کے پانچ سالوں میں کیا کیا ہوا تھا۔ میرے لئے یہ جاننا بے حد ضروری ہے کہ وہ کون ہے اور یہ بھی کہ میں کون ہوں۔ اگر مجھے آئندہ ہمیشہ کے لئے لاعلمی کے اندھیرے میں رہنا پڑا تو پھر آپ کے اس تمام تجزیہ کا کیا فائدہ؟

انجانا مہمان:۔ اندھیرے میں رہنے سے یقیناً کوئی فائدہ نہیں۔ سوائے اسکے کہ آپ ایک مدت

تک اس اندھیرے میں رہیں تاکہ آپ کے ذہن سے وہ سراب کی سی کیفیت محو ہوجائے کہ آپ روشنی سے کبھی وابستہ رہ چکے ہیں۔ یہ حقیقت کہ آپ اسکو حاصل کرنے کا کوئی جواز پیش نہیں کرسکتے، اس بات پر یقین کرنے کا بہترین سبب ہے کہ آپ اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ایڈورڈ: میں اسے پھر دیکھنا چاہتا ہوں ـــــ اور اسی گھر میں۔

انجانا مہمان: آپ پھر اسے ضرور دیکھیں گے ـــــ یہیں، اسی گھر میں۔

ایڈورڈ: کیا آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ وہ کہاں ہے۔

انجانا مہمان: یہ سوال جواب دینے کی زحمت کے قابل ہی نہیں۔ لیکن اگر میں اسے واپس لے آؤں تو ایک شرط آپ پر عائد ہوگی: اور وہ یہ کہ اس سے اسکے متعلق کوئی سوال نہیں پوچھیں گے کہ وہ کہاں تھی۔

ایڈورڈ: میں کوئی سوال نہیں پوچھوں گا۔ اور اسکے باوجود ـــــ مجھے یوں لگتا ہے ـــــ جب ہم نے گفتگو شروع کی تھی، اس وقت مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ میں اسے حاصل کرنا چاہتا تھا؛ اور اب میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا واقعی میں اسکو چاہتا ہوں؟ یا یہ صرف آپ کے اکسانے کا نتیجہ ہے؟

انجانا مہمان: ہمیں فی الحال اس بات کا کوئی علم نہیں۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر وہ آپ کے پاس یہاں آئے گی۔ آپ اس سے ملنے کے لئے یہاں موجود ہوں گے۔

(دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے)

ایڈورڈ: میں ذرا دیکھ لوں کہ دروازہ پر کون ہے؟

(ایڈورڈ دروازہ کی جانب بڑھتا ہے)

تم پھر آگئیں جولیا!

(جولیا اور پیٹر داخل ہوتے ہیں)

جولیا: ایڈورڈ، کیا بتاؤں کہ تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ تمہیں شاید معلوم ہو۔ میں یہاں اپنی عینک بھول گئی ہوں۔ اور اسکے بغیر تو مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

میں ہیپڑ کو لئے لئے اس کی تلاش میں پورے شہر میں ہر اس جگہ جا چکی ہوں جہاں جہاں میں گئی تھی۔ آپ اسے دیکھیں گے تو فوراً پہچان لیں گے کہ وہ میری ہی عینک ہے۔ اس کا فریم پلاسٹک کی کسی قسم کا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ مجھے اسکا رنگ یاد نہیں ہے۔ لیکن میں اسے فوراً پہچان لوں گی کیونکہ اس میں ایک شیشہ غائب ہے۔

(انجانا مہمان گانے لگتا ہے)

میں جن اور پانی جو پیتا رہا ہوں
مرا نام بھی رائلی ہے
میں کانا بھی ہوں اور
زمیندار کی لڑکی آئی تھی اس وقت
وہ دل میرا لے کر گئی ہے

آپ مقررہ ملاقات کے لئے تیار رہیں گے نا؟

ایڈورڈ:۔ جی ہاں تیار رہوں گا۔

(انجانا مہمان گاتا ہے)

لا للا لل لا لا للا لل لا
کانے رائلی کو یہ کیا ہوا؟ (چلا جاتا ہے)

جولیا:۔ ایڈورڈ، یہ کون بدتمیز آدمی ہے؟ زندگی بھر کسی نے اس طرح میری توہین نہیں کی۔ بڑی خوش قسمتی ہے کہ میں اپنی عینک یہاں بھول گئی، میں اسی کو ایک بڑا کارنامہ کہتی ہوں!! اب اس شخص کے متعلق کچھ سناؤ۔ تم دونوں مل کر شراب پی رہے تھے نا! اچھا، تو آپ لیونیا کی غیر موجودگی میں اس قماش کے دوستوں کو بلا بھیجتے ہیں! وہ ہے کون؟

ایڈورڈ:۔ میں نہیں جانتا۔

جولیا۔ تم نہیں جانتے ؟
ایڈورڈ:۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے قبل اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔
جولیا:۔ مگر وہ یہاں آیا کیسے ؟
ایڈورڈ:۔ مجھے معلوم نہیں۔
جولیا:۔ تمہیں معلوم نہیں! اور نام کیا ہے اس کا ؟ میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ
اس کا نام رائلی ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟
ایڈورڈ:۔ میں اس کا نام نہیں جانتا۔
جولیا:۔ تمہیں اس کا نام بھی معلوم نہیں ؟
ایڈورڈ:۔ میں نے تمہیں تبلا دیا کہ مجھے کوئی علم نہیں کہ وہ کون ہے اور یہاں کیسے آگیا۔
جولیا:۔ لیکن تم لوگ کیا باتیں کر رہے تھے؟ یا صرف گانا گانے میں مصروف تھے ؟ آج تو اس
گھر کی ہر چیز ناقابلِ اعتبار حد تک معمہ بنی ہوئی ہے۔
ایڈورڈ:۔ مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔
جولیا:۔ نہیں نہیں۔ میں تو ہر پُراسرار چیز کو بہت پسند کرتی ہوں۔ خیر، اس سے مجھے
پھر اپنی عینک یاد آئی۔ وہ ہی تو سب سے بڑا معمہ ہے۔ پیٹر! تم اسے ڈھونڈتے
کیوں نہیں ؟ ذرا آتشدان کے اوپر تو دیکھو۔ میں بیٹھی کہاں تھی ؟ ذرا اس
صوفے کے پیندے کو باہر کی طرف پلٹ کر دیکھو ـــــ نہیں، اس کرسی کو دیکھو۔
اس کے کشن کے نیچے دیکھ لو۔
ایڈورڈ:۔ کیا تمہیں اس کا پورا یقین ہے کہ وہ تمہارے بیگ میں نہیں ہے ؟
جولیا:۔ نہیں تو، قطعاً نہیں: وہیں تو میں اسے رکھا کرتی ہوں۔ ارے، یہ تو اسی میں نکلی!
بہت بہت شکریہ، ایڈورڈ! تم تو واقعی بہت ہوشیار نکلے! تمہارے بغیر میں
اسے کبھی تلاش نہ کر پاتی۔ آئندہ کبھی اگر میں کوئی چیز کھو بیٹھی، ایڈورڈ، تو میں
سینٹ اینتھنی کے بجائے سیدھی تمہارے پاس چلی آؤں گی۔ اچھا اب مجھے یہاں سے
بھاگنا چاہئے۔ میں نے ٹیکسی کو باہر روکے رکھا ہے۔ چلو، پیٹر!

پیٹر:۔ جولیا، مجھے امید ہے کہ اگر میں تمہارے ساتھ نہ چلوں تو تم برا نہیں مانو گی ۔۔ کیوں؟
لوٹتے وقت مجھے ایک بات یاد آئی ہے، جو میں ایڈورڈ کو بتلانا چاہتا ہوں .....

جولیا:۔ ہوں! کیا لیونیا کے متعلق؟

پیٹر:۔ نہیں، لیونیا کے متعلق نہیں ہے۔ کچھ ایسی بات ہے جس کے متعلق میں ان سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ میں اس وقت ہی کرلوں تو اچھا ہے۔

جولیا:۔ ٹھیک ہے۔ میں قطعاً برا نہیں مانوں گی۔

پیٹر:۔ اچھا، تو چلو میں تمہیں لفٹ سے، نیچے تک چھوڑ آؤں۔

جولیا:۔ نہیں، تم یہیں ٹھیرو اور ایڈورڈ سے باتیں کرو۔ میں ابھی اتنی محتاج نہیں ہوئی۔ اور اسکے علاوہ میں اس مشین کو خود چلانا پسند کرتی ہوں ۔۔ لفٹ کے اندر میں کچھ غور وفکر کرلیتی ہوں۔ اچھا، تو خدا حافظ۔ اور شکریہ۔ تم دونوں کا ۔۔ بہت بہت شکریہ۔

(چلی جاتی ہے)

پیٹر:۔ مجھے امید ہے، میں تمہیں پریشان نہیں کر رہا ہوں، ایڈورڈ۔

ایڈورڈ:۔ پریشان تو میں پہلے ہی کیا جا چکا ہوں! اور میں ذرا تنہائی چاہتا تھا۔ مگر خیر، معاملہ کیا ہے؟

پیٹر:۔ میں تمہاری مدد چاہتا ہوں۔ میں تمہیں ٹیلی فون کرنے والا تھا اور پھر کچھ دیر کے بعد آکر ملنے کی کوشش کرتا۔ مگر پھر یہ موقع نکل آیا۔

ایڈورڈ:۔ اور تمہاری پریشانی کیا ہے؟

پیٹر:۔ آج شام کو میں نے محسوس کیا کہ اب زیادہ عرصہ میں برداشت نہیں کرسکتا۔ اُف، وہ منحوس پارٹی! ایڈورڈ، مجھے معاف کرنا۔ پارٹی تو بیشک بہت ہی عمدہ تھی۔ سبھی لوگوں کے لئے سوائے میرے۔ اور اس میں تمہاری کوئی خطا تھی بیا نہیں سمجھتا کہ تم حالات کو بھانپ گئے تھے۔

ایڈورڈ:۔ میں نے ایک دو چیزوں کو محسوس ضرور کیا تھا لیکن میں اس مغالطہ میں نہیں ہوں کہ

مجھے ہر چیز کا پتہ لگ چکا تھا۔

ٹر :۔ اچھا ہوا۔ میں خوش ہوں کہ تم نے کچھ نہیں دیکھا۔ میں نے شاید اس سے بھی بہتر رکھ رکھاؤ کیا جیسا کہ میں نے سوچا تھا۔ اگر تم اسے بھانپ نہ سکے، تو میں سمجھتا ہوں کہ دوسروں نے بھی کچھ محسوس نہیں کیا ہوگا۔ البتہ میں جولیا شل کفویلے کی طرف سے ذرا خوف زدہ ہوں۔

ورڈ :۔ جولیا کی قوتِ مشاہدہ واقعی تیز ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت اسکے ذہن پر کوئی اور مسئلہ تھا۔

یٹر :۔ معاملہ دراصل سیلیا کا ہے۔ میرا اور سیلیا کا۔

ورڈ :۔ وہ کیسے۔ تمہارے اور سیلیا کے درمیان کیا معاملہ ہو سکتا ہے؟ کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم دونوں کے درمیان کوئی چیز مشترک بھی ہے؟

یٹر :۔ مجھے تو یوں لگتا تھا کہ ہم دونوں میں بہت سی چیزیں ایک سی ہیں۔ ہم دونوں فنکار ہیں۔

ورڈ :۔ میں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ وہ کون سے فن ہیں جن میں آپ لوگ مشغول ہیں۔

یٹر :۔ آپ نے میرا ناول تو نہیں دیکھا ہوگا، حالانکہ اس پر بعض بہت اچھے تبصرے ہوئے تھے۔ مگر اس سے زیادہ سینیما ہے جس سے ہم دونوں کو دلچسپی ہے۔

ورڈ :۔ متحرک تصاویر میں یکساں دلچسپی اکثر جوان لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آتی ہے۔

یٹر :۔ اب تم تو محض طنز پر اتر آئے ہو۔ سیلیا کو واقعی فلم کے فن میں گہری دلچسپی ہے۔

ورڈ :۔ کیا پیشہ کے امکان کے مدنظر؟

پیٹر :۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہی پیشہ اختیار کر لے! حالانکہ اس کے پاس شاعری کا فن بھی موجود تھا۔

ایڈورڈ :۔ ہاں، میں نے اس کی شاعری دیکھی ہے ـــــ بڑی دلچسپ ہو سکتی ہے اگر کسی کو سیلیا سے بھی دلچسپی ہو۔ یہ بات، یقین جانو، کہ میں اسکے ادبی معیار سے علیحدہ کہہ رہا ہوں، جس کو پرکھنے کا میں مجاز نہیں ہوں۔

پیٹر :۔ ٹھیک ہے، مگر میں تو اسے پرکھ سکتا ہوں، اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ بہت ملند ہے۔ لیکن بات یہ نہیں ہے۔ بات تو یہ ہے کہ میرا خیال تھا کہ ہم دونوں میں بہت کچھ باتیں یکساں ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا خیال بھی یہی تھا۔

ایڈورڈ :۔ تمہاری اس سے ملاقات کیسے ہوئی؟

(الکز داخل ہوتا ہے)

الکز :۔ ارے ایڈورڈ، تم مجھے مل ہی گئے! معلوم ہے میں کیوں آیا ہوں؟

ایڈورڈ :۔ الکز، پہلے تو میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم اندر داخل کیسے ہوئے؟

الکز :۔ کیوں۔ میں جب آیا تو دروازہ کھلا ہوا پایا اور سوچا کہ اندر آ کر جھانک لوں کہ کوئی تمہارے ساتھ ہے یا نہیں۔

پیٹر :۔ جولیا کھلا چھوڑ گئی ہو گی۔

ایڈورڈ :۔ خیر، کوئی بات نہیں بشرطیکہ جب تم دونوں باہر جاؤ تو اسے بند کر دینا۔

الکز :۔ ہاں، مگر تم تو میرے ساتھ آ رہے ہو، ایڈورڈ۔ میں نے سوچا، شاید ایڈورڈ آج شام بالکل اکیلا ہو اور مجھے معلوم ہے کہ اسے شام کو تنہا رہنا بہت ناگوار گذرتا ہے اس لئے تمہیں ساتھ باہر چلنا اور شام کا کھانا کھانا ہے۔

ایڈورڈ :۔ تمہارے اس طرح سوچنے پہ بہت ممنون ہوں الکز، لیکن آج کی شام میں تنہا ہی رہنا چاہوں گا۔

الکز :۔ مگر کھانا تو بہر حال تمہیں کھانا ہی ہے۔ کہیں باہر جا رہے ہو؟ یہاں کوئی آدمی ہے جو تمہارے لئے کھانا لائے؟

ایڈورڈ :۔ نہیں، مجھے کچھ زیادہ خواہش بھی نہیں ہے۔ اور میں خود کچھ لے لوں گا۔

الکز :۔ خوب! اگر یوں ہے تو پھر مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔ بس تمہیں ایک حیرت انگیز

چیز دکھانے والا ہوں: تمہیں معلوم ہے، میں خاصا مشہور باورچی ہوں۔ میں یہاں سے سیدھا تمہارے باورچی خانے کی طرف جا رہا ہوں۔ اور تمہارے لئے ایک اچھا سا کھانا پکا کر لا رہا ہوں۔ جو تم اکیلے کھا لینا۔ اسکے بعد ہم یہاں سے چل دیں گے۔ تب تک تم پیٹر سے باتیں کر لو۔ میں بالکل مخل نہ ہوں گا۔

ایڈورڈ :۔ میرے عزیز الکز، نعمت خانہ میں تمہارے پکانے کے لائق تو کوئی چیز نہیں ہوگی میں تو اسکے متعلق سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

الکز :۔ کوئی بات نہیں۔ اور یہی تو میری خاص مہارت ہے کہ کوئی چیز سلیقہ کی موجود نہ ہو پھر بھی چبانے کے قابل کھانا تیار کر لیتا ہوں۔ کوئی باسی واسی ٹکڑے مل جائیں تو کافی ہے۔ میں نے یہ چیز مشرق میں سیکھی تھی۔ مٹھی بھر چاول ہوں اور تھوڑی سی خشک مچھلی ہو تو میں درجنوں کھانے تیار کر سکتا ہوں۔ اب کچھ مت کہو۔ میں ایک دم شروع کئے دیتا ہوں۔

(باورچی خانہ کی طرف چلا جاتا ہے)

ایڈورڈ :۔ اچھا، تم نے بات کہاں کاٹ دی تھی؟

پیٹر :۔ تم نے پوچھا تھا کہ سیلیا سے میری ملاقات کیسے ہوئی۔ سال بھر پہلے، میں اس سے یہیں پر ملا تھا۔

ایڈورڈ :۔ لیونیا کی ہر جمعرات پر منعقد ہونے والی کسی طفلانہ محفل میں؟

پیٹر :۔ ہاں، ایک جمعرات کو۔ تم اسے طفلانہ کیوں کہتے ہو؟

ایڈورڈ :۔ لیونیا کی سیلون (SALON) قائم کرنے کی کوششیں طفلانہ ہی تو تھیں، جہاں مہمانوں میں چھوٹے لوگوں کی خاطر تواضع مجھے کرنی پڑتی تھی۔ اور ناکارہ لوگوں اور لیونیا کی لغزشوں سے مجھے نمٹنا پڑتا تھا۔ لیکن تم بھی تو اس کی چھوٹی کامیابیوں میں سے ایک تھے۔ کم از کم تھوڑے عرصہ کے لئے تو تھے!

پیٹر :۔ میں یہ کبھی نہیں کہوں گا۔ مگر ہاں، لیونیا مجھ پر بہت مہربان تھی۔ اور اس کے لئے میں اس کا مرہونِ منت ہوں۔ اور پھر سیلیا سے میری ملاقات ہوئی۔ زندگی بھر جن

لڑکیوں سے میں مل چکا تھا، وہ ان سب سے مختلف تھی۔ اور اس موقع پر تو اس سے گفتگو کرنا بھی آسان نہ تھا۔

ایڈورڈ:۔ کیا تم اس سے اکثر ملتے رہتے تھے؟

(الکز کی آواز سنائی دیتی ہے)

ایڈورڈ، تمہارے ہاں دو چولہوں والا بائلر ہے؟

ایڈورڈ:۔ میرے خیال میں دو چولہوں والا بائلر ضرور ہوگا: کیا ہر باورچی خانے میں نہیں ہوا کرتا؟

(الکز کی آواز)

مجھے تو نہیں مل رہا۔ لو، ایک حیرت انگیز چیز تو گئی ہاتھ سے۔ اب دوسری سوچنی پڑے گی۔

پیٹر:۔ کچھ زیادہ نہیں ملتے تھے ہم۔ اور جب میں اس سے ملتا تھا تو بات چیت کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

ایڈورڈ:۔ تم اور سیلیا مختلف مقاصد کے لئے بلوائے جاتے تھے۔ تمہارا کردار لیوتیا کی ایک نئی دریافت کی حیثیت رکھتا تھا اور سیلیا، اونچی سوسائٹی اور فیشن مہیا کرنے کے لئے بلائی جاتی تھی۔ لیوتیا کا نصب العین ہمیشہ سے یہی تھا کہ وہ اپنے لئے بہ یک وقت دو دنیاؤں میں مقام پیدا کرے ــــ لیکن ان دونوں کے درمیان حلقۂ زنجیر بننا اس کے لئے لازمی تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وجہ تھی کہ اس کی جمعرات والی محفلیں ناکام ہوگئیں۔

پیٹر:۔ تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے اب سب کچھ ختم ہو چکا۔

ایڈورڈ:۔ ارے نہیں نہیں بلکہ ہر چیز ادھوری رہ گئی ہے۔ خیر، مگر تم نے یہ ابھی تک نہیں بتایا کہ سیلیا سے تمہاری جان پہچان کیسے ہوئی؟

پیٹر:۔ چند دن بعد میں نے اسے ایک "کنسرٹ" میں دیکھا تھا، وہ اکیلی تھی۔ اور میں بھی اکیلا تھا، میں کنسرٹ میں ہمیشہ اکیلا جایا کرتا ہوں ــــ پہلے تو، اس لئے کہ ساتھ جانے والا کوئی نہ تھا، اور بعد میں، میں نے محسوس کیا کہ اکیلے جانا ہی بہتر ہے لیکن سیلیا جیسی لڑکی

جس کو میں محض اونچی سوسائٹی کے کالم میں ایک نام کی حیثیت سے جانتا تھا ــــ اسکو وہاں تنہا دیکھنا بڑی حیرت انگیز بات معلوم ہوتی تھی۔ خیر، ہم دونوں باتیں کرنے لگے اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ بھی کنسرٹ یا فلم دیکھنے اکیلے ہی جایا کرتی ہے۔ چنانچہ ہم اسی طرح ملتے رہے یا کبھی کبھار ساتھ چلے جایا کرتے تھے۔ اور سیلیا کا ساتھ ہونا، خلوت یا جلوت کی کیفیتوں سے ایک مختلف سی کیفیت تھی۔ اور بعض ہم چائے بھی ساتھ پیتے تھے اور ایک یا دو مرتبہ کھانا بھی ساتھ کھالیا تھا

ایڈورڈ:۔ اور اسکے بعد اس نے کبھی تمہاری ملاقات اپنے خاندان یا کسی دوست سے کرائی؟

پیٹر:۔ نہیں، مگر ایک دو مرتبہ ان کا اور ان میں انٹلیکچوئل دلچسپیوں کے نہ ہونے کا ذکر ضرور کیا تھا۔

ایڈورڈ:۔ اور اسکے بعد کیا ہوا؟

پیٹر:۔ کچھ بھی نہیں ــــ لیکن میں یہ سوچنے لگا تھا کہ اسکو سچ مچ مجھ سے وابستگی ہو گئی ہے۔ اور جب ہم ساتھ ہوتے تو مجھے بہت مسرت محسوس ہوتی تھی ــــ میں اتنا .... مطمئن، اتنا .... پُرسکون محسوس کرتا تھا کہ بیان نہیں کر سکتا، میں نے ایسی پُرسکون مسرت کا کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ اس سے پہلے تو میرے پاس صرف وارفتگی، مدہوشی اور کسی کو حاصل کر لینے کے احساس کا تجربہ تھا۔ وہ بڑی عجیب بات تھی۔ کتنا .... پُرسکون ٹھہراؤ تھا یہ ....

ایڈورڈ:۔ اور اس دلچسپ تعلق کو کس نے روک دیا؟

(الکز اندر داخل ہوتا ہے۔ اس کی قمیص کے بازو اور ایپرن نمایاں نظر آتے ہیں)

الکز:۔ ایڈورڈ، مجھے کوئی کری پاؤڈر نہیں مل رہا۔

ایڈورڈ:۔ کری پاؤڈر نہیں ہے۔ لیونیا کو کری سے نفرت ہے۔

الکز:۔ ایک اور حیرت انگیز چیز کا قصہ تمام ہوا۔ اب مجھے سوچنا پڑے گا۔ آم ملنے کی امید تو مجھے شروع سے نہیں تھی۔ لیکن کری پاؤڈر کے موجود ہونے کا مجھے یقین تھا (چلا جاتا ہے)

پیٹر :۔ یہی تو میں بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں ۔ وہ تو ایسے دھندلا کر ــــ کسی اور تصویر میں گم ہوگئی ہے ــــ جیسے فلم کے تاثر میں ہوتا ہے ۔ وہ مجھ سے ملنا بھی نہیں چاہتی، بہانے کرتی ہے، ایسے بہانے جو قابلِ اعتبار نہیں ہوتے، اور جب میں اس سے ملتا ہوں تو وہ ایک ایسی پر اسرار وارفتگی میں مصروف نظر آتی ہے، جس میں میں شریک نہیں ہوسکتا۔

ایڈورڈ :۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس کو محض تمہاری ذات سے دلچسپی جاتی رہی ہے۔

پیٹر تم اسے غلط انداز میں بیان کر رہے ہو۔ اس کے متعلق میرا اپنا خیال مختلف ہے۔ مجھ کو اپنی ذات سے اسکی دلچسپی ہٹ جانے کا اتنا دکھ نہیں ہے ــــ جتنا کہ ان لمحوں کی محرومی کا، جن میں ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے ہم دونوں کسی مشاہدہ ، کسی احساس کسی ناقابلِ بیان تجربہ میں برابر کے شریک تھے اور جن میں ہم دونوں کو خود اپنے وجود کا کوئی علم نہ تھا۔ تمہارے الفاظ میں، شاید، یہی میری ذات سے اس کی دلچسپی کا ختم ہونا ہے۔

ایڈورڈ :۔ یہ سب باتیں تو بالکل نارمل ہیں۔ کاش کہ تم جان سکتے کہ تم کتنے خوش قسمت ہو! ذرا سے وقفہ کے بعد، یہ بھی دوسری وابستگیوں کی طرح ایک معمولی وابستگی بن جاتی۔ جب جذبات کی تیزی ماند پڑ جاتی، تو تمہیں محسوس ہو جاتا کہ وہ ایک اور عورت تھی اور تم ایک اور مرد تھے ۔ میں تمہیں عین موقع پر بچ نکلنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

پیٹر :۔ مجھے اپنی مبارک باد سے معاف ہی رکھو تو بہتر ہے ۔ میرے لئے کسی سے یہ بات کرنا ضروری تھا۔ اور میں تم سے ایک حقیقی چیز بیان کر رہا تھا ــــ حقیقت سے دوچار ہونے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا اور شاید آخری بھی۔ اور آپ ہیں کہ اسے سمجھتے نہیں۔

ایڈورڈ :۔ میرے عزیز پیٹر، میں تو تمہیں صرف یہ بتلا رہا تھا کہ سیلیا کے ساتھ، آئندہ چھ ماہ میں، تم پر کیا گذرتی۔ صورتِ حال یہی ہے ۔ تم چاہے تسلیم کرو یا نہ کرو۔

پیٹر:۔ لیکن اب میں کروں کیا؟
ایڈورڈ:۔ کچھ بھی نہیں۔ انتظار کرو۔ کیلی فورنیا واپس چلے جاؤ۔
پیٹر:۔ مگر سیلیا سے میرا ملنا بہت ضروری ہے۔
ایڈورڈ:۔ کیا وہ ویسی ہی سیلیا ہوگی؟ بہتر یہ ہے کہ تم اسی سیلیا سے مطمئن رہو جس کی یاد تمہارے پاس باقی ہے۔ یاد رکھنا! میں نے کہہ دیا ہے کہ یہ ابھی سے محض ایک یاد بن چکی ہے۔
پیٹر:۔ مگر میں اس سے اس لئے ضرور ملوں گا کہ وہ مجھے اپنے الفاظ میں یہ تو بتا دے کہ آخر ہوا کیا؟ جب تک میں یہ نہیں معلوم کر لیتا، مجھے خود اس یاد کی صداقت معلوم نہ ہو سکے گی۔ کیا ہم دونوں حقیقتاً ان دلچسپیوں میں برابر کے شریک تھے؟ جب ہم کوئی موسیقی سنتے تھے، یا تصویریں دیکھتے تھے، تو کیا ہم ان دلچسپیوں میں حقیقتاً ایک دوسرے کے ساتھ شریک تھے؟ کوئی چیز حقیقی ضرور تھی۔ لیکن حقیقت کیا ہے......

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

ایڈورڈ:۔ میں ابھی آیا۔ (ٹیلی فون میں) ہیلو!..... میں اس وقت بات نہیں کر سکتا ..... ہاں، ہے..... اچھا، میں تمہیں جتنا جلد ہو سکا ٹیلی فون کروں گا۔
(پیٹر سے) بھئی معاف کرنا۔ ہاں تو تم کہہ رہے تھے کہ؟
پیٹر:۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ دو غیر حقیقی افراد کے مابین ایک ہی تجربے کی حقیقت کیا ہے؟ اگر میں یاد کو سہارا بنا سکوں، تو میں ہر طرح کے مستقبل کو جھیل سکوں گا۔ لیکن مجھے، اسی یاد کی خاطر، ماضی کی صداقت کو معلوم کرنا ہوگا۔
ایڈورڈ:۔ کوئی یاد ایسی نہیں ہے جسے کافور میں لپیٹ کر رکھ دیا جائے اور اس میں کیڑے نہ لگیں۔ تو تم سیلیا سے ملنا چاہتے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہیں اس احمق پن سے جو تم میں ہے، بچا لینے کی زحمت کیوں اٹھا رہا ہوں۔ تم کیا چاہتے ہو کہ میں کیا کروں۔

پیپرٹ :۔ تم میری خاطر سیلیا سے مل لو۔ تم اسے مجھ سے مختلف انداز سے جانتے ہو۔ اور پھر تم
عمر میں بھی اتنے بڑے ہو۔

ایڈورڈ :۔ عمر میں اتنا بڑا ہوں؟

پیپرٹ :۔ ہاں، مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری بات، کسی غیر جانب دار شخص کی حیثیت سے
توجہ سے سنے گی۔

ایڈورڈ :۔ اچھا، میں سیلیا سے مل لوں گا۔

پیپرٹ :۔ شکریہ، ایڈورڈ۔ تمہارا بڑا احسان ہوگا۔

(الکز، کوٹ پہنے ہوئے، داخل ہوتا ہے)

الکز :۔ ارے ایڈورڈ، میں نے تمہارے لئے کیا زبردست چیز پکائی ہے! میں سمجھتا ہوں کہ
درحقیقت میرے تمام کارناموں میں یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ کچھ بھی نہیں سے
بنا ڈالنا! ایسا کارنامہ تو میں نے کبھی ــــ البانیہ کی سیاحت کے دوران بھی ــــ
انجام نہیں دیا کہ اتنی کم چیزوں سے، جو مجھے تمہارے ریفریجریٹر سے مل سکیں، اتنا
رات کا کھانا تیار کر لیا۔ البتہ یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ آدھے درجن انڈے
گئے تھے۔

ایڈورڈ :۔ کیا! تم نے سب کے سب انڈے استعمال کر دیئے! لیونیا کی خالہ نے دیہات
سے بھیجے تھے۔

الکز :۔ اچھا! تو وہ خالہ واقعی وجود رکھتی ہیں۔ یہ ثبوت کافی ہے۔

ایڈورڈ :۔ نہیں نہیں .... میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک دوسری خالہ ہیں۔

الکز :۔ میں سمجھ گیا۔ یہ حقیقی خالہ ہیں۔ بہر حال تم میرے بہت شکرگذار ہوگے۔ تم جو کھانا
کھاؤگے وہ ماتی نیگرو گاؤں کے دیہاتی لوگوں میں بہت کم لوگ آج کل کھا
سکتے ہیں۔

ایڈورڈ :۔ مگر اب میرے ناشتے کا کیا ہوگا؟

الکز :۔ تم ناشتے کی فکر نہ کرو۔ تمہارے لئے صرف بغیر دودھ کی کافی کا ایک پیالہ اور

خشک روٹی ہی کافی ہوگی۔ میں نے اُسے ابلتا چھوڑ دیا ہے۔ اب اسے دس منٹ سے زیادہ چڑھائے مت رکھنا۔ اچھا، اب میں چلوں گا۔ اور ہیپبرٹ کو بھی ساتھ لیکر جاؤں گا۔

ہیپبرٹ :۔ ایڈورڈ، بھئی بہت وقت لے لیا تمہارا، اور تم تنہائی بھی چاہتے ہو۔ میری طرف سے لیونیا کو، جب واپس آجائے، سلام عرض کر دینا ..... مگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو، تو میں یہ چاہوں گا کہ جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے اس کا ذکر اس سے نہ کرنا۔

ایڈورڈ :۔ ہاں، میں لیونیا سے اس کے متعلق کوئی ذکر نہیں کروں گا۔

ہیپبرٹ :۔ بہت شکریہ، ایڈورڈ۔ شب بخیر۔

ایڈورڈ :۔ شب بخیر ایڈورڈ۔ شب بخیر الکز۔ ارے سنو، اگر زحمت نہ ہو تو از راہ کرم باہر جاتے وقت دروازہ اس طرح بند کر کے جانا کہ کنڈی لگ جائے۔

الکز :۔ یاد رکھنا، ایڈورڈ، دس منٹ سے زیادہ نہیں۔ اگر بیس منٹ گذر گئے تو میرے کارنامہ کا ستیاناس ہو جائے گا۔

(الکز اور ہیپبرٹ باہر چلے جاتے ہیں)

ایڈورڈ ٹیلی فون اٹھاتا اور نمبر گھماتا ہے۔

ایڈورڈ :۔ مس سیلیا کوپل سٹون ہیں؟ ..... کتنی دیر ہوئی ..... نہیں، رہنے دیجئے۔

پردہ

سین (۲)

دہی کمرہ: پندرہ منٹ کے بعد۔ ایڈورڈ تنہا ہے اور تاش کے پتوں سے پیشنس کھیل رہا ہے۔ دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے۔ اور وہ اٹھ کر دروازہ کی جانب بڑھتا ہے۔

سیلیا کی آواز:۔ کیا اکیلے ہو؟ (ایڈورڈ، سیلیا کے ساتھ واپس آتا ہے)

ایڈورڈ:۔ سیلیا، تم واپس کیوں آئی ہو؟ میں نے کہہ دیا تھا کہ جتنا جلد ہو سکا، میں ٹیلی فون کروں گا: ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ میں نے تم سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

سیلیا:۔ اگر تمہارے ساتھ کوئی اور ہوتا، تو میں کہتی کہ میں اپنی چھتری لینے کے لئے واپس آئی تھی ..... یوں لگ رہا ہے جیسے مجھے دیکھ کر تمہیں کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ ایڈورڈ، میں جانتی ہوں کہ کیا ہوا ہے، مگر ٹیلی فون پر تمہارا رویہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ انداز تمہارا بالکل نہیں تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ مجھے تم سے ضرور مل لینا چاہیئے۔ بس اتنا کہہ دو کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ پھر میں واپس چلی جاؤں گی۔

ایڈورڈ:۔ مگر یہ تم کیسے کہتی ہو کہ تم سمجھ گئی ہو کہ کیا ہوا ہے؟ مجھے خود معلوم نہیں کہ کیا ہو گیا ہے یا کیا ہونے والا ہے! اور اسے سمجھنے کی کوشش کرنے کے لئے میں تنہائی چاہتا ہوں۔

سیلیا:۔ میرے خیال میں، تو بات بہت ہی آسان اور واضح ہے۔ لیونیا تمہیں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

ایڈورڈ:۔ ہاں، حالات کا رخ یہی تھا۔ میرے خیال میں بات سب لوگوں پر خاصی واضح ہو چکی تھی۔

سیلیا:۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ خالہ والی بات تو خالص تمہاری ایجاد تھی جو عین موقع پر تم نے گھڑلی تھی۔ لیکن ایجاد کچھ موزوں نہیں تھی۔ خاص طور پر جولیا کے لئے تو تمہیں کوئی بہتر ترکیب سوچنی چاہیئے تھی! خیر، دراصل اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کو بہت جلد پتہ تو ویسے ہی چل جائے گا۔ کیا اس سے ہماری تمام مشکلات حل نہیں ہو جاتیں؟

ایڈورڈ:۔ اس سے حقیقی مشکلات تو اور کھل کے سامنے آگئی ہیں۔

سیلیا:۔ مگر میرے خیال میں تو یہ سب، بالکل وقتی چیزیں ہیں۔ تم جانتے ہو کہ ہما

حالات کو پہلے ہی قبول کر چکی ہوں، کیونکہ طلاق کی وجہ سے تمہارا مستقبل تباہ ہو جائے گا! اور ہم دونوں یہی سوچتے تھے کہ لیونیا تمہیں چھوڑنا قطعاً پسند نہیں کرے گی۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ تم اس احمقانہ روایت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے کہ صرف شوہر ہی کو طلاق ملنی چاہیئے؟ اور پھر اگر وہ یہی چاہتی ہے کہ تمہیں اسکے اسباب مہیا کرے تو ......

ایڈورڈ:۔ ٹھیک ہے۔ مگر معاملہ کی یہ نوعیت بالکل نہیں ہے۔ لیونیا واپس آرہی ہے۔

سیلیا:۔ لیونیا، واپس آرہی ہے! کیا تمہارا مقصد یہ ہے کہ اسنے ہمارے لئے کوئی جال بچھایا ہے۔

ایڈورڈ:۔ نہیں۔ اگر کوئی جال بچھایا گیا ہے، تو ہم سب اس میں پھنس جاتے ہیں۔ وہ ہم نے خود اپنے لئے بچھایا ہے مگر مجھے یہ معلوم نہیں کہ یہ جال ہے کس قسم کا۔

سیلیا:۔ پھر کیا ہوا۔

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

ایڈورڈ:۔ لعنت ہے اس ٹیلی فون پر۔ میرا خیال ہے، بات کرلوں تو اچھا ہے۔

ہیلو..... جی، ہیلو ...... نہیں۔ میرا مقصد ہے ہاں، الکز! ہاں، بیشک ..... بہت عمدہ تھا۔ میں نے ویسی چیز، کبھی چکھی تک نہیں..... ہاں، ہے تو دلچسپ، مگر مجھے یہ خیال ہے کہ کہیں اسے ہضم کرنا مشکل نہ ہو جائے۔ ..... ارے نہیں، الکز، میرے لئے پنیر لانے کی زحمت نہ کرنا! میرے پاس تھوڑا سا پنیر پڑا ہوا ہے ..... نہیں، نادرے کا نہیں ہے..... مگر مجھے اصل میں پنیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے ..... سلیپر؟ کیا چیز! ..... اچھا، یوگوسلاویہ کے ..... آڑو اور شراب؟ نہیں، الکز، میری بات مانو، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس وقت بہت تھکا ہوا ہوں۔ بہت بہت شکریہ، الکز۔ شب بخیر۔

سیلیا:۔ کیا تھا آخر؟

ایڈورڈ:۔ الکز تھا۔

سیلیا :۔ مجھے معلوم ہے کہ الکز تھا۔ مگر کہہ کیا رہا تھا؟

ایڈورڈ :۔ میں بالکل بھول گیا تھا۔ تھوڑی دیر ہوئی، وہ یہاں آ پہنچا تھا۔ اور میرے رات کے کھانے کے لئے کوئی چیز پکانے کے لئے اصرار کرنے لگا! اور اسنے یہ بھی کہا تھا کہ دس منٹ کے اندر اسے ضرور کھالوں۔ میرے خیال میں وہ ابھی تک پک رہی ہے۔

سیلیا :۔ تمہارا خیال ہے کہ ابھی تک پک رہی ہے! میں حیران تھی کہ یہ عجیب سی بو کیسی آ رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ابھی تک پک ہی رہی ہے ــــ یا اور کچھ ہو رہا ہے۔ میں جا کر دیکھ لوں تو اچھا ہے

(جانے کے لئے اٹھتی ہے)

ایڈورڈ :۔ ارے، خدا کے لئے، تم تکلیف نہ کرو۔ (سیلیا چلی جاتی ہے)
اگر کوئی آجائے اور تمہیں باورچی خانہ میں دیکھ لے تو؟

(ایڈورڈ میز کی جانب آکر اپنے پیشنس، کھیل کے پتوں کو دیکھتا ہے۔ ایک پتہ اور اٹھا کے رکھتا ہے۔ دروازے کی گھنٹی بار بار بجنے لگتی ہے۔ سیلیا، ایپرن پہنے، پھر داخل ہوتی ہے

سیلیا :۔ ایڈورڈ، بہتر یہی ہے کہ دیکھ لو کہ دروازے پہ کون ہے۔ اس سے بہتر اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ اپنے ہوش و حواس نہ کھو بیٹھنا۔ تم جانتے ہو، میں واقعی اپنی چھتری بھی تو بھول گئی تھی، اور میں یہ کہوں گی کہ تم بھوکے اور مجبور سے بیٹھے تھے، میں نے کچھ انتظام کرنا ضروری سمجھا۔ بہرحال میں یہیں رہوں گی اور کسی سے چھپنے کی کوشش نہیں کروں گی۔

(باورچی خانہ کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ گھنٹی پھر بجتی ہے ۔ ایڈورڈ باہر کے دروازے کی طرف جاتا ہے اور اس کی آواز سنائی دیتی ہے:)

جولیا! تم پھر کیوں واپس آگئیں؟ (جولیا داخل ہوتی ہے)

جولیا :۔ مجھ پر ایک کشف ہوا ہے!

(سیلیا ایک کڑاہی لئے داخل ہوتی ہے)

سیلیا:۔ ایڈورڈ، یہ تو بالکل ستیاناس ہو گئی!

ایڈورڈ:۔ بڑا اچھا ہوا۔

سیلیا:۔ مگر اس سے تو کڑاہی بھی خراب ہو گئی۔

ایڈورڈ:۔ اور اسکے ساتھ چھ انڈے بھی: مجھے ناشتہ کے لئے ایک انڈا چاہئے تھا۔ ابلا ہوا انڈا۔ یہی ایک چیز ہے جو میں پکانا جانتا ہوں۔

جولیا:۔ سیلیا، تم پر بھی وہی کشف ہوا ہے جو مجھ پر ہوا۔ ایڈورڈ کو کچھ کھلوانا بہت ضروری ہے۔ کتنا مضمحل ہے بیچارہ۔ ہمیں اس کی قوت کو برقرار رکھنا ہوگا۔ ایڈورڈ، تم یہ نہیں محسوس کرتے کہ تم کتنے خوش نصیب ہو کہ تمہارے لئے دو دو حاتم موجود ہیں۔ ایسی بات میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔

ایڈورڈ:۔ وہ شخص جو چوروں کے ہاتھ چڑھ گیا تھا، مجھ سے زیادہ خوش قسمت تھا: اسے ایک مسافرخانے میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

جولیا:۔ ایڈورڈ، تم کتنے ناشکرے ہو۔ اس کڑاہی میں کیا ہے؟

سیلیا:۔ کسی کو معلوم نہیں۔

ایڈورڈ:۔ یہ وہ چیز ہے جو الکز نے آ کر میرے لئے پکائی تھی۔ یہ وہی کر سکتا تھا۔ اب تو تین "حاتم" ہو گئے ——— میں اسے تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔

جولیا:۔ مگر تم اسے چھونا تک نہیں۔

ایڈورڈ:۔ ظاہر ہے، میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔

جولیا:۔ پیارے، مجھے چاہئے تھا کہ تمہیں خبردار کر دوں! الکز جو چیز بھی بناتا ہے، وہ انتہائی مہلک ہوتی ہے اس کے لوگوں کو زہر دینے کے کئی قصے بھی سنا سکتی ہوں۔ پیاری سیلیا، اب تم یہ ایپرن مجھے دے دو، اور دیکھو میں کیا کر سکتی ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو اور ایڈورڈ سے باتیں کرو۔ (جولیا چلی جاتی ہے)

سیلیا:۔ آخر ہوا کیا ہے، ایڈورڈ؟ کیا ہوا ہے؟

ایڈورڈ:۔ میرا خیال ہے کہ لیونیا واپس آرہی ہے۔
سیلیا:۔ یہ تمہارا خیال ہے؟ تم ٹھیک سے جانتے نہیں کیا؟
ایڈورڈ:۔ نہیں، مگر مجھے اس کا یقین ہے۔ وہ شخص جو یہاں تھا ـــــ
سیلیا:۔ ہاں، وہ شخص تھا کون؟ مجھے اس سے ڈر سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس میں ایک خاص قسم کی غیبی طاقت معلوم ہوتی تھی۔
ایڈورڈ:۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون ہے۔ لیکن جب تم سب لوگ یہاں سے چلے گئے، تو اس سے میری کچھ گفتگو ہوئی تھی ـــ اور وہ کہہ رہا تھا کہ وہ، لیونیا کو کل واپس لے آئے گا۔
سیلیا:۔ مگر وہ شخص اسے واپس لے آنا کیوں چاہے گا ـــ صرف ابلیس ہی یہ کر سکتا ہے۔ وہ کچھ ہے ایسا شخص کہ میں اسکے ابلیس ہونے پر یقین کر سکتی تھی۔
ایڈورڈ:۔ اس لئے کہ میں نے ہی اسے کہا تھا۔
سیلیا:۔ اس لئے کہ تم نے ہی اسے کہا تھا! پھر تو وہ ضرور ابلیس ہی ہوگا! اسنے تم پر جادو کر دیا ہوگا۔ مگر اس نے تمہیں لیونیا کو واپس بلوانے پر کیسے آمادہ کر لیا؟

(باورچی خانے سے پٹاخے کی سی آواز سننے میں آتی ہے)

ایڈورڈ:۔ ارے، یہ کیا بلا ہے؟

(جولیا ایپرن پہنے، ایک کشتی اور تین گلاس لئے پھر داخل ہوتی ہے)

جولیا:۔ مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے! یہاں کھانے کے قابل کوئی چیز موجود نہیں: میں ادھر نیچے دیکھ چکی ہوں۔ مگر مجھے کچھ شمپین مل گئی ـــ صرف ایک آدھی بوتل ہی ملی ہے، اور وہ بھی ٹھنڈی نہیں ہے۔ لیکن ہے بڑی مفرح! اور میں نے سوچا کہ اس تباہی کے بعد ہم سب کو کسی نشاط انگیز شے کی سخت ضرورت ہے۔ اب میں جامِ صحت تجویز کروں گی۔ بتا سکتے ہو کہ میں کس کی صحت کا جام تجویز کرنے والی ہوں؟
ایڈورڈ:۔ نہیں، میں تو نہیں بتا سکتا۔ مگر میں الکز کی صحت کا جام نہیں پیوں گا۔
جولیا:۔ ارے نہیں۔ الکز کے لئے نہیں ہے۔ چلو میں لیونیا کی خالہ کا نام تجویز کرتی ہوں۔ تمہیں

اس کا اندازہ لگا لینا چاہئے تھا!

ایڈورڈ اور سیلیا:- } لیونیا کی خالہ کے نام

جولیا:- اب دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا کرنا چاہئے۔ بڑی آسان بات ہے کسی ریسٹوران میں جانے کے لئے یا تو اب وقت نہیں رہا، یا بہت دیر ہو گئی ہے۔ تم دونوں کو میرے ساتھ میرے ہاں چلنا ہو گا۔

ایڈورڈ:- نہیں۔ مجھے تو معاف ہی رکھو، جولیا۔ میں اتنا تھکا ہوا ہوں کہ باہر جا نہیں سکتا اور پھر مجھے بھوک بالکل نہیں ہے۔ میں دو چار بسکٹ کھاؤں گا۔

جولیا:- اور تم، سیلیا؟ تم تو ضرور میرے ساتھ چلی چلو اور میرے ساتھ تھوڑا سا کھا لو ــــ بہت ہی ہلکا سا کھانا ــــ

سیلیا:- بہت شکریہ، جولیا۔ میں بھی سوچتی ہوں کہ چلی ہی چلوں۔ اگر تم اجازت دو تو میں تمہارے پیچھے دس منٹ کے بعد آ جاؤں۔ جانے سے پہلے، ایڈورڈ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔

جولیا:- لیونیا کے متعلق؟ اچھا، مگر جلدی آؤ۔ اور ٹیکسی لے لینا۔ دیکھو تو، بھوک کے مارے تمہارا بُرا حال ہو رہا ہے۔ شب بخیر، ایڈورڈ۔ (جولیا چلی جاتی ہے)

سیلیا:- ہاں تو اسنے تمہیں کس طرح آمادہ کر لیا۔

ایڈورڈ:- مجھے کس طرح آمادہ کر لیا؟ کیا واقعی اسنے مجھے آمادہ کر لیا تھا؟ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسنے مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ لیونیا کا چلا جانا ہی سب سے بہتر تھا اور مجھے تو شکر گذار ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اسکے باوجود اس کے دلائل کے اثر نے مجھ پر یہ واضح کر دیا کہ اسے واپس حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

سیلیا:- یہی ابلیس کا طریقہ ہے! تو آپ لیونیا کو واپس حاصل کرنا چاہتے ہیں! لیونیا! تو آپ کو اگر پرواہ ہے تو بس ایک چیز کی ــــ کہ رشتہ منقطع نہ ہو یا کوئی اور کوفت اٹھانی نہ پڑے! نہیں، یوں نہیں ہو سکتا۔ میں سوچنا بھی نہیں چاہتی کہ یہی بات

ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ محض اضمحلال سے شکست خوردگی کا ایک لمحہ ہے اور گھبراہٹ۔
مصیبت کا سامنا تم نہیں کر سکتے۔

ایڈورڈ:۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ صرف یہی بات نہیں ہے۔

سیلیا:۔ یہ محض خودداری کا سوال نہیں ہو سکتا: تم سوچتے ہو چونکہ تمہاری بیوی کسی اور شخص کی وجہ سے تمہیں چھوڑ کر چلی گئی ہے، اس لئے دنیا تم پہ ہنسے گی؟ تم اس بندھن سے آزاد ہو جاؤ، ایڈورڈ، پھر میں یہ سب کچھ ٹھیک کر لوں گی۔

ایڈورڈ:۔ نہیں، یہ بات بھی نہیں۔ یہ تمام دلائل اس شخص نے بیان کئے تھے جس کو میں رائلی نام دے رہا ہوں ___ حالانکہ اس کا نام رائلی نہیں ہے! یہ تو اس گانے میں ایک نام تھا، جو اسنے گایا تھا.....

سیلیا:۔ اسنے تمہیں رائلی نامی کسی شخص کے متعلق گانا گا کر سنایا! سچ مچ، ایڈورڈ، میرے خیال، تم تو پاگل ہو گئے ہو ___ میرا مطلب ہے کہ تم بالکل "نروس بریک ڈاؤن" کی حد پہ پہنچ گئے ہو۔ ایڈورڈ۔ اگر میں اب چلی جاؤں تو مجھ سے وعدہ کرو گے کہ تم ایک بہت بڑے ڈاکٹر سے ضرور مشورہ کرو گے؟ میں نے اس کی بہت شہرت سنی ہے ___ اور اس کا نام رائلی ہے!

ایڈورڈ:۔ اس مرض سے نجات پانے کے لئے تو کسی عظیم ترین ڈاکٹر سے بھی عظیم تر ڈاکٹر کی ضرورت ہو گی۔

سیلیا:۔ ایڈورڈ، اگر میں اس وقت چلی جاؤں تو کیا مجھے یہ یقین دلاؤ گے کہ سب کچھ ٹھیک ہے، کہ تم لیونیا کو دوبارہ حاصل کرنا نہیں چاہتے، کہ اس سے آزادی حاصل کرنا واقعی تمہارا مقصد ہے، کہ ہم دونوں کے درمیان سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے؟ یہی چیز اہمیت رکھتی ہے میں سچ کہتی ہوں، ایڈورڈ، اگر یہ ٹھیک ہے، تو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ باقی چیزیں بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔

ایڈورڈ:۔ نہیں، سیلیا۔ زندگی بڑی پُر کیف گذری، اور میں بہت شکر گذار ہوں، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم ایک لاثانی شخصیت ہو۔ مگر ہم بہت دیر میں ملے۔ مجھے ابتداء میں ہی

سمجھ لینا چاہئے کہ یہ تمہارے ساتھ انصاف نہیں تھا۔

سیلیا :۔ یہ میرے ساتھ انصاف نہیں ہے! یہ تم ہو جو مجھ سے انصاف کی باتیں کر رہے ہو!

ایڈورڈ :۔ اگر لیونیا چلی نہ گئی ہوتی، تو ایسی بات پیدا ہی نہ ہوتی۔ کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ اس بات کا مستقبل کیا ہو سکتا تھا؟

سیلیا :۔ میں نے کیا سوچا تھا کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا ـــ یہ مجھ سے پوچھتے ہو؟ مستقبل کو تو میں، ہمارے تعلقات بڑھنے سے قبل ہی، پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اور اسکے بعد میں ایک ایسے حال میں رہنے لگی، جہاں وقت بالکل بے معنی تھا، جہاں ہماری اپنی ایک نجی دنیا تھی جس میں لفظ "مسرت" کے معنی مختلف تھے۔ یا ہم یہی محسوس کرتے تھے۔

ایڈورڈ :۔ اس بات کو میں سن چکا ہوں۔

سیلیا :۔ ایک خواب تھا وہ۔ میں آج تک اسی میں خوش تھی۔ اور پھر جب جولیا نے لیونیا کے متعلق دریافت کیا اور میں سمجھ گئی کہ لیونیا تمہیں چھوڑ کر چلی گئی ہے اور اب تم آزاد ہو جاؤ گے ـــ تو اچانک مجھے معلوم ہوا کہ صرف خواب ہی کافی نہ تھا؛ اور یہ کہ میں اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی چاہتی تھی؛ میں منتظر تھی اور میں دوڑ کر تمہیں بتانا بھی چاہتی تھی۔ شاید خواب ہی بہتر تھا۔ وہی ایک مصدقہ حقیقت معلوم ہوتی تھی۔ اور اگر یہ حقیقت ہے، تو بالکل خواب کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ شاید میں خود اس تمام عرصہ میں اپنے خواب کو دھوکہ دیتی رہی۔ اور یہ احساس کہ میں یہ دنیا اور وہ دنیا دونوں حاصل کرنا چاہتی تھی ..... یوں بھی، بڑی شرمناک بات ہے۔

ایڈورڈ :۔ کوئی وجہ نہیں کہ تم ذلت محسوس کرنے لگو.....

سیلیا :۔ ہوں، یہ نہ سمجھ لینا کہ تم مجھے ذلیل کر سکتے ہو! تذلیل ـــ یہ تو ایسی چیز ہے جس کی میں خود ذمہ دار ہوں۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں آتا کہ تم اتنے حقیقی ہو کہ میری تذلیل کر سکو۔ میں جانتی ہوں کہ اکثر عورتیں اسے اپنی ہتک سمجھتی ہیں جب وہ یہ دیکھ لیتی ہیں کہ جس آدمی کے ساتھ انہوں نے زندگی کے چند حسین ترین لمحات گذارے

تھے، وہ آدمی انہیں محض ایک وقتی بہلاوا سمجھ رہا تھا۔ میں تو یہ کہنے کی جرأت کرتی ہوں کہ تم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے تھے۔ بلاشبہ، بالکل یہی تو بات تھی۔

ایڈورڈ:۔ میں نے تمہیں کبھی وقتی بہلاوے کی حیثیت نہیں دی۔ اگر تم وقتی بہلاوے کی باتیں کرنا چاہتی ہو، تو یہ بتاؤ کہ پیٹر کو تم نے کیا حیثیت دے رکھی تھی؟

سیلیا:۔ پیٹر؟ کون پیٹر؟

ایڈورڈ:۔ پیٹر کوئلپ، جو شام کو یہاں آیا ہوا تھا۔ وہ بھی تو ایک خواب میں مبتلا تھا اور اب وہ بہت دکھی اور بہت پریشان حال ہے۔

سیلیا۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ایڈورڈ، اپنی صفائی پیش کرنے کی خاطر، تم بہت اوچھی باتوں میں پناہ لینے کی کوشش کر رہے ہو۔ میرے اور پیٹر کے مابین کبھی کوئی چیز نہیں تھی۔

ایڈورڈ:۔ کوئی چیز نہیں تھی؟ وہ تو سمجھتا تھا کہ تھی۔ وہ آج شام کو اسی کے متعلق مجھ سے بات کرنے کے لئے یہاں واپس آیا تھا۔

سیلیا:۔ بڑی مضحکہ خیز بات ہے! میری طرف سے پیٹر کو ایسا کوئی موقع نہیں ملا کہ وہ یہ خیال کرے کہ میں اسے چاہتی تھی۔ میں یہ سمجھتی تھی کہ اس میں صلاحیت ہے؛ میں نے دیکھا کہ وہ اکیلا ہے، اور میں نے سوچا کہ میں اس کی مدد کر سکتی تھی۔ میں اسے کنسرٹوں میں لے جاتی تھی۔ مگر جب اس کی کافی لوگوں سے واقفیت ہو گئی۔ اس کے ساتھ میری دلچسپی بھی کم ہوتی گئی۔ اور وہ مجھے کچھ خود پسند سا بھی معلوم ہوا۔ لیکن ہم پیٹر کے متعلق گفتگو کیوں کریں؟ اس وقت تو ایک ہی بات سب سے اہم ہے اور وہ یہ کہ تمہارا خیال ہے کہ تم لیونیا کو حاصل کرنا چاہتے ہو۔ اور اگر تم اسی قماش کے آدمی ہو ــــ تو، تو پھر بہتر یہی ہے کہ تم اسے حاصل کر لو۔

ایڈورڈ:۔ بات یوں نہیں ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ مجھے لیونیا سے محبت ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کبھی اس سے محبت تھی۔ اگر میں نے کبھی کسی سے محبت کی ہے ــــ اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ضرور کی ہے ــــ تو تمہارے سوا کسی سے محبت نہیں کی، اور

شاید اب بھی کرتا ہوں۔ مگر یہ اسی طرح قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ کبھی ..... ایک مستقل چیز نہیں بن سکتی۔ تمہیں ایسا آدمی حاصل ہونا چاہیئے ..... جو عمر میں تم سے قریب تر ہو۔

سیلیا:۔ مجھے تمہارے مشورے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ایڈورڈ۔ اب میرے مستقبل میں دلچسپی لینے کا تمہیں کوئی حق نہیں پہونچتا۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنے مستقبل کو سنوارنے کے اہل بن سکو۔ لیکن اگر تمہیں لیونیا سے محبت نہیں ہے اور نہ کبھی تھی، توپھر تم چاہتے کیا ہو؟

ایڈورڈ:۔ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ایک چیز جو میں نسبتاً یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، وہ یہ ہے کہ آج میں اپنے آپ سے ایک ایسے ادھیڑ عمر کے آدمی کی حیثیت میں ملا ہوں، جسنے یہ سمجھنا شروع کیا ہے کہ بڑھاپے کا احساس کیا چیز ہے۔ وہ زندگی کا بدترین لمحہ ہے، جب ــــ قبل اس کے کہ آپ جس چیز کی تمنا کرسکتے ہوں اس پر قانع ہو جائیں، قبل اسکے کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ ابھی کیا کچھ قابلِ تمنا رہ گیا ہے ــــ آپ یہ محسوس کرنے لگیں کہ آپ اس چیز کے لئے اپنی تمنا کھو بیٹھے ہیں جو سب سے زیادہ قابلِ تمنا تھی۔ اور آپ یہی آس لگائے ہوئے ہوں کہ کاش آپ اس کی تمنا کرسکیں جب تمنا پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ مگر تم یہ باتیں سمجھ نہیں پاؤ گی۔ تم ــــ یہ کیسے سمجھ سکتی ہو کہ اپنے آپ کو بوڑھا محسوس کرنا کیا چیز ہے؟

سیلیا:۔ مگر میں تو تمہیں سمجھنا چاہتی ہوں۔ میں سمجھ بھی سکتی تھی۔ اور ایڈورڈ، یقین کرلو کہ میں تم سے نفرت کبھی نہیں کروں گی۔ مجھے صرف تمہارے حال پر افسوس ہوگا۔ مجھے صرف یہ خطرہ ہے کہ میں اپنی ذات سے نفرت کرنے لگوں گی۔ مگر تمہاری زندگی کیا ہوگی؟ اسکے متعلق سوچنا بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوسکتا۔ آہ۔ ایڈورڈ! کیا تم لیونیا کے ساتھ خوش رہ سکتے ہو؟

ایڈورڈ:۔ نہیں ــــ خوش نہیں رہ سکتا: یا اگر کوئی خوشی ہوگی، تو صرف یہ جاننے کی

خوشی ہو گی کہ عزم حسن کی تباہی سے پروان نہیں چڑھتا، کہ اکتاہٹ کیفیت وجدان کا نتیجہ نہیں ہے۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ میری زندگی بہت پہلے سے متعین ہو چکی تھی۔ اور اس سے فرار کی جد و جہد محض ایک وہم ہے۔ ایک ایسے ڈھونگ کی طرح ہے کہ جو ہے، وہ نہیں ہے یا یہ کہ اسے بدلا جا سکتا ہے۔ نفس، جو یہ کہتا ہے کہ 'مجھے یہ چاہئے ــــ یا وہ چاہئے' ــــ نفس جو ارادہ کرتا ہے ــــ وہ بہت ہی ضعیف مخلوق ہے۔ اور اسے آخر میں ایک ایسے ضدی، اور زیادہ قوی نفس سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے، جو کچھ نہیں بولتا، جو کبھی نہیں بولتا، جو کبھی محبت نہیں کر سکتا۔ اور جو بعض لوگوں میں ان کا محافظ فرشتہ ہو سکتا ہے ــــ مگر مجھ جیسے لوگوں میں وہ محض عامیانہ پن کی ایک بے حس، بدمزاج اور ناقابل تسخیر روح بن جاتا ہے۔ ارادہ کرنے والا نفس، اس بے ارادہ اشتراک کو برباد کرنے کی سازش تو کر سکتا ہے ــــ لیکن وہ پروان اسی وقت چڑھ سکتا ہے جب وہ اپنے سے زیادہ قوی شریک کا محکوم ہونا تسلیم کرلے۔

سیلیا:۔ مجھے یقین ہے، ایڈورڈ، کہ میں تمہیں سمجھ نہیں سکی۔ اور اسکے باوجود میں وہ کچھ سمجھتی ہوں، جو اس سے قبل میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میرا خیال ہے ــــ بلکہ مجھے یقین ہے ــــ کہ اب تم اپنی اصل شکل پر آگئے ہو، جو شکل اس سے قبل تم نے مجھ پہ کبھی ظاہر نہیں کی۔ جب سے میں تمہیں دیکھ رہی ہوں، اس دوران میں تم دو مرتبہ صورت بدل چکے ہو۔ میں نے تمہارے چہرے پر نظر ڈالی: اور میں سوچنے لگی کہ میں اس کے ہر ایک نقش کو اچھی طرح جانتی تھی اور میں ہر اس نقش سے پیار کرتی تھی؛ اور پھر جو میں نے دیکھا تو وہی چہرا مرجھا کر جھڑ گیا ــــ بالکل ایسے جیسے میں نے کسی ممی کے چہرے سے کفن ہٹا دیا تھا۔ میں تمہاری آواز پہ کان دھرے سن رہی تھی۔ وہ آواز جو ہمیشہ میرے دل میں تہلکہ مچا دیتی تھی، یکایک وہ آواز ایک دوسری آواز بن گئی ــــ نہیں، وہ آواز نہیں تھی: جو میں نے سنا وہ محض ایک کیڑے کا پیدا کردہ شور تھا، ایک نہ ختم ہونے والا، سوکھا، بے معنی، غیر انسانی شور ــــ جو تم نے ممکن ہے اپنی ٹانگوں کو

ایک دوسرے سے رگڑ کر پیدا کیا ہو ــــ یا اس طرح پیدا کیا ہو جس طرح ٹڈے پیدا
کرتے ہیں ۔ اور میں نے تمہارے دل، تمہارے خون کی گردش کو سننے کی کوشش کی ، لیکن
میں نے اس کی جگہ صرف انسانی قد و قامت کے برابر ایک کیڑا دیکھا جس کے اندر
وہی کچھ تھا جو ایک کیڑے کے اندر ہوتا ہے اور جو پیروں تلے کچلتے وقت اس کے اندر
سے برآمد ہوتا ہے ۔

ایڈورڈ :۔ شاید میں وہ ہی ہوں ۔ اگر تمہارا جی چاہے تو مجھے اپنے پیروں تلے کچل ڈالو ۔

سیلیا :۔ نہیں، میں تمہیں پیروں تلے نہیں کچلوں گی ۔ تم ویسے نہیں ہو ۔ میں تمہیں جو کچھ سمجھتی تھی
اور اس سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے، تم وہی چیز ہو ۔ میں ایک مختلف آدمی کو دیکھ رہی
ہوں، میری نظر میں تم اس وقت ایک ایسے شخص ہو، جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا ۔
جو آدمی میں نے پہلے دیکھا تھا، وہ ایک عکس تھا ــــ ایک ایسی چیز کا، جس کی مجھے ضرورت
تھی ــــ اب مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ یوں ہی ہے ــــ لیکن نہیں، وہ چیز نہیں،
جس کی مجھے ضرورت تھی ــــ بلکہ وہ چیز جسے حاصل کرنا میں اپنا نصب العین
بنا چکی تھی ــــ ایک ایسی چیز جس کے لئے مجھے بے پناہ آرزو تھی کہ وجود میں آجائے ۔
کہیں تو وہ وجود پائے گی ــــ مگر نہ معلوم وہ کیا ہے اور کہاں پہ ہے؟ ایڈورڈ،
مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں صرف تمہیں استعمال کر رہی تھی ۔ اور میں چاہتی ہوں کہ تم
مجھے معاف کر دو ۔

ایڈورڈ :۔ تم ..... مجھ سے کہہ رہی ہو کہ تمہیں معاف کر دوں !

سیلیا :۔ ہاں، دو باتوں کے لئے ۔ پہلی تو یہ .....

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

ایڈورڈ :۔ لعنت ہے اس ٹیلی فون پہ ۔ بہتر ہے کہ میں بات کر لوں !

سیلیا :۔ ہاں، بہتر ہے کہ بات کر لو ۔

ایڈورڈ :۔ ہلو ! ..... ارے جولیا : اب کیا چاہتی ہو؟ پھر وہی تمہاری عینک ..... کہاں
پہ رکھی ہے؟ کیا ایک بار اور بھی ..... مجھے پورے گھر میں اسے تلاش کرنا ہوگا؟

تم نے اپنے تھیلے میں بھی دیکھ لیا ہے ؟ ..... بہر حال، یوں چلا کر میرا سر کیوں کھا رہی ہو ..... تمہیں یقین ہے کہ باورچی خانہ میں رکھی تھی ؟ شمپین کی بوتل کے نزدیک ..... تمہیں پورا یقین ہے ؟ ..... بہت اچھا، جیسے تم چاہو، ٹیلی فون پر ہی ہنگامہ کر لو۔ ہم ..... میں دیکھے لیتا ہوں۔

سیلیا :۔ ہاں، تم ہی دیکھ لو۔ میں تمہارے باورچی میں پھر کبھی نہ جاؤں گی۔

(ایڈورڈ چلا جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر میں عینک اور ایک بوتل لئے واپس آتا ہے)

ایڈورڈ :۔ چلو، ایک مرتبہ تو وہ صحیح نکلی۔

سیلیا :۔ وہ ہمیشہ صحیح ہوتی ہے۔ مگر یہ شمپین کی خالی بوتل لانے کا مقصد ؟

ایڈورڈ :۔ یہ خالی نہیں ہے۔ شاید اس کا جوش ختم ہو گیا ہو ــــ مگر اسنے یہ کیوں کہا تھا کہ آدھی بوتل تھی۔ یہ میری بہترین شرابوں میں سے ہے: اور میرے پاس آدھی بوتلیں نہیں ہوتیں۔ خیر، میں یہ امید کر کے لایا ہوں کہ تم میرے ساتھ ایک آخری جام پی لو گی۔

سیلیا :۔ کس چیز کے نام پر پینی چاہیے ؟

ایڈورڈ :۔ کس کے نام پر پیئیں ؟

سیلیا :۔ محافظ فرشتوں کے نام پر۔

ایڈورڈ :۔ محافظ فرشتوں کے نام پر ؟

سیلیا :۔ ہاں، محافظ فرشتوں کے نام پر۔ تم ہی نے محافظوں کی بات کی تھی۔

(پینے لگتے ہیں)

ہو سکتا ہے کہ خود جولیا بھی ایک محافظ ہو۔ شاید وہ میری محافظ ہے۔ یہ عینک مجھے دو۔ شب بخیر، ایڈورڈ۔

ایڈورڈ :۔ شب بخیر ..... سیلیا۔ (سیلیا چلی جاتی ہے)

اُف (ایک جھٹکے سے ٹیلی فون کا رسیور اٹھا لیتا ہے)

ہو، جولیا! تم وہیں ہو؟ ..... مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے تمہیں اتنا انتظار کرایا! ..... مگر ہم ..... مجھے اسے ہر جگہ تلاش کرنا پڑا..... نہیں، میں نے ڈھونڈ لی ہے ..... ہاں، وہ اپنے ساتھ لا رہی ہے ..... شب بخیر۔

(پردہ)

سین (۳)

وہی کمرہ۔ ایک دن بعد۔ وقت سہ پہر۔ ایڈورڈ تنہا ہے۔ دروازہ کی گھنٹی سنکر، دروازہ کھولنے جاتا ہے۔

ایڈورڈ:۔ آہاہ ..... آداب عرض ہے (انجانا مہمان داخل ہوتا ہے)

انجانا مہمان:۔ آداب عرض ہے۔ مسٹر چیمبرلین۔

ایڈورڈ:۔ کہئے۔ آپ کو جن اور پانی پیش کردوں؟

انجانا مہمان: نہیں شکریہ۔ یہ موقع ذرا مختلف ہے۔

ایڈورڈ:۔ میرے خیال میں، چونکہ آپ اکیلے آئے ہیں، آپ کامیاب نہیں ہوئے۔

انجانا مہمان:۔ نہیں تو۔ میں آپ کو یاد دلانے آیا ہوں کہ ـــــ آپ ایک فیصلہ کر چکے ہیں۔

ایڈورڈ:۔ کیا آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں نے کہیں اپنا ارادہ بدل دیا ہوگا؟

انجانا مہمان:۔ نہیں۔ آپ تو ارادہ اس وقت تک بدل نہیں سکیں گے جب تک کہ آپ فیصلہ کرنے کی مہم سے سنبھل نہ جائیں۔ نہیں۔ میں تو بلکہ آپ کو یہ بتانے حاضر ہوا ہوں کہ آپ اپنا ارادہ بدل تو دیں گے لیکن اس کی کوئی اہمیت نہ ہوگی۔ اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

ایڈورڈ: اِس وقت بھی مجھے یہ خیال ہو رہا ہے کہ اپنا ارادہ بدل دوں ــــ محض آپ کو یہ دکھانے کے لئے کہ ایسا کرنے کی آزادی اب بھی مجھے حاصل ہے۔

انجانا مہمان: آپ ارادہ تو بدل دیں گے، مگر آپ آزاد نہیں ہیں۔ آپ کی آزادی کا لمحہ کل تھا۔ آپ نے فیصلہ کر لیا۔ آپ نے اپنی زندگی اور دوسروں کی زندگیوں میں چند ایسی قوتوں کو حرکت دے دی ہے، جو واپس نہیں ہو سکتیں۔ ایک نکتہ تو یہی ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ: کسی کو موت کی وادیوں سے واپس لانا بہت ہی پُرخطر معاملہ ہے۔

ایڈورڈ: موت کی وادیوں سے؟ یہ استعارہ ذرا.... ڈرامائی معلوم ہوتا ہے۔ کل ہی کی تو بات ہے کہ میری بیوی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

انجانا مہمان: ٹھیک ہے، مگر ہم ایک دوسرے کے لئے روز ہی مرتے رہتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے متعلق ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ صرف ان لمحات کی یاد ہے جن میں ہم ان کو جانتے تھے۔ اور اس کے فوراً بعد وہ بدل جاتے ہیں۔ یہ قیاس کر لینا کہ ہم اور وہ ویسے ہی ہیں، ایک بہت ہی کار آمد اور سہل پسندانہ سماجی روایت ہے، جسے کبھی کبھار توڑ دینا لازمی ہے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ ہر ملاقات میں ہم ایک اجنبی سے ملاقات کرتے رہتے ہیں۔

ایڈورڈ: تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی بیوی سے ایک اجنبی کی طرح ملوں؟ یہ بات اتنی آسان نہ ہوگی۔

انجانا مہمان: بہت مشکل بات تو ہے، مگر اس ڈھونگ کو قائم رکھنا شاید اس سے بھی زیادہ مشکل ہوگا کہ آپ ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ آپ تصور کر لیں کہ ماضی کے وہ شفیق سائے ــــ مثلاً آپ کی دادی اماں، کرسمس کی دعوتوں میں شریک ہونے والے آپ کے وہ خوش مذاق چچا جان، آپ کے بچپن کی محبوب آیا ــــ وہ تمام لوگ جنہوں نے آپ کے بچپن کو فرحتوں، مسرتوں اور جذبۂ حفاظت سے گھیر رکھا تھا ــــ اگر وہ سب لوگ واپس آجائیں، تو کیا آپ کو وقت اور خفت

محسوس نہیں کریں گے؟ پہلے دس منٹ گذرنے کے بعد، آپ ان سے یا وہ آپ سے کیا کہیں گے؟ ان کے ساتھ اجنبیوں کا سلوک کرنا آپ کے لئے بہت مشکل ہوگا، مگر یہ ڈھونگ رچانا اس سے بھی مشکل تر ہوگا کہ آپ لوگ ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں ہیں۔

ایڈورڈ:۔ آپ مجھ سے یہ توقع کیسے رکھ سکتے ہیں کہ گذشتہ پانچ سالوں پر میں یک لخت لکیر پھیر دوں۔

انجانا مہمان:۔ میں آپ سے کچھ بھی بھولنے کے لئے نہیں کہتا۔ بھول جانے کی کوشش کرنا بات چھپانے کے مترادف ہے۔

ایڈورڈ:۔ کئی ایک باتیں ہیں، جن کو یقیناً میں بھول جانا چاہتا ہوں

انجانا مہمان:۔ کئی ایک لوگوں کو بھی۔ مگر آپ کو انہیں بھولنا نہیں چاہیے۔ آپ ان تمام لوگوں کا ضرور سامنا کریں، مگر جب ملیں تو ان سے اجنبیوں کی طرح ملئے۔

ایڈورڈ:۔ پھر تو مجھے خود بھی ایک اجنبی بننا ہوگا۔

انجانا مہمان:۔ ہاں، اپنے لئے بھی۔ مگر یاد رکھئے کہ جب آپ اپنی بیوی سے ملیں، تو آپ سوالات نہیں کریں گے، اور نہ کوئی صفائی پیش کریں گے۔ میں نے ان سے بھی یہی کہا ہے یادوں کی زنجیروں سے ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ اب میں اجازت چاہوں گا۔

ایڈورڈ:۔ ذرا ٹھہریئے۔ آپ اس کے ساتھ واپس آئیں گے؟

انجانا مہمان:۔ جی نہیں۔ میں ان کے ساتھ نہیں آؤں گا۔

ایڈورڈ:۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اسے اپنے ساتھ لے آئیں۔

انجانا مہمان:۔ ہاں، میں جانتا ہوں کہ آپ یہی چاہیں گے۔ چند مخصوص وجوہات کی بنا پر، جن کی وضاحت پیش کرنے کے لئے میں تیار نہیں، میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ ان سے میرے متعلق کچھ نہ کہیے گا۔ اور وہ بھی آپ سے میرا ذکر نہیں کریں گی۔

ایڈورڈ:۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔
انجانا مہمان:۔ اور اب آپ اپنے مہمانوں کا انتظار کریں۔
ایڈورڈ:۔ مہمان؟ کیسے مہمان؟
انجانا مہمان:۔ جو بھی آجائیں۔ اجنبی لوگ۔ اور اب میں، احتیاطاً ملازموں کے زینہ کی طرف سے باہر جاؤں گا۔
ایڈورڈ:۔ ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟
انجانا مہمان:۔ پوچھ لیجئے۔
ایڈورڈ:۔ آپ ہیں کون؟
انجانا مہمان:۔ میں بھی ایک اجنبی ہوں۔

(باہر چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر وقفہ۔ ایڈورڈ بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتا ہے۔ گھنٹی بجتی ہے۔ وہ باہر کے دروازہ کی جانب جاتا ہے۔)

ایڈورڈ:۔ سیلیا!
سیلیا:۔ کیا لیونیا آگئی؟
ایڈورڈ:۔ سیلیا، تم کیوں آئی ہو؟ لیونیا بس اب کسی لمحہ آسکتی ہے۔ تمھیں یہاں ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ تم یہاں کیوں آگئیں۔
سیلیا:۔ اس لئے کہ لیونیا نے مجھے بلایا ہے۔
ایڈورڈ:۔ اس لئے کہ لیونیا نے تمھیں بلایا ہے۔
سیلیا:۔ براہِ راست تو نہیں بلایا۔ مگر جولیا کو ایک تار ملا ہے کہ وہ یہاں آئے اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ جولیا کو کچھ دیر ہو گئی، تو اسنے مجھے پہلے بھیج دیا۔
ایڈورڈ:۔ بڑے الجھن کی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیونیا کی عادت کے بالکل منافی ہے۔ خیر، میں سمجھتا ہوں کہ اب تو انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ آؤ، بیٹھ جاؤ۔
سیلیا:۔ شکریہ

(وقفہ)

ایڈورڈ:۔ ارے، واللہ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا باتیں کریں؟ ہم اس طرح خاموش تو نہیں بیٹھ سکتے۔

سیلیا:۔ میں تو بیٹھ سکتی ہوں۔ صرف تمہیں دیکھتی رہوں گی۔ ایڈورڈ، میرا اس طرح ہنسنا معاف کردو۔ تم اس وقت ایک ایسے بچے کی طرح لگ رہے ہو، جسے ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں بھیج دیا گیا ہو، مگر جو یہ نہ جانتا ہو کہ اس کی کیا خطا پکڑی گئی ہے۔ میں نے تمہیں پہلے کبھی اس عالم میں نہیں دیکھا۔ یہ صورت حال یقیناً بڑی مضحکہ خیز ہے۔

ایڈورڈ:۔ لیکن مجھے اس میں مزاح کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔

سیلیا:۔ میں درحقیقت تم پر ہنس نہیں رہی، ایڈورڈ۔ کل ..... کل میں کسی چیز پر ہنس نہیں سکتی تھی۔ مگر ان چوبیس گھنٹوں کے اندر میں نے بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ یہ تجربہ میرے لئے یقیناً کچھ پُرلطف نہ تھا۔ خیر۔ میں خوش ہوں کہ میں آگئی! اب میں، تم کو بالآخر ایک انسان کی حیثیت میں دیکھ سکتی ہوں۔ کیا تم بھی مجھے اسی طرح دیکھ کر، ہنس نہیں سکتے؟

ایڈورڈ:۔ کاش میں ایسا کرسکتا۔ کاش میں کچھ سمجھ سکتا۔ میں اس وقت مکمل طور پر اندھیرے میں گھرا ہوا ہوں۔

سیلیا:۔ مگر یہ سب کچھ کتنی آسان بات ہے۔ کیا تم یہ نہیں دیکھ سکتے کہ .....

(دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے)

ایڈورڈ:۔ لو، لیونیا آگئی۔ (دروازہ کی طرف جاتا ہے)

پیٹر، تم! (پیٹر داخل ہوتا ہے)

پیٹر:۔ لیونیا کہاں ہے؟

ایڈورڈ:۔ یہ نہ کہنا کہ لیونیا نے تمہیں بھی تار دیا تھا .....

پیٹر:۔ نہیں، مجھے نہیں، الکز کو بھیجا تھا۔ اسنے اسے آنے کے لئے کہا تھا اور مجھے ساتھ

لانے کے لئے بھی لکھا تھا۔ وہ ابھی ایک منٹ میں یہاں پہنچ جائے گا۔ سیلیا، کیا تمہیں بھی لیونیا نے ہی آنے کے لئے کہا تھا؟ میں تمہاری باتوں میں مخل تو نہیں ہو رہا؟

سیلیا:۔ میں ایڈورڈ کو ابھی یہی بتلا رہی تھی ۔۔ میں خود یہاں ابھی ابھی پہنچی ہوں ۔۔ کہ اسنے جولیا کو آنے اور مجھے ساتھ لے آنے کے لئے تار دیا تھا۔

ایڈورڈ:۔ نہ معلوم، لیونیا نے اور کن لوگوں کو آنے کی دعوت دی ہے۔

پیٹر:۔ بھئی، مجھے تو کچھ یوں بتایا گیا تھا کہ لیونیا کل کی کاکٹیل پارٹی آج کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ اس کی خالہ فوت ہو چکی ہوگی؟

ایڈورڈ:۔ کون خالہ؟

پیٹر:۔ وہی خالہ جس کے متعلق تم نے ہمیں بتایا تھا۔ مگر ایڈورڈ ۔۔ تمہیں ہماری کل کی گفتگو تو یاد ہے نا؟

ایڈورڈ:۔ بالکل۔

پیٹر:۔ مجھے امید ہے کہ تم نے اس سلسلے میں ابھی کچھ نہیں کیا۔

ایڈورڈ:۔ نہیں، میں نے کچھ نہیں کیا۔

پیٹر:۔ بہت اچھا ہوا۔ کیونکہ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ میں کیلی فورنیا جا رہا ہوں۔

سیلیا:۔ تم کیلی فورنیا جا رہے ہو!

پیٹر:۔ ہاں۔ مجھے ایک نئی ملازمت مل گئی ہے۔

ایڈورڈ:۔ ارے، ایک رات میں یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟

پیٹر:۔ بھئی، الکز نے ایک صاحب سے میرا تعارف کرا دیا اور پھر آج صبح ہم دونوں نے بات طے کر لی۔ الکز بڑے کمال کا آدمی ہے، کیونکہ، تمہیں معلوم ہے، کہ وہ ہر جگہ ہر شخص کو جانتا ہے۔ میں تو صرف اس لئے آ گیا تھا کہ خدا حافظ کہہ دوں۔

سیلیا:۔ پیٹر، مجھے یہ سُن کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ حالانکہ سچ پوچھو تو ہم ..... میں

تمہاری کمی محسوس کروں گی، تم تو جانتے ہو کہ میں کنسرٹوں اور تصویروں کی نمائشوں کے سلسلے میں تم پر تکیہ کئے رہتی تھی ـــ اس سے بھی زیادہ جتنا تمہیں اس کا احساس تھا۔ بہت لطف رہتا تھا، ٹھیک کہتی ہوں نا؟ مگر اب، مجھے امید ہے کہ تمہیں اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ پھر بھی میں تمہاری کمی محسوس کروں گی۔

پیٹر :۔ ایسا کہنے کے لئے میں تمہارا شکر گذار ہوں۔ مگر تمہیں ساتھ گھومنے پھرنے کے لئے مجھ سے بہتر آدمی مل جائے گا۔

سیلیا :۔ میرے خیال میں، اب میں کبھی کنسرٹوں میں نہ جاؤں گی۔ میں نہ جاؤں گی۔ میں خود بھی یہاں سے جا رہی ہوں۔

(لیونیا اپنی کنجی سے دروازہ کھول کر اندر آجاتی ہے)

پیٹر :۔ کیا تم کسی اور ملک میں چلی جاؤ گی؟

سیلیا :۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ شاید چلی جاؤں۔

ایڈورڈ :۔ تم دونوں جا رہے ہو!

(لیونیا داخل ہوتی ہے)

لیونیا :۔ کون جا رہا ہے؟ سیلیا تم! پیٹر تم! تم لوگوں سے یہاں ملنے کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔

پیٹر اور سیلیا :۔ مگر وہ تار!

لیونیا :۔ کیسا تار؟

سیلیا :۔ وہی جو تم نے جولیا کو بھیجا تھا۔

پیٹر :۔ اور وہ جو تم نے الکز کو دیا تھا۔

لیونیا :۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا مطلب کیا ہے۔ ایڈورڈ، کیا تم تار بھیجتے رہے ہو؟

ایڈورڈ :۔ میں نے ہرگز کوئی تار وار نہیں بھیجا۔

لیونیا :۔ یہ جولیا کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔ کیا وہ بھی آرہی ہے؟

پیسٹر :۔ ہاں۔ اور الکز بھی آرہا ہے۔

لیونیا :۔ تو پھر میں ان سے وضاحت طلب کروں گی۔ اس وقت تک اگر ہم سب بیٹھ جائیں تو کیا ٹھیک ہے۔ مگر بات کس موضوع پر کریں۔

ایڈورڈ :۔ پیٹر کے امریکہ جانے کے متعلق۔

پیٹر :۔ ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ میں کل تمہیں ضرور ٹیلی فون کرتا اور جانے سے قبل خدا حافظ کہنے ضرور آتا۔

لیونیا :۔ اور سیلیا بھی جا رہی ہے نا؟ یہی میں نے سنا شاید؟ میں تم دونوں کو مبارک باد دیتی ہوں۔ ہالی وڈ جا رہے ہو نا؟ سیلیا، یہ تمہارے لئے کتنی خوشی کی بات ہے! اب تو بالآخر تمہیں ایک موقع مل جائے گا کہ جی بھر کر اپنی تمنائیں پوری کر لو۔ تم دونوں ساتھ جا رہے ہو نا؟

پیٹر :۔ ہم ساتھ نہیں جا رہے ہیں۔ سیلیا ہمیں بتا رہی تھی کہ وہ جا رہی ہے۔ مگر مجھے معلوم نہیں کہ کہاں جا رہی ہے؟

لیونیا :۔ تمہیں معلوم نہیں کہ کہاں جا رہی ہے؟ اور کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم خود کہاں جا رہے ہو؟

پیٹر :۔ ہاں، میں تو کیلی فورنیا جا رہا ہوں۔

لیونیا :۔ کہو سیلیا، تم بھی کیوں کیلی فورنیا نہیں چلی جاتیں؟ لوگ کہتے ہیں کہ وہاں کی آب و ہوا بہت عمدہ ہے: جو لوگ ایک مرتبہ وہاں چلے جاتے ہیں، وہ کبھی واپس آنا نہیں چاہتے۔

سیلیا :۔ لیونیا، میرے خیال میں، پیٹر کے متعلق میں جانتی ہوں کہ . . . . .

لیونیا :۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ضرور جانتی ہو۔

سیلیا :۔ اور یہ بھی کہ وہ کیوں جا رہا ہے . . . . .

لیونیا :۔ مجھے اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔

سیلیا :۔ اور مجھے یقین ہے کہ اسکے چلے جانے کا فیصلہ صحیح ہے۔

لیونیا :۔ ادہو، تو تم نے اسے یہ مشورہ دیا ہے؟
پیپیٹر :۔ اسے اس کا کوئی علم نہ تھا۔
سیلیا :۔ مگر اب چونکہ میں شاید چلی جاؤں ——، میں، دوستوں کی طرح —— خدا حافظ کہنا چاہتی ہوں۔
لیونیا :۔ کیوں، سیلیا، کیا ہم ہمیشہ سے دوست نہیں تھے؟ میں تو یہی سمجھتی تھی کہ تم میری عزیز ترین دوستوں میں سے ایک تھیں —— کم از کم اس حد تک، جس حد تک ایک لڑکی ایک ایسی عورت کی دوست ہو سکتی ہے، جو اُس سے عمر میں اتنی بڑی ہو۔
سیلیا :۔ لیونیا، مجھے ٹلانے کی کوشش نہ کرو۔ میں شاید تمہیں پھر کبھی نہ مل سکوں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھے ہمیشہ ایک ایسے ہی دوست کی حیثیت سے یاد کرو، جو تمہیں اور ایڈورڈ کو خوش دیکھنا چاہتی ہے۔
لیونیا :۔ تمہارا بڑا کرم ہے۔ مگر تم بہت پُراسرار باتیں کر رہی ہو۔ بہت بہت شکریہ۔ مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں کسی طرح نباہ لیں گے جس طرح ماضی میں نباہتے آئے ہیں۔
سیلیا :۔ خدارا، ماضی کی طرح نہیں!

(دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے اور ایڈورڈ اٹھ کر دروازے کی طرف جاتا ہے۔)

مجھے افسوس ہے کہ یہ سب باتیں احمقانہ سی معلوم ہو رہی ہیں! مگر . . . .

(ایڈورڈ جولیا کے ساتھ داخل ہوتا ہے)

جولیا :۔ سو تم آگئیں، لیونیا! مجھے افسوس ہے کہ مجھے کچھ دیر ہوگئی۔ مگر تمہارا تار بالکل غیر متوقع سا تھا۔ میں سب کام کاج چھوڑ چھاڑ کر چلی آئی۔ اور تمہاری پیاری خالہ کیسی ہیں؟
لیونیا :۔ جہاں تک میں جانتی ہوں، وہ بالکل ٹھیک ہیں، شکریہ۔
جولیا :۔ وہ بہت معرکتہ الآرا طور پر روبصحت ہوگئی ہوں گی۔ مجھے جب تمہارا تار ملا تو میں یہی سمجھی تھی۔

لیونیا :۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ وہ تار بھیجا کہاں سے گیا تھا؟
جولیا :۔ اسیکس سے ۔ اور کہاں سے!
لیونیا :۔ کیوں، اسیکس سے کیوں؟
جولیا :۔ اس لئے کہ تم اسیکس میں تھیں ۔
لیونیا :۔ اس لئے کہ میں اسیکس میں تھی ۔
جولیا :۔ لیونیا! کہیں یہ تو نہیں ہوا کہ تم حافظہ کھو بیٹھی ہو! اگر یوں ہے تو پھر تمہاری خالہ ــــ اور وہ تار، سب باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں ۔
لیونیا :۔ خیر ممکن ہے کہ میں اسیکس میں تھی ۔ مجھے واقعی کچھ معلوم نہیں ۔
جولیا :۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تم کہاں تھیں؟ لیونیا! خدا کے لئے یہ نہ کہہ دینا کہ تمہیں اغوا کیا گیا تھا! بتاؤ تو ۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ . . . . .

(دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے ۔ ایڈورڈ دروازہ کھولنے کے لئے جاتا ہے ۔ الکز داخل ہوتا ہے)

الکز :۔ لیونیا آگئی؟
ایڈورڈ :۔ ہاں ۔
الکز :۔ خوش آمدید، لیونیا ۔ مجھے جب تمہارا تار ملا . . . . .
لیونیا :۔ کہاں سے؟
الکز :۔ ڈیڈھام سے ۔
لیونیا :۔ ڈیڈھام تو اسیکس میں ہے ۔ یعنی یہ معاملہ ڈیڈھام سے چلا ہے ۔ ایڈورڈ کیا ڈیڈھام میں تمہارے کوئی دوست ہیں؟
ایڈورڈ :۔ نہیں، ڈیڈھام میں میرے کسی سے تعلقات نہیں ہیں ۔
جولیا :۔ خوب، یہ معاملہ بڑا ہی پر لطف اور پر اسرار ہے ۔
الکز :۔ مگر اس میں اسرار کیا ہے؟
جولیا :۔ الکز، بات کو کریدنے کی کوشش نہ کرو ۔ لیونیا اپنا حافظہ کھو بیٹھی ہے ۔ اور پھر اسنے ہمیں

تار دے دیئے تھے، اور اب مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتی۔ میں یہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ اپنی خالہ کے متعلق فکرمند ہونے کی وجہ سے ــــ الکز، تمہیں یہ سنکر خوشی ہوگی کہ اب وہ بالکل صحت مند ہیں ــــ اور اس قدیم گریٹ ایسٹرن ریل میں اتنا لمبا سفر کرنے کی وجہ سے، جو ہر جنکشن پر رکتی ہے، وہ تھک کر نڈھال ہو چکی ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کا بھوک کے مارے بھی برا حال ہے۔

الکز:۔ اوہ، تو اس صورت مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا پڑے گا۔

جولیا:۔ نہیں، الکز۔ ہمیں ان کو تنہا چھوڑنا ہوگا۔ تاکہ لیونیا کچھ آرام کر سکے اب باقی سب لوگ میرے گھر چلیں گے۔ ہیبٹر، ذرا ایک ٹیکسی منگواؤ۔ (ہیبٹر چلا جاتا ہے)
سب لوگ آج میرے گھر پر کاکٹیل پارٹی جمائیں گے۔

سلیا:۔ اچھا اب میں چلوں گی۔ خدا حافظ لیونیا۔ خدا حافظ، ایڈورڈ۔

ایڈورڈ:۔ خدا حافظ، سلیا۔

سلیا:۔ خدا حافظ، لیونیا۔

لیونیا:۔ خدا حافظ، سلیا۔

(سلیا چلی جاتی ہے)

جولیا:۔ اور اب، الکز، تمہیں اور مجھے بھی چلنا چاہئے۔

ایڈورڈ:۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ اب کے تم کوئی چیز نہیں بھولیں، جولیا؟

جولیا:۔ کوئی چیز بھول گئی؟ اوہ۔ تمہارا مقصد میری عینک سے ہے۔ نہیں، وہ میرے پاس ہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ میرے کسی کام کی نہیں ہے۔ آج کی شام میں پھر واپس نہیں لوٹوں گی۔

لیونیا:۔ ذرا ٹھہرو! یہ تار کا معاملہ سمجھاتی جاؤ۔

جولیا:۔ تار کا معاملہ؟ تمہارا کیا خیال ہے، الکز؟

الکز:۔ نہیں جولیا، ہم تار کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔

لیونیا:۔ مجھے یقین ہے کہ تم تار کے معاملہ کی ضرور وضاحت کر سکتی ہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ کیوں۔

مگر مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے کل کوئی مشین چلادی ہو، جو برابر کام کئے جار
ہے، اور اب میں اسے روک نہیں سکتی۔ نہیں نہیں۔ یہ مشین نہیں معلوم ہوتی
اگر مشین ہی ہے، تو اسے کوئی دوسرا شخص چلا رہا ہے لیکن کون ہو سکتا
کوئی شخص ہمیشہ مداخلت کرتا رہتا ہے۔ میں اپنے آپ کو آزاد محسوس نہیں ک
.....اور اس کے باوجود میں نے ہی اسکو شروع کیا.....

جولیا:۔ الکز، کیا ہم کوئی چیز سمجھا سکتے ہیں؟

الکز:۔ نہیں، جولیا۔ میرے خیال میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اسے اپنے آپ معلوم کر
یہی ایک راستہ ہے۔

جولیا:۔ ٹھیک کہتے ہو تم! اچھا، میرے پیارو، پھر ملاقات ہو گی۔

ایڈورڈ:۔ اب کب ہو گی تم سے ملاقات؟

جولیا:۔ کیا میں نے کہا تھا کہ تم مجھ سے ملو گے؟ خدا حافظ۔ میرا خیال ہے کہ....
کوئی چیز نہیں بھولی۔

(پیٹر داخل ہوتا ہے)

پیٹر:۔ جولیا، میں ٹیکسی لے آیا ہوں۔

جولیا۔ بہت خوب! خدا حافظ۔

(جولیا، الکز اور پیٹر چلے جاتے ہیں)

لیونیا:۔ میرا خیال ہے کہ مجھے دیکھ کر تم کچھ خوش نہیں معلوم ہوتے۔

ایڈورڈ:۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ معلوم ہونے کا مجھے کوئی ایسا موقع ملا ہے۔ مگر تمہیں دیکھ
میں بےشک خوش ہوا ہوں۔

لیونیا:۔ ہاں، یہ کہنا بڑی حماقت کی بات تھی۔ بالکل کسی اسکول کی بچی کی طرح۔ با
کی طرح۔ معلوم نہیں میں نے ایسی بات کیوں کہی۔ خیر، اب تو میں آگئی۔

ایڈورڈ:۔ مجھے کوئی سوال پوچھنے کی اجازت نہیں۔

لیونیا:۔ اور مجھے بھی معلوم ہے کہ مجھے صفائی پیش کرنے کی اجازت نہیں۔

ایڈورڈ۔ اور نہ مجھے صفائی پیش کرنے کی اجازت ہے۔
لیونیا۔ اور نہ میں کوئی سوال پوچھ سکتی ہوں۔ لیکن اسکے باوجود . . . . کیوں نہیں؟
ایڈورڈ۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں نہیں۔ تو پھر اب گفتگو کیا ہوگی؟
لیونیا۔ ایک بات مجھے، دوسرے لوگوں کی وجہ سے معلوم کر لینی چاہئیے کہ اب ان سے کس طرح پیش آنا چاہئیے۔ میں پارٹی کا ذکر کر رہی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم میرا یقین نہیں کروگے کہ میں اسے بالکل ہی بھول گئی تھی! میں نے تمہیں بُری طرح پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ تم نے اسے کس طرح سنبھالا؟ مجھے تو چلے جانے کے بعد یاد آیا۔
ایڈورڈ۔ جن لوگوں کے متعلق مجھے معلوم تھا کہ آرہے ہیں، ان سب کو میں نے ٹیلی فون کیا تھا۔ مگر بعض لوگ مل نہ سکے اور اس لئے وہ آگئے۔
لیونیا۔ کون لوگ آئے؟
ایڈورڈ۔ صرف وہ لوگ جو ابھی یہاں تھے۔
لیونیا۔ بڑی عجیب بات ہے!
ایڈورڈ۔ اور ایک صاحب اور تھے . . . . مجھے معلوم نہیں وہ کون ہیں۔ مگر تمہیں ضرور معلوم ہوگا۔
لیونیا۔ ہاں، میرا خیال ہے کہ میں جانتی ہوں۔ مگر جولیا نے مجھے عجب تذبذب میں ڈال دیا ہے۔ وہ عورت ہے بڑی شیطان۔ اُسے تو جبلّی طور پر فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کسی بھی غیر متوقع موقع کو وہ فوراً ہی بھانپ لیتی ہے! اور تم نے ان سب لوگوں سے کیا کہا۔
ایڈورڈ۔ میں نے ایک خالہ کو ایجاد کیا، جو گاؤں میں بیمار ہے اور جس نے تمہیں اچانک بلا بھیجا تھا۔
لیونیا۔ واہ، ایڈورڈ! اس سے تو بہتر تھا کہ تم سچ سچ بتلا دیتے: سچ کے علاوہ کوئی چیز جولیا کو فریب نہیں دے سکتی۔ لیکن اس خالہ کا قیام اسکیس میں کیسے ہوا؟

ایڈورڈ :۔ جولیا نے مجھے مجبور کر دیا کہ اسکے قیام کی کوئی جگہ بھی مقرر کر دوں۔

لیونیا :۔ اچھا یہ بات تھی۔ تو جولیا نے اس طرح اسے اسیکس میں مقیم کر دیا! اور پھر تار کھ
اسیکس سے بھجوائے۔ بہرحال، مجھے جولیا کو سچ سچ بتانا ہوگا۔ ہم نے جھوٹ ب
میں بہت وقت ضائع کر دیا ہے۔

ایڈورڈ :۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تمہارا کیا مطلب ہے۔

لیونیا :۔ افوہ، ایڈورڈ! بات یہ ہے کہ یہاں سے چلے جانے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہ
ہوں کہ میں نے تمہیں کچھ زیادہ ہی اہمیت دے رکھی ہے۔ اور اب میں دیکھ رہی ہ
کہ تم کتنے بودے آدمی ہو۔

ایڈورڈ :۔ یہ تو بہت ہی زبردست نتیجہ نکالا ہے تم نے! ..... اور کتنے گھنٹوں میں...
صرف بتیس گھنٹوں میں۔

لیونیا :۔ ہاں! یہ ایک بہت ہی اہم دریافت ہے کہ آپ یہ معلوم کر لیں کہ آپ نے زندگی ک
پانچ برس ایک ایسے آدمی کے ساتھ گذار دیئے جس میں کوئی حسنِ مذاق ہی نہیں
اور یہ کہ اس کا مجھ پر یہ اثر ہوا ہے کہ میں اپنا حسنِ مذاق بھی کھو بیٹھی ہوں۔ تمہار
بات ہمیشہ مان لینے کا یہی نتیجہ ہے۔

ایڈورڈ :۔ مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا کہ تم ہمیشہ میری بات مان لیتی تھیں۔ میرا اپنا خیال
تو اس کچھ برعکس ہی رہا۔ اب جب کہ ہم اس موضوع پر بات کر رہے ہیں، تو م
یہ کہوں گا کہ وہ میں ہی تھا، جو تمہاری ہر بات مان لیتا تھا۔

لیونیا :۔ میں جانتی ہوں کہ میری بات مان لینے سے تمہاری کیا مراد ہے۔ تمہاری مراد یہ
کہ تم وہ سب عملی فیصلے مجھ پر چھوڑ دیتے تھے، جو تمہیں کرنے چاہئیں تھے۔ مجھے یا
پڑتا ہے کہ ـــ کاش، میں یہ اسی وقت جان لیتی کہ آئندہ کیا گذرے گی ـــ
جب ہم لوگ ہنی مون منانے کا منصوبہ بنا رہے تھے، تو میں تم سے یہ بھی نہ کہلوا
کہ تم کہاں جانا چاہتے تھے.....

ایڈورڈ :۔ مگر میں تو یہی چاہتا تھا کہ اس کا فیصلہ تم کرو۔

دنیا :۔ مگر میں یہ کس طرح بتا سکتی تھی کہ میں کہاں جانا چاہتی تھی جب تک کہ تم نے کوئی اور جگہ پہلے سے تجویز ہی نہیں کی تھی ؟ اور اب مجھے یاد آیا کہ آخر میں نے ہی مجبور ہو کر کہہ دیا تھا کہ "میں سمجھتی ہوں کہ تم تو پیس ہیون تک بھی چلے چلو گے" اور تم نے کہا تھا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے :

وارڈ :۔ بے شک مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں نے تو اس طرح تمہیں خراجِ محبت پیش کیا تھا۔

دنیا :۔ تم نے خراجِ محبت پیش کیا تھا ! اور لوگ کہتے تھے کہ تم میرا کتنا خیال رکھتے ہو ! اور تم یہ سمجھتے تھے کہ تم کتنے بے لوث آدمی ہو۔ یہ تو محض بے حسی تھی ! تم صرف یہ چاہتے تھے کہ تمہیں اکسایا جاتا، تمہاری ہمت افزائی کی جاتی .....

وارڈ :۔ ہمت افزائی ؟ کس چیز کے لئے ؟

دنیا :۔ اپنے آپ کو اچھا سمجھنے کے لئے۔ تم جانتے ہو کہ میں نے ہی تمہیں وکالت کے لئے اکسایا تھا .....

وارڈ :۔ تم یہی رٹ لگائے رہتی تھیں کیونکہ مجھے کام نہیں ملتا تھا۔ اور تم کہتی تھیں کہ مجھے زیادہ لوگوں سے ملتے رہنا چاہیئے۔ مگر جب مقدمے آنے لگے ____ اور یہ میں تمہیں بتا دوں کہ یہ مقدمے تمہارے کسی دوست کے ذریعہ نہیں ملتے تھے ___ تو اچانک یہ بات تمہیں کھلنے لگی کہ "میں ہمیشہ اتنا مصروف رہتا ہوں یا بہت تھک جاتا ہوں، اور لوگوں سے ملنے ملانے کے سلسلے میں میں تمہارے کام کا نہیں ہوں .....

دنیا :۔ میں نے کبھی شکایت نہیں کی۔

وارڈ :۔ نہیں جس انداز سے تم نے شکایت نہیں کی۔ اسی سے مجھے زیادہ غصہ آتا تھا۔

دنیا :۔ تم ہی شکایت کرتے تھے کہ وکیلوں اور موکلوں کے سوا تمہیں کسی سے ملنے کا موقع نہیں ملتا تھا .....

وارڈ :۔ اور نہ تم میری بہت ہمدرد تھیں۔

لیونیا:۔ ٹھیک ہے۔ مگر میں اس سلسلے میں کچھ کرنے کی کوشش ضرور کرتی تھی۔ اسی ل
میں، جمعرات کی محفلوں کا اہتمام کرنے کی زحمت اٹھاتی تھی تاکہ تمہیں دانشور
سے گفتگو کرنے کا موقع مل سکے۔ .....

ایڈورڈ:۔ تم تو مجھے اتنا ہی موقع دیتیں جتنا اس وقت دیتیں اگر تم نے مجھے اپنے ہا
بٹلر کے طور پہ ملازم رکھ لیا ہوتا: تمہارے کچھ مہمانوں نے تو شاید یہی سمجھا ہو گا ک
ہی بٹلر ہوں۔

لیونیا:۔ اور کئی بار ایسا بھی ہوا کہ جب کوئی ایسا شخص آنے والا ہوتا جس سے میں تمہی
خاص طور سے ملوانا چاہتی تھی، تو تم اس وقت پہنچتے تھے، جب وہ رخص
ہو رہا ہوتا۔

ایڈورڈ:۔ چلو اچھا ہوا کم از کم ان لوگوں نے تو مجھے بٹلر نہیں سمجھا ہو گا۔

لیونیا:۔ میں نے جب بھی کوئی کوشش کی، معاملہ اور بگڑتا گیا۔ اور جب بھی تم نے کسی چ
کی خواہش کی اور وہ تمہیں پیش کی جاتی، تو تم کسی دوسری چیز کی خواہش کر
تھے۔ مگر اب ___ آئندہ میں تمہارے ساتھ مختلف رویہ اختیار کروں گی۔

ایڈورڈ:۔ اس انتباہ کا شکریہ۔ مگر یہ تو بتا دو کہ میرے متعلق یہ رائے رکھتے ہوئے ک
تم واپس کیوں آ گئیں؟

لیونیا:۔ سچ پوچھو، تو مجھے خود معلوم نہیں۔ مجھے اس خطرے سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ ل
اسکے باوجود، کسی چیز نے، کسی شخص نے مجھے آنے پر مجبور کر دیا۔ اور تم کیوں مجھ
واپس حاصل کرنا چاہتے تھے؟

ایڈورڈ:۔ مجھے بھی معلوم نہیں۔ تم کہتی ہو کہ تم میری ہمت افزائی کر رہی تھیں: تو پھر تم
ہمیشہ حقیر و بے وقعت ہونے کا احساس کیوں دلاتی تھیں؟ ممکن ہے کہ
یہ معلوم نہ ہو کہ میں کس قسم کی زندگی چاہتا تھا، لیکن ویسی زندگی میں یقیناً نہیں
چاہتا تھا، جو تم نے میرے لئے منتخب کر رکھی تھی۔ تم چاہتی تھیں کہ تمہارا شو
کامیاب ہو، تم یہ چاہتی تھیں کہ تمہاری پسندیدہ سماجی زندگی کے لئے میں

سماجی پس منظر مہیا کر دوں۔ تم ایسی میزبان خاتون بننا چاہتی تھیں جس کے لئے میرا پیشہ معاون ثابت ہوتا۔ بہر حال، میں نے رواداری کا لحاظ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اب، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ میں مختلف برتاؤ کروں گا۔

یونیا: ۔ ولہ، شاباش! ایڈورڈ۔ بڑی حیرت کی بات ہے۔ اس طرح کے جواب دینا تمہیں کس نے سکھایا ہے۔

ڈورڈ: ۔ پچھلے چند دنوں میں، میں کافی ذلت اٹھا چکا ہوں جس نے مجھے اُس مقام پر پہنچا دیا ہے، جہاں ذلت ذلت نہیں معلوم ہوتی۔ زندگی میں ایسا مقام بھی آتا ہے، جہاں احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اور پھر انسان اپنے مافی الضمیر کی بات کہہ دیتا ہے۔

یونیا: ۔ یہ ایک نئی بات ہوگی کہ تم ضمیر بھی رکھتے ہو۔ خیر، میں تمہیں، جیسے بھی تم ہو، ویسا ہی قبول کر لینے کے لئے تیار ہوں۔

ڈورڈ: ۔ تمہارا مطلب کیا ہے۔ کہ تم مجھے ویسا ہی قبول کرنے کے لئے تیار ہو، جیسا میں تھا یا جیسا تمہاری رائے میں اب ہوں۔ مگر تم کیا سمجھتی ہو کہ میں کیا ہوں؟

ونیا: ۔ بالکل ویسے جیسے تم ہمیشہ تھے۔ البتہ، میں اب بالکل مختلف ہوں، یہ بات تمہیں پوری طرح سمجھ لینی چاہیئے۔

ڈورڈ: ۔ بات تو بڑی دلچسپ ہے: مگر تم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ تمام تبدیلی تمہارے اندر واقع ہوئی ہے ــــ یہ الگ بات ہے کہ مجھے یہ تبدیلی اب تک بہتری کے لئے نظر نہیں آتی۔ کیا تم نے اس پر بھی کبھی غور کیا ہے کہ شاید میں بھی بدل گیا ہوں۔

ونیا: ۔ اوہ، ایڈورڈ! جب تم ننھے سے بچے تھے، تو مجھے یقین ہے کہ تم ہمیشہ اپنے آپ کو ناپتے رہتے تھے تاکہ یہ ثابت کر سکو کہ پچھلی چھٹیوں سے لے کر اب تک تم کتنے بڑھ چکے ہو! تم ہمیشہ اپنی ذات میں ہی کھوئے رہتے تھے اور اگر دوسرے لوگ بڑھ رہے تھے، تو تم بھی اسی بنا پر بڑھنا چاہتے تھے۔ اب بتاؤ کہ تم میں کیا تبدیلی آئی ہے؟

ڈورڈ: ۔ وہ تبدیلی جو اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں سے دیکھنے سے آتی ہے۔

لیونیا۔ یہ تجربہ تو تمہارے لئے بہت ہی تباہ کن ثابت ہوا ہوگا۔ خیر، فکر نہ کرو، بہت جلد
تم اسے بھول جاؤ گے۔ اور پھر تم اپنے آپکو ایک اور کردار کی شکل میں پاؤ گے جسے
دوسروں کو ورغلانے کے لئے ایک مختلف چہرہ کی ضرورت ہوگی۔

ایڈورڈ۔ تمہاری جو باتیں حد درجہ مشتعل کرتی ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ تم ہمیشہ کامل اعتماد
کے ساتھ یہ ظاہر کرتی ہو کہ تم مجھے اس سے بھی زیادہ جانتی ہو جتنا کہ میں اپنے
آپ کو جانتا ہوں۔

لیونیا۔ اور تمہاری جو بات مجھے حد درجہ مشتعل کرتی ہے وہ تمہارا پُرسکون مفروضہ ہے
جس کی بنا پر تم مجھے سمجھنے کے قابل ہی تصور نہیں کرتے۔

ایڈورڈ۔ لیجئے، ہم پھر وہیں آ پہنچے — اسی پرانے جال میں۔ صرف ایک فرق ہے شاید —
کہ بجائے اس کے کہ ہم دونوں قفس کا ایک ایک الگ کونہ سنبھال لیں، ہم اب ایک
دوسرے سے خوب لڑ سکتے ہیں۔ بہر حال، شام گذارنے کا یہ طریقہ گراموفون سننے
سے تو بہتر ہی ہے۔

لیونیا۔ ہمارے ہاں ریکارڈ تو بہت اچھے اچھے ہیں؛ مگر مجھے ہمیشہ یہی شبہ رہا کہ تمہیں
موسیقی سے نفرت ہے۔ اور جب ہم مجبوراً اکیلے ہوتے ہیں تو گراموفون مجھ سے
باتیں نہ کرنے کا محض بہانہ ہوتا ہے۔

ایڈورڈ۔ مجھے اکثر تعجب ہوتا ہے کہ آخر تم نے مجھ سے شادی کیوں کر لی تھی۔

لیونیا۔ تمہیں شاید نہیں علم کہ تم واقعی خاصے دلکش آدمی تھے۔ اور پھر تم بار بار یہ کہتے
رہتے تھے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے —— اب میں سوچتی ہوں کہ شاید اس
طرح تم اپنے آپ کو بہلا رہے تھے کہ تمہیں واقعی مجھ سے محبت تھی۔ مجھے ہمیشہ
یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی بہت خوبصورت تجربے کی دہلیز پر کھڑی ہوں
اب مجھے تعجب ہوتا ہے کہ تمہیں یہ خیال کیسے آ گیا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے تھے۔

ایڈورڈ۔ سب لوگ مجھے یہی کہتے تھے کہ میں تم سے محبت کرتا تھا۔ اور سب نے یہ بھی کہا کہ
دونوں ایک دوسرے کے لئے بہت موزوں تھے۔

لیونیا:۔ یہ بڑی قابلِ رحم بات ہے کہ تمہاری اپنی کوئی رائے نہ تھی۔ ایڈورڈ، میں تم سے اچھا سلوک کرنا چاہتی ہوں۔ اگر یہ ناممکن ہے تو پھر میں تمہیں عاجز کر دینا چاہتی ہوں بہرحال، کچھ نہ کرنے کے بجائے کچھ ضرور کرنا چاہتی ہوں ــــ یہی تو تم مجھ سے چاہتے ہو۔ مگر مجھے تمہارے حال پر بہت افسوس ہے . . . . .

ایڈورڈ:۔ خدارا میرے حال پر افسوس نہ کرو! مجھ پر افسوس کرنے والے اور بھی کافی لوگ ہیں۔

لیونیا:۔ ہاں، ٹھیک کہتے ہو۔ کیونکہ وہ لوگ تم پر اتنا افسوس نہیں کر سکتے جتنا تم خود پر کرتے ہو۔ اور یہ برداشت کرنا واقعی بہت مشکل ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر میں چلی جاؤں گی تو ممکن ہے تمہارے لئے کوئی راہ نکل آئے گی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں تمہارے لئے مر جاؤں ــــ ویسے بھی میں تمہارے لئے ایک سائے سے زیادہ کچھ نہ تھی ــــ تو شاید تمہیں وہ وقت واپس مل جائے جب تم حقیقی تھے ــــ کیونکہ تم مجھ سے ملنے سے قبل، کسی نہ کسی وقت حقیقی تو ضرور رہے ہو گے ــــ شاید اس وقت جب تم ابھی بچے تھے۔

ایڈورڈ:۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم خود کو میرے اس طرزِ عمل کا ذمہ دار سمجھنے لگو: یہ بھی نفرت ہی کی ایک صورت ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم مجھے یہ سمجھاؤ کہ میں کیا ہوں۔ تم ابھی تک میرے لئے ایک شخصیت ایجاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو، جو مجھے اپنے آپ سے اور دور کر دے گی۔

لیونیا:۔ تم ایک بہت ہی سادہ بات کو الجھائے دیتے ہو۔ ہاں، مگر ایک بات میں واضح طور پر سوچ چکی ہوں کہ ہم اس زندگی کو نہیں دہرائیں گے جو ہم کل صبح تک بسر کرتے رہے تھے۔

ایڈورڈ:۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک دروازہ موجود تھا لیکن اسے میں کھول نہ سکا۔ میں اسکے ہینڈل تک کو چھو نہ سکا۔ میں اپنی قید سے باہر کیوں نہ جا سکا؟ جہنم کیا چیز ہے؟ جہنم خود اپنی ہی ذات ہے۔ جہنم تنہا ہے، اس میں جو اور شکلیں ہیں

وہ محض عکس ہیں۔ کوئی ایسی چیز نہیں جس سے فرار میسر ہو، کوئی ایسا مقام نہیں
جہاں فرار کے بعد پناہ مل جائے۔ انسان ہمیشہ اکیلا ہے۔ تنِ تنہا!

لیونیا:۔ ایڈورڈ، یہ تم کیا باتیں کر رہے ہو؟ اپنے آپ سے بولے جا رہے ہو کیا تم میرے
متعلق ایک لمحہ کے لئے سوچنا برداشت کر سکتے ہو؟

ایڈورڈ:۔ کل ہی کی بات ہے کہ جہنم کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ اور اب ــــ اب مجھے اس
میں ہر گھڑی ہر لمحہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہنا ہے۔

لیونیا:۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا 'نروس بریک ڈاؤن' ہونے والا ہے۔!

ایڈورڈ:۔ یہ مت کہو!

لیونیا:۔ مجھے کہنے دو۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک ڈاکٹر کو جانتی ہوں .... جو تمہاری
مدد کر سکتا ہے۔

ایڈورڈ:۔ اگر میں ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا، تو اپنے لئے ڈاکٹر میں خود پسند کروں گا۔
تمہارے پسند کئے ہوئے ڈاکٹر کے پاس کبھی جاؤنگا میں یہ کیا جانوں کہ تم اس سے جا کر
پہلے نہ مل لوگی، اور میرے متعلق اپنے نقطۂ نظر سے اسے سب کچھ نہ بتا دوگی؛
مگر مجھے ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو جہنم میں ہوں ــــ جہاں کوئی
ڈاکٹر نہیں ہوتے ــــ کم از کم پیشہ ورانہ حیثیت سے تو نہیں ہوتے۔

لیونیا:۔ جہنم میں بھی، عملی ہوا جا سکتا ہے۔ اور یہ تو تم جانتے ہو کہ میں تم سے کہیں زیادہ
عملی ہوں۔

ایڈورڈ:۔ اب تو مجھے سمجھ لینا چاہئے کہ عملی ہونے سے تمہارا کیا مقصد ہے۔ عملی! مجھے یاد آیا
کہ جب ہم ہنی مون منا رہے تھے، تو تم ہر وقت چیزوں کو کاغذ میں لپیٹتی رہتی تھیں
اور پھر کاغذ کھول کھول کر دیکھتی رہتی تھیں کہ تمہیں کس چیز کی ضرورت تھی۔ اور
میں تمہیں یہ تک سمجھا نہ پایا کہ 'ٹوتھ پیسٹ' کے ٹیوب کو بند کس طرح کیا جاتا ہے

لیونیا:۔ اچھا، خیر اب میں تمہیں مجبور نہ کروں گی۔ تم کچھ اتنے الجھ گئے ہو کہ تم یہ بھی نہیں
جانتے کہ تم کیا چاہتے ہو۔ لیکن اس الجھن میں، تم پھر سمجھوتہ کرنے لگو گے اور تمہارا

سمجھوتہ وہی پرانے طرز کا ہوگا۔

ایڈورڈ۔ تم مجھے سمجھی نہیں۔ کیا میں نے یہ واضح طور پر نہیں بتادیا کہ آئندہ تم مجھے بالکل ایک مختلف شخص پاؤگی۔

یونیا:۔ بہت خوب۔ مگر کیا یہ تبدیلی سیلیا کے کیلی فورنیا چلے جانے سے تو کوئی تعلق نہیں رکھتی؟

ایڈورڈ:۔ سیلیا؟ کیلی فورنیا چلی جائے گی۔

یونیا:۔ ہاں۔ پیٹر کے ساتھ، واقعی، ایڈورڈ اگر تم انسان ہوتے، تو ہنسی کے مارے تمہارا برا حال ہوجاتا۔ مگر تم ہنسوگے نہیں۔

ایڈورڈ:۔ اف خدایا! اے کاش! میں نے کل جب سوچا تھا کہ میں نے فیصلہ کرلیا ہے، کاش میں کل کے اس لمحہ سے قبل کے زمانہ میں واپس لوٹ سکوں! یہ کس شیطان نے شبہات کے داخل ہونے کیلئے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا؟ اور پھر تم لوٹ کر آگئیں — تم جو تباہی کا فرشتہ ہو۔ اور تم عین اسوقت آئیں — جس وقت مجھے اپنی ذات پر اعتماد حاصل ہوچکا تھا۔ پھر یکایک ایک لمحہ میں، تمہارے چھونے سے ہی تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں رہا۔ یا خدا، یہ میں نے کیا کیا؟ تم اژدہا ہو۔ تم آکٹوپس ہو۔ کیا میں وہی بن جاؤں جو تم مجھے بنانا چاہتی ہو؟

یونیا:۔ اچھا، ایڈورڈ، چونکہ میں تمہیں ہنسا نہیں سکی، اور نہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے آمادہ کرسکی ہوں، اس لئے اس وقت میں تمہارے لئے اور کچھ نہیں کرسکتی بہتر ہے کہ میں ذرا باورچی خانہ تک ہوآؤں مجھے معلوم ہے کہ کچھ انڈے موجود ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ کھانے کے لئے ہمیں باہر جانا چاہئے۔ میرا سامان ابھی تک نیچے ہال میں رکھا ہے۔ کسی قلی سے کہہ کر اوپر منگوادو۔

پردہ

دوسرا ایکٹ

لندن میں سر ہیزی ہارکورٹ رائلی کا مطب۔ وقت: کئی
ہفتوں کے بعد ایک صبح۔ سر ہیزی تنہا اپنی کرسی پر بیٹھے ہیں
بجلی کا ایک بٹن دباتے ہیں۔ انکی نرس سکریٹری ملاقاتوں کی
کتاب لئے داخل ہوتی ہے۔

رائلی :۔ مس باراوے، آج صبح کی تین ملاقاتوں کے سلسلے میں، میں چاہتا ہوں کہ اپنی
ہدایات پر ایک نظر ڈال لوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہ بات اچھی طرح سمجھ گئی ہو
کہ یہ بہت ہی اہم بات ہے کہ یہ تینوں مریض ایک دوسرے سے ملنے نہ پائیں

نرس سکریٹری :۔ آپ نے سمجھا دیا تھا، سر ہیزی: پہلی ملاقات کیا بجے مقرر ہے، اس مریض کو چھوٹے
ویٹنگ روم میں لے آنا ہے۔ اور آپ اسے فوراً دیکھیں گے۔

رائلی :۔ ہاں۔ اسے فوراً دیکھ لوں گا اور دوسرا؟

نرس سکریٹری :۔ دوسرے مریض کو دوسرے کمرے میں بٹھانا ہے۔ وہ پونے سات بجے آئے گی
لیکن آپ شاید اسے کچھ انتظار کروائیں گے۔

رائلی :۔ بلکہ شاید وہ مجھے انتظار کرائے گی۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک وقت
پر پہنچے گی۔

نرس سکریٹری: جیسے ہی وہ آئے گی، مجھے آپ کو ٹیلی فون کرنا ہے جب تک آپ تین مرتبہ گھنٹی
بجائیں گے، میں اسے وہیں بٹھائے رکھوں گی۔

رائلی :۔ اور تیسرے مریض؟

نرس سکریٹری: تیسرے مریض کو چھوٹے کمرے میں بٹھانا ہوگا۔ اور آپ کو یہ بتانا ضروری
نہیں کہ وہ پہنچ چکی ہیں۔ اس کے بعد، جب آپ گھنٹی بجائیں، تو میں دوسرے

کو باہر چھوڑ آؤں گی۔ اور ان کے چلے جانے کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رائلی :۔ بالکل ٹھیک مس بارلیے۔ فی الحال اسی کا خیال رکھو۔

نرس سکریٹری :۔ سر ہیزی، مسٹر گبس آ گئے ہیں۔

رائلی :۔ ان کو فوراً اندر بھیج دو۔

(نرس سکریٹری باہر چلی جاتی ہے)

(الکز ایکدم سے اندر آجاتا ہے)

الکز :۔ چیمبرلین کی ملاقات کا کیا وقت مقرر ہے؟

رائلی وہی روایتی وقت ـــــ گیارہ بجے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہاں، یہ بتاؤ کہ تمہیں اسے قائل کرنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی کہ میں ہی اسکے لئے موزوں ترین ڈاکٹر ہوں۔

الکز :۔ دقت؟ بالکل نہیں! وہ صرف چار دن انتظار کرنے پر بے صبری کا اظہار کر رہا تھا۔

رائلی :۔ اس کی ملاقات میں تاخیر بہت ضروری تھی تاکہ اس کی قوتِ دفاع کمزور پڑ جائے۔ مگر میرے پوچھنے کا مقصد یہ ہے کہ کیا اسے تمہارے فیصلے پر اعتماد ہے؟

الکز :۔ ہاں، بنیادی طور پر وہ مجھ پر اعتماد رکھتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ مجھے بہت ذہین آدمی تصور کرتا ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میری معلومات بڑی وسیع ہیں ـــــ مجھے وہ کچھ اس طرح کا آدمی سمجھتا ہے جیسے موزوں ڈاکٹر یا چیزوں کے لئے موزوں دکانیں ضرور معلوم ہوں گی۔ اسکے علاوہ، اپنی بیوی کے تجویز کئے ہوئے ڈاکٹر کے سوا، وہ کسی بھی ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے لئے تیار تھا۔

رائلی :۔ میں نے بھی پہلے سے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ اس سے میرا ذکر نہ کرے گی۔

الکز :۔ یہی تمہاری روایتی دور اندیشی ہے۔ اب وہ بڑا خوش ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اسنے اپنی بیوی پر فوقیت حاصل کر لی ہے۔ اور جب تم اسے ایسے سینیٹوریم میں بھیج دوگے، جہاں وہ اس تک پہنچ نہ پائے گی ـــ تو، وہ یہ سمجھتا ہے کہ اسے

اپنے کئے پر بہت افسوس ہو گا۔ اب تو وہ اپنی بیماری کے مزے لے رہا ہے۔

رائلی :۔ بیماری نے اسے دو فائدے مہیا کر دیئے ہیں! اپنے آپ سے فرار پالینا ــــ اور بیوی سے سبقت لے جانا۔

الکز :۔ کیا اس سے فرار نہیں چاہتا؟

رائلی :۔ نہیں، وہ اس سے فرار حاصل کرنا نہیں چاہتا۔

الکز :۔ اب اس کا قیام اپنے کلب میں ہے۔

رائلی :۔ ہاں، وہیں سے اسنے مجھے خط لکھا تھا۔

(ضمنی ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

ہیلو، ہاں۔ اسے اوپر بھیج دو۔

الکز :۔ آج تم بہت ہی مصروف رہو گے! میں نوکروں کے زینہ سے باہر چلا جاؤں گا اور جب وہ لوگ چلے جائیں گے تو واپس آجاؤں گا۔

رائلی :۔ ہاں، جب وہ چلے جائیں، تب آنا۔

(الکز ایک چھوٹے دروازے سے باہر چلا جاتا ہے)

(ایڈورڈ کو نرس سکریٹری اندر لے آتی ہے)

ایڈورڈ :۔ سر ہنری ہار کورٹ ۔ رائلی ــــ

(ایکدم رک جاتا ہے اور رائلی کو گھورنے لگتا ہے)

رائلی :۔ (اپنے کاغذات سے نظریں اٹھائے بغیر)

آیئے، مسٹر چیمبرلین۔ تشریف رکھئے۔ ایک منٹ کے لئے معافی چاہتا ہوں۔

ہاں، تو مسٹر چیمبرلین، کیا فرما رہے تھے آپ؟

ایڈورڈ :۔ دروازے کے اندر داخل ہونے سے ایک لمحہ پیشتر، میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا کہ ممکن ہے آپ وہی شخص ہوں گے؛ لیکن میں نے اس خیال کو محض بیماری کی ایک اور علامت سمجھ کر مسترد کر دیا تھا۔ خیر، ایک ایسے آدمی کی سفارش پر عمل کرنے سے قبل، جو آپ کو نہیں جانتا تھا، مجھے خود ہی

معلوم کرلینا چاہیے تھا۔ مگر البرٹ بھی ہمیشہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔ دکانیں تجویز کرنے کے سلسلے میں اس کی تمام سفارشیں ٹھیک ہوتی ہیں۔ معاف کیجئے گا۔ مگر ہے وہ بہت ہی غلط آدمی۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں ...... مگر پوچھنے کا کیا فائدہ ! میرا خیال ہے کہ میں ابھی اسی وقت واپس چلا جاؤں تو اچھا ہے۔

رائلی :۔ نہیں مسٹر چیمبرلین، براہ کرم بیٹھ جائیے آپ جا تو نہیں رہے ہیں پھر بیٹھ ہی جائیے تو اچھا ہے۔ آپ کوئی سوال پوچھنے والے تھے۔

ایڈورڈ :۔ جب آپ میرے گھر تشریف لائے تھے، تو کیا آپ کو میری بیوی نے مدعو کیا تھا، جیسا کہ میرا خیال تھا؟..... یا آپ کو اسنے بھیجا تھا؟

رائلی :۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ اور مسز چیمبرلین کو معلوم نہ تھا کہ میں آرہا ہوں۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ آپ وہاں ہوں گے اور دوسرے کون لوگ آپ کے ساتھ ہوں گے۔

ایڈورڈ :۔ مگر آپ میری بیوی سے تو ملے تھے نا؟

رائلی :۔ ہاں، میں ان سے ملا تھا۔

ایڈورڈ :۔ تو یہ ایک جال تھا۔

رائلی :۔ اسے جال نہیں کہنا چاہیے۔ لیکن اگر یہ جال ہے، تو آپ اس سے نکل نہیں سکتے۔ اسلئے... آپ تشریف رکھیں تو مناسب ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس کرسی کو بہت آرام دہ پائیں گے۔

ایڈورڈ :۔ میں نے جب آپ کو بتانا شروع کیا تھا، آپ کو اس سے قبل ہی معلوم تھا کہ کیا ہوا تھا؟

رائلی :۔ ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ مجھے بالکل مناسب وقت پر معلوم ہو گیا تھا۔ مگر فی الحال اس سوال کو بھول جائیں۔ آپ پہلے مجھے اپنی وہ مشکلات بتائیے جن پر آپ میرا پیشہ ورانہ مشورہ لینا چاہتے ہیں۔

ایڈورڈ :۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی بیوی کو واپس لانے کا الزام میں آپ پر نہیں رکھ سکتا۔ یوں معلوم

ہونا تھا جیسے آپ مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے تھے کہ میں اس کے بغیر ہی اچھا تھا۔ مگر کیا آپ کو یہ احساس نہیں ہوا کہ اس وقت میں کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہ تھا؟

رائلی :۔ مسٹر چیمبرلین، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر میں آپ کی بیوی کو واپس نہ لاتا، تو حالات اس وقت کچھ بہتر ہوتے؟

ایڈورڈ مجھے یقین ہے کہ میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مگر اس سے بدتر بھی کیا ہوتے۔

رائلی :۔ اس سے زیادہ ہی بدتر ہو سکتے تھے۔ قوتِ فیصلہ کے فقدان سے آپ تین زندگیوں کی تباہی کا باعث بن جاتے۔ اب صرف دو ہی باقی ہیں ـــ جن کو تباہی سے واپس لاتے اور بچانے کا اب بھی آپ کو موقع ہے۔

ایڈورڈ:۔ آپ یوں باتیں کر رہے ہیں، جیسے مجھ میں ابھی قوتِ عمل کی صلاحیت باقی ہے: اگر میں اس قابل ہوتا، تو مجھے آپ سے یا کسی اور شخص سے مشورہ کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ میں یہاں ایک مریض کی حیثیت سے آیا ہوں۔ اگر آپ میرے مرض میں دلچسپی نہیں لیں گے، تو میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔

رائلی :۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ بہت بیمار ہیں؟

ایڈورڈ:۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ ایک ڈاکٹر کو خود بخود معلوم ہو جاتا ہوگا۔ یا کم از کم مرض کی علامتیں دریافت کر لینے کی سعی ضرور کرتا ہوگا۔ حال ہی میں، دو آدمیوں نے، تقریباً ایک سے الفاظ میں مجھے یہ مشورہ دیا کہ مجھے کسی ڈاکٹر سے ضرور مل لینا چاہیئے۔ انہوں نے کہا ـــ یہ بات بھی انہوں نے تقریباً یکساں الفاظ میں کہی ـــ کہ میرا نروس بریک ڈاؤن، ہونے والا ہے۔ اس وقت تو مجھے بھی معلوم نہ تھا ـــ اگر وہ لوگ میری حالت کو محسوس کر گئے، تو میرا خیال تھا کہ ایک ڈاکٹر کو بھی محسوس ہو جانا چاہیئے۔

رائلی :۔ 'نروس بریک ڈاؤن'، ایک ایسی اصطلاح ہے، جسے میں کبھی استعمال نہیں کرتا۔ ایکے

کئی معنی ہو سکتے ہیں۔

ایڈورڈ:۔ اور اس کے بعد، مجھے یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ میرا کیس بہت غیر معمولی ہے۔

رائلی :۔ سب کیس، منفرد ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے مشابہ بھی۔

ایڈورڈ:۔ کیا کوئی ایسا سینیٹوریم ہے، جہاں آپ، اپنی ذاتی نگرانی میں، مجھ جیسے مریضوں کو بھیج دیتے ہوں؟

رائلی :۔ مسٹر چیمبرلین، آپ بہت ہی جلد باز آدمی ہیں۔ مختلف مریضوں کے لئے مختلف اقسام کے سینیٹوریم ہوتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی مریض ہوتے ہیں جن کے لئے سینیٹوریم سب سے بدترین مقام ثابت ہوتا ہے۔ اس سے قبل کہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ آپ کے لئے کیا کرنا مناسب ہے، ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ آپ کا مرض کس نوعیت کا ہے۔

ایڈورڈ:۔ میں نہیں سمجھتا کہ مجھ جیسے مریض سے کبھی آپ کا سابقہ پڑا ہو گا، میں اپنی شخصیت پر اعتماد کھو بیٹھا ہوں۔

رائلی :۔ جی ہاں۔ یہ بات بڑی ہی سنگین ہے۔ بڑا عام مرض ہے یہ۔ بہت سے لوگ اسکا شکار ہیں۔

ایڈورڈ:۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بچپن میں . . . . .

رائلی :۔ میں ہمیشہ مریض کی فوری حالت سے شروع کرتا ہوں۔ اور پھر ماضی کی طرف اسی حد تک آگے بڑھتا ہوں جتنا کہ ضروری خیال کرتا ہوں۔ دیکھئے نا، آپ کی بچپن کی یادیں محض ــــ میرا مقصد ہے کہ آپ کی موجودہ دماغی حالت میں ــــ محض من گھڑت باتیں ہوں گی۔ اور آپ کے خواب ــــ آپ محض مجھ پر احسان جتانے کی خاطر، بہت ہی غیر معمولی خواب گھڑ لیں گے . . . . میں اس وقت جس قسم کے خواب چاہوں، آپ کو ویسے ہی خواب دیکھنے کے قابل بنا سکتا ہوں۔ اور یہ خواب، دلچسپی کے احساس کے وقتی محرک کے طور پر، صرف آپ کی خود پسندی کے جذبہ کی تسکین کر سکیں گے۔

ایڈورڈ:۔ مگر مجھے تو اپنی کوئی اہمیت نہ ہونے کے خیال نے پاگل کر رکھا ہے۔

رائلی :۔ بالکل ٹھیک۔ اور میں آپ کے اندر اہمیت کا احساس پیدا کر سکتا ہوں۔ اور آپ اسے بہت ہی معرکتہ الآرا علاج تصور کرنے لگیں گے۔ اور پھر آپ سے جہاں تک ممکن ہوسکے گا، آپ خرابی بسیار کا باعث بنتے رہیں گے ـــــ تاوقتیکہ آپ خود خرابی کا شکار نہ ہوجائیں۔ دنیا میں جتنی خرابی ہے، اس کا بڑا حصہ ان لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، جو اپنے آپ کو اہم محسوس کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد خرابی پیدا کرنے کا نہیں ہوتا ـــــ مگر وہ اس خرابی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ یا یہ کہ انہیں خرابی نظر ہی نہیں آتی۔ اور اگر نظر آتی ہے، تو اس کے لئے جواز تلاش کرتے رہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے آپ کو اچھا سمجھنے کی ایک لامتناہی کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں۔

ایڈورڈ:۔ اگر میں بھی ویسا ہی ہوں، تو میں نے بھی بہت خرابی پیدا کی ہوگی۔

رائلی :۔ ارے نہیں، اتنی نہیں جتنی آپ خیال کرنا چاہیں گے۔ ہاں، اتنا کہنا کافی ہوگا کہ آپ نے اتنی ہی خرابی پیدا کی جتنی آپ کے بس میں تھی۔ ہاں، تو اب آپ مجھے یہ بتایئے کہ میرے جانے کے بعد کیا کیا ہوا؟

ایڈورڈ:۔ اب میری سمجھ میں آرہا ہے کہ میں کیوں یہ چاہتا تھا کہ میری بیوی واپس آجائے۔ اسنے مجھے جو کچھ بنا دیا تھا، وہی اس کا سبب تھا۔ ابھی ہم پندرہ منٹ کے لئے اکیلے بیٹھے ہی تھے کہ مجھے، زندگی میں پہلی بار، اس تشدد کا احساس ہوا۔ اس غیر حقیقی کردار کا احساس ہوا جسے ادا کرنے کے لئے اسنے نہایت ضد اور ایک ایسی لاشعوری اور غیر انسانی قوت کے ساتھ مجھے مجبور کر دیا تھا، جو بعض عورتوں میں ہوا کرتی ہے۔ اور یہ احساس بہت ہی شدید بنتا گیا۔ اس کے بغیر، زندگی ایک خلا معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی، تو جیسے میں تحلیل ہوتا گیا۔ اور میرا وجود ختم ہو گیا۔ اسنے میرا یہ عالم کر دیا تھا! میں اسکے ساتھ نہیں رہ سکتا ـــ یہ اب ناقابل برداشت ہے۔ میں اسکے بغیر بھی نہیں رہ سکتا، کیونکہ اس نے

مجھے اپنا علیحدہ وجود رکھنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ صرف پانچ سال ساتھ رہنے سے اسنے میری یہ حالت کردی ہے! اسنے دنیا کو میرے لئے ایسی جگہ بنا دیا ہے جسکے اندر میں اسکے مقرر کردہ شرائط کو مانے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں تنہا ہونا چاہتا ہوں لیکن اس کی دنیا میں نہیں۔ اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنے سینیٹوریم میں داخل کردیں۔ وہاں مجھے تنہائی مل جائے گی نا؟

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

ہارکورڈ ریلی:۔ (ٹیلی فون پر) ہاں

(ایڈورڈ سے) ہاں، وہاں آپ تنہا ہو سکتے ہیں۔

ایڈورڈ:۔ میں اس حیرت میں ہوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا تھا، اس کا ایک لفظ بھی آپ سمجھے ہیں کہ نہیں۔

ریلی:۔ مسٹر چیمبرلین، صبر سے کام لیجئے: آپ کی حرکات وسکنات کا جائزہ لینے سے، اور آپ کو جی کھول کر باتیں کرنے پر آمادہ کرنے اور جو باتیں آپ نہیں کہتے ان کا اندازہ کر لینے سے میں بہت سی چیزیں جان لیتا ہوں۔

ایڈورڈ:۔ ایک مرتبہ مجھے شدید جسمانی اذیت کا تجربہ ہو چکا ہے۔ اور اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس سے بھی شدید تر اذیت ممکن ہے۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے، اگر انسان کو حیرت کا احساس کرنیکا وقت حاصل ہو جائے: میں جسم کی موت سے قطعی خائف نہیں ہوں، مگر یہ موت بڑی دہشت ناک ہے ـــ روح کی موت ـــ کیا آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں کتنی اذیت میں مبتلا ہوں۔

ریلی:۔ میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔

ایڈورڈ:۔ میں خود کے لئے اب کوئی عمل نہیں کرسکتا۔ آپ سے ملنے کا فیصلہ ـــ یہی آخری فیصلہ تھا جو میں کرسکا۔ اب میں آپ کے سپرد ہوں۔ اس سے آگے میں کوئی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔

ریلی:۔ بہت سے مریض یہی عقیدہ لے کر آتے ہیں۔

ایڈورڈ:۔ تو پھر آپ مجھے سینیٹوریم بھیجیں گے؟
رائلی:۔ آپ مجھے اور کچھ نہیں بتانا چاہتے؟
ایڈورڈ:۔ میں اور کیا بتا سکتا ہوں؟ آپ میرے ماضی کی باتیں تو سننا نہیں چاہتے۔
رائلی:۔ نہیں، میں آپ کے ماضی کی باتیں سننا نہیں چاہتا۔
ایڈورڈ:۔ تو مجھے سینیٹوریم بھیج دیں گے نا آپ؟ میں اب گھر نہیں جا سکتا۔ اور میرے کلب میں سات دن سے زیادہ کمرہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ کسی ہوٹل میں جا کر رہنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ اور پھر مجھے کچھ اور قمیصوں کی ضرورت ہے ــــ آپ میری بیوی سے کہہ کر میرا سامان اور دیگر ضروریات کی چیزیں منگوا لیجئے گا۔ مگر آپ اسے یہ نہ بتایئے گا کہ میں کہاں پر ہوں۔ کیا وہ کافی دور ہے؟
رائلی:۔ یوں کہئے کہ کافی لمبا سفر ہے۔ مگر آپ جیسے مریض کا علاج شروع کرنے سے پہلے، مجھے اور کئی باتوں کو معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ جتنا کہ ایک مریض ہمیشہ بتا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے اکثر یہ ہوتا ہے کہ میرے مریض ایک ایسی مکمل صورتِ حال کے مختلف اجزا کی طرح ہوتے ہیں جس کی باضابطہ تفتیش کرنا بہت ضروری ہے۔ ایک واحد مریض، جو محض، انفرادی طور پر بیمار ہو، شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ حال ہی میں میرے پاس ایک اور مریض آئے تھے جن کی حالت تقریباً آپ کی سی ہے۔

(میز پر لگے ہوئے بٹن کو تین مرتبہ دباتا ہے)

آپ کو ایک غیر معمولی طریقۂ کار کو قبول کرنا ہوگا: میں اس دوسرے مریض سے آپ کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔
ایڈورڈ:۔ کیا مطلب؟ یہ دوسرے مریض کون ہیں؟ میں اس طریقۂ کار کو بہت ہی غیر ذمہ دارانہ فعل سمجھتا ہوں ــــ میں دوسرے مریض کے سامنے اپنے "کیس" پر کوئی گفتگو نہ کروں گا۔
رائلی:۔ اسکے برعکس، اس پر گفتگو کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ آپ نے تو مجھے کچھ نہیں

بتایا۔ آپ کو جب موقع ملا، تو آپ نے مجھے اس بات پر قائل کرنے کے لئے بہت کچھ کہہ دیا ہے کہ جیسے جیسے آپ باتیں کرتے جا رہے تھے، آپ اپنے 'کیس' کو مکمل کرتے جا رہے تھے۔ ایک بیرسٹر کو عدالت میں پیش ہونے سے پیشتر مقدمہ کا علم ہونا بھی تو ضروری ہے۔

ایڈورڈ:۔ کم از کم یہاں سے چلے جانے کے لئے تو میں آزاد ہوں۔ اور اب میں بھی سوچ رہا ہوں۔ میں نے عزم کر لیا ہے۔ میں کسی ہوٹل میں چلا جاؤں گا۔

رائلی:۔ مسٹر چیمبرلین آپ جو میرے پاس آئے ہیں، وہ اس لئے کہ آپ آزاد نہیں ہیں۔ اب یہ میرے ہاتھ میں ہے کہ میں آپ کو ـــ آزادی دے دوں۔ یہ میرا کام ہے۔

(نرس سکریٹری لیوینیا کے ساتھ اندر داخل ہوتی ہے)

لیجئے، یہ ہیں وہ مریض۔

ایڈورڈ:۔ لیوینیا!

لیوینیا:۔ مگر، سر ہینری! میں نے تو یہ کہا تھا کہ میں اپنے شوہر کے متعلق بات کرنے آؤں گی؛ میں نے یہ کب کہا تھا کہ میں اس سے ملنے کے لئے بھی تیار ہوں!

ایڈورڈ:۔ اور لیوینیا، مجھے بھی تم سے ملنے کی کوئی توقع نہ تھی۔ میں تو اسے ایک ذلیل چال کہوں گا۔

رائلی:۔ عزت سے دیانت داری مقدم ہے۔ مسٹر چیمبرلین! براہ کرم آپ دونوں بیٹھ جائیں۔ مسز چیمبرلین، آپ کے شوہر سینیٹوریم میں داخل ہونا چاہتے ہیں اور یہ معاملہ قدرتی طور پر آپ سے بھی تعلق رکھتا ہے۔

ایڈورڈ:۔ میں کسی سینیٹوریم میں نہیں جا رہا ہوں۔ میں تو ہوٹل جا رہا ہوں۔ لیوینیا، تمہارا بہت کرم ہوگا، اگر مجھے کچھ کپڑے بھجوا دو۔

لیوینیا:۔ کون، کس ہوٹل میں؟

ایڈورڈ:۔ مجھے کیا معلوم ـــ میرا مطلب ہے، تمہارا اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

لیوینیا:۔ اگر یہ بات ہے، ایڈورڈ، تو پھر تمہارے کپڑوں سے بھی میرا کوئی سروکار نہیں۔

(رائلی کو مخاطب کرکے)

میرا خیال ہے کہ آپ انہیں اسی سینیٹوریم میں بھیجیں گے، جہاں مجھے بھیجا تھا۔ ٹھیک ہے نا؟ ہاں، مجھ سے زیادہ انہیں اس کی ضرورت ہے۔

رائلی:۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ اس معاملہ کو ــــ کم از کم فی الوقت ــــ اس نقطۂ نظر سے دیکھ رہی ہیں۔ لیکن مسز چیمبرلین، آپ کبھی سینیٹوریم نہیں گئیں۔

لیونیا:۔ کیا مطلب؟ میں نے کہا تھا کہ مجھے وہاں بھیج دیجئے۔ اور آپ نے مجھے وہاں بھیج دیا تھا۔ اگر وہ سینیٹوریم نہیں تھا، تو کیا تھا؟

رائلی:۔ ایک قسم کا ہوٹل تھا ــــ ایسے لوگوں کے لئے گوشۂ عافیت، جو یہ سوچتے رہتے ہیں کہ انہیں روزمرہ کی ہماہمی سے فرار چاہیئے۔ یہ لوگ تر و تازہ ہو کر وہاں سے واپس آتے ہیں۔ مگر جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ سینیٹوریم ہے، تو یہی ایک اچھا سبب ہے کہ ان کو وہاں نہ بھیجا جائے۔ جن لوگوں کو میرے سینیٹوریم جیسے مقام کی ضرورت ہوتی ہے، وہ آسانی سے دھوکے میں نہیں آتے۔

لیونیا:۔ آپ کوئی شیطان ہیں یا پاگل مسخرے؟

ایڈورڈ:۔ میں اس دوسری وضاحت کو، لفظ 'پاگل' کے بغیر زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔ مگر تم سینیٹوریم کیوں جانا چاہتی ہو؟ میں نے زندگی بھر تم سے کم ذہنی الجھنیں رکھنے والا شخص نہیں دیکھا۔ تم..... تم تو ایک جنگی جہاز سے بھی زیادہ مضبوط ہو۔ اسی نے تو مجھے پاگل بنا دیا ہے۔ صرف مجھے ہی سینیٹوریم میں جانے کی ضرورت ہے مگر میں وہاں نہیں جاؤں گا۔

رائلی:۔ آپ صحیح کہتے ہیں، مسٹر چیمبرلین۔ آپ کا کیس، سینیٹوریم کے لائق نہیں ہے۔ آپ اس سے کہیں زیادہ بیمار ہیں۔

ایڈورڈ:۔ کہیں زیادہ بیمار ہوں، پھر تو بہتر یہی ہے کہ میں کسی گاؤں کے مسافر خانہ میں جا کر بیمار پڑا رہوں۔

لیونیا:۔ ایڈورڈ، وہ تمہارے لئے موزوں نہ ہوگا۔ "نیو فارسٹ" میں مجھے ایک ہوٹل سوجھ

ہے .....

ایڈورڈ۔ تمہاری کیا بات ہے، لیونیا! تم ہمیشہ بہتر چیزوں کو ہی تو جانتی ہو!

لیونیا:۔ بات صرف اتنی ہے کہ تمہارے مقابلے میں میرا ذہن زیادہ کارآمد ہے۔ یہ تو تم بھی جانتے ہو ایڈورڈ۔

ایڈورڈ:۔ میں جانتا ہوں مگر محض اس لئے کہ تم اکثر یہی کہتی رہتی ہو۔ ذرا انکم ٹیکس کا فارم بھر کر دکھاؤ تو جانوں!

لیونیا:۔ حماقت کی باتیں نہ کرو، ایڈورڈ۔ لفظ کارآمد سے میری مراد اُن چیزوں میں کارآمد ہونا ہے، جو حقیقتاً اہمیت رکھتی ہیں۔

رائلی:۔ کیا میں اس دلچسپ بحث میں مخل ہو سکتا ہوں؟ میں یہ کہتا ہوں کہ آپ دونوں بیمار ہیں۔ میرے سینیٹوریم میں داخل ہونے کے لئے، کئی ایک علامتیں جن کا ایک ساتھ اور نمایاں طور پر واقع ہونا بہت ضروری ہے: اور ان میں ایک علامت دیانتدار ذہن ہے۔ یہی ان کی اذیت کا ایک بڑا سبب ہے۔

لیونیا:۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میرے شوہر کے پاس ایک دیانتدار ذہن ہے۔

ایڈورڈ:۔ اور لیونیا، میں بھی دیانتداری سے تمہارے لئے اس کی حامی نہیں بھر سکتا۔

رائلی:۔ میں آپ دونوں کو آپ کی ذہنی وسعت پر مبارک باد کہتا ہوں۔ آپ ایک دوسرے کے لئے جو ہمدردانہ افہام و تفہیم کا جذبہ رکھتے ہیں، وہ آپ کو اس بات کی قدر کرنے پر آمادہ کرے گا۔ جو میں اب آپ سے کہنے والا ہوں۔ میں عامیانہ قسم کے مکار، یا معصومیت کی حد تک انتہائی احمق لوگوں کے علاج کی زحمت نہیں اٹھاتا: میرے مریض آپ کی طرح خود فریب لوگ ہوتے ہیں، جو اپنے آپ کو فریب دینے میں بے انتہا محنت کرتے ہیں، اپنے آپ کو نڈھال کر دیتے ہیں لیکن پھر بھی کامیاب نہیں ہو پاتے۔ آپ دونوں مجھ سے مشورہ کرنے کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں۔ اور دونوں اپنے مرض کی خود ساختہ تشخیص مجھ پر عاید کر رہے ہیں اور علاج بھی خود ہی تجویز کر رہے ہیں۔ مگر یاد رکھئے کہ جب آپ نے

خود کو میرے ہاتھوں میں دے دیا ہے، تو جتنا آپ اپنے تئیں سوچ چکے تھے، اس سے کہیں زیادہ میرے بس میں آجاتے ہیں۔ مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش کا یہی نتیجہ ہے۔

لیونیا: میں یہاں اپنی توہین کرانے نہیں آئی۔

رائلی: آپ وہاں آگئی ہیں، جہاں لفظ "توہین" کے کوئی معنے نہیں ہیں۔ یہ تو آپ کو برداشت کرنا ہوگا۔ آپ نے ـــــ آپ دونوں نے ـــــ مجھے جو کچھ بتایا ہے، ایک حد تک صحیح تھا: آپ نے اپنے اپنے احساسات ـــ چند احساسات۔ تو بیان کر دیئے، مگر اہم حقائق بتانا بھول گئے۔ آیئے، پہلے آپ کے شوہر سے نمٹ لیں ـــ

(ایڈورڈ سے مخاطب ہو کر) آپ مس کوپل سٹون سے اپنے تعلقات کو چھپا کر مجھ سے جھوٹ بول رہے تھے۔

ایڈورڈ: غضب خدا کا! میری بیوی کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔

لیونیا: ارے واہ، ایڈورڈ! اگر میں اندھی تھی، تو مجھے بتانے کے لئے اور بھی تو کئی لوگ موجود تھے۔ میرے خیال میں، کوئی ایسا شخص نہ تھا جسے اس کا علم نہ ہو۔

رائلی: ایک ایسا شخص ضرور تھا۔ مگر مسز چیمبرلین، آپ نے مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ یہی بات تھی، جسے دریافت کرنے پر آپ کا بقول آپکے نروس بریک ڈاؤن ہونے لگا تھا۔

لیونیا: بالکل سچ کہا تھا میں نے! میں بالکل ہی نڈھال ہو چکی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اب میں کچھ صحت یاب ہو گئی ہوں۔

رائلی: ہاں، آپ یقیناً بالکل نڈھال ہو گئی تھیں۔ اور یقیناً آپ کچھ صحت یاب بھی ہو چکی ہیں۔ مگر آپ یہ ذکر کرنا بھول گئیں، کہ آپ کے غم کی وجہ آپ کے عاشق کی بے وفائی تھی ـــ اور وہ، اچانک اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ، کسی سے محبت کرنے لگا تھا۔ اور جس سے اسے محبت ہو گئی، اس سے رقابت کی آپ کے پاس وجہ تھی۔

ایڈورڈ۔ بہت خوب، لیونیا! یہ تو بڑا دلچسپ معاملہ ہے۔ تم بات چھپانے میں مجھ سے بھی زیادہ کامیاب نکلیں۔ اب میں اس حیرت میں ہوں کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔

لیونیا:۔ اگر آپ بتانا ہی چاہتے ہیں، تو انہیں بتا دیجئے نا۔

رائلی:۔ پیٹر نامی ایک نوجوان ہے۔

ایڈورڈ۔ پیٹر؟ پیٹر کون؟

رائلی:۔ مسٹر پیٹر کٹلپ، جو آپ کے ہاں اکثر آتا رہتا تھا۔

ایڈورڈ۔ پیٹر کوئلپ۔ پیٹر کوئلپ! بہت خوب، لیونیا! میں تمہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ تمہارا انتخاب ایسا ہے جس پر مجھے کبھی کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اور پھر وہ سیلیا کے بابت مجھے اپنے راز بتانے آیا تھا! میں نے کبھی ایسی مضحکہ خیز بات نہیں سنی: ایسا پُرلطف مذاق کبھی نہ ہوا ہوگا۔

لیونیا:۔ مجھے ہرگز معلوم نہ تھا کہ تم حسنِ مذاق بھی رکھتے ہو۔

رائلی:۔ یہ سب سے پہلی امید افزا علامت ہے۔

لیونیا:۔ آپ کو یہ سب کچھ کیونکر معلوم ہوا۔

رائلی:۔ یہ میں نہیں بتا سکتا۔ اپنے مریضوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا میرا اپنا ایک الگ طریقہ ہے آپ مجھے یہ طریقہ بتانے پر مجبور نہ کریں —— یہ میرے پیشہ ورانہ ضابطۂ اخلاق کا معاملہ ہے۔

لیونیا:۔ آج تو آپ کے برتاؤ میں مجھے کوئی پیشہ ورانہ اخلاق نظر نہیں آیا۔

رائلی:۔ آپ نے صحیح نکتہ پر میری گرفت کی ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آپ کی جن باتوں کا انکشاف میں نے آپ کے سامنے کیا ہے، وہ باتیں آپ نے مجھے نہیں بتائی تھیں۔ جو معلومات میں نے آپ دونوں کو فراہم کی ہیں، وہ بیرونی ذرائع سے حاصل کی گئی تھیں مسز چیمبرلین، دو ماہ قبل، جب آپ میرے پاس تشریف لائی تھیں، اس وقت آپ نے اپنی جذباتی کشمکش کے جو وجوہات بیان کئے تھے، میں ان سے مطمئن نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اور ذرائع سے معلومات

حاصل کیں۔

ایڈورڈ:۔ اچھا! تمہارے بریک ڈاؤن کو دو مہینے ہو گئے اور مجھے معلوم تک نہ ہوا۔

لیونیا:۔ تم تو کسی چیز کا خیال ہی نہیں کرتے تم نے کبھی میرا کوئی خیال نہیں کیا۔

رائلی:۔ اب میں آپ دونوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ میں کتنی باتیں مشترک اور یکساں ہیں
درا صل میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ دونوں غیر معمولی حد تک ایک دوسرے کے لئے موزوں ہیں۔ مسٹر چیمبرلین، جب آپ نے یہ سوچا کہ آپ کی بیوی آپ کو چھوڑ کر چلی گئی ہیں، اسوقت آپ کو یہ معلوم کر کے بڑا تعجب اور بڑی کوفت ہوئی کہ آپ دراصل مس کوپل سٹون سے محبت نہیں کرتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیونیا:۔ میرے شوہر نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔

رائلی:۔ اور آپ ان کی وجہ سے کسی قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس بات نے آپکی خودی کو ٹھیس پہنچائی۔ آپ اپنے آپ کو ایک بہت ہی جذباتی "قسم کا عاشق تصور کرنا چاہتے تھے۔ اور پھر آپ کو اس بات کا احساس ہوا، جو آپ کی بیوی نے ابھی ابھی بتائی کہ آپ نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ ایسے میں آپ کو یہ شبہ ہونے لگا کہ آپ محبت کرنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ بعض لوگوں کے لئے یہ شبہ کہ وہ محبت کرنے کے اہل نہیں ہیں ان کی خودداری کے لئے اتنی ہی پریشان کن بات ہے جتنی کہ عامیانہ قسم کے لوگوں کے لئے یہ خیال کہ وہ نامرد ہیں۔

لیونیا:۔ ایڈورڈ، تم بہت ہی سرد جذبات کے آدمی ہو۔

رائلی:۔ اب جب آپ نے بات چھیڑ دی ہے، تو اب آیئے آپ کے مسئلہ کا بھی تجزیہ کر لیں مسز چیمبرلین۔ جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ آپ کے نوجوان دوست (حالانکہ آپ خوب اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ آپ سے محبت نہیں کرتا، اور آپ ہمیشہ اس احساس سے ذلت محسوس کرتی تھیں کہ آپ نے زبردستی اسے یہ حیثیت دے رکھی ہے) ۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ آپ نے جب معلوم کر لیا کہ آپ کے نوجوان دوست دراصل مس کوپل سٹون کی محبت کے اسیر ہو چکے تھے، تو مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کو

یہ بات تسلیم کرنے میں بہت تامل تھا۔ حالانکہ آپ کو شاید یہ بات اس سے پہلے معلوم ہو چکی تھی۔ مجھے یہ شبہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو ایک طویل مدت تک یہ فریب دیتی رہیں کہ آپ کے عاشق ہونے کی عزت حاصل کرنے سے زیادہ وہ اپنے لئے ایک بلند سماجی مقام حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جب آپ اس حقیقت سے دوچار ہوئیں کہ اپنی محبوبہ کے لئے اس کے جذبات، ان جذبات سے مختلف تھے، جو آپ نے اسکے دل میں پیدا کئے تھے ــــ تو آپ لرز اٹھیں۔ آپ کی تمنا تھی کہ کوئی آپ سے محبت کرے۔ آپ یہ محسوس کرنے لگی تھیں کہ آپ سے کبھی کسی نے محبت نہیں کی۔ اور اس کے بعد آپ کو یہ خوف ہونے لگا کہ آپ سے کوئی محبت نہیں کر سکتا۔

ایڈورڈ:۔ لیونیا، مجھے تم سے ہمدردی ہونے لگی ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم غیر معمولی حد تک ناقابلِ محبت ہو۔ مجھے کبھی یہ معلوم نہ ہوا کہ ایسا کیوں ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ میری ہی غلطی تھی۔

رائلی:۔ اور اب، مجھے امید ہے کہ آپ دونوں نے محسوس کرنا شروع کیا ہے کہ آپ میں کتنی باتیں ایک سی ہیں۔ ایک ہی احساس تنہائی۔ ایک مرد جو یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ محبت کرنے کا اہل نہیں ہے ــــ اور ایک عورت جو یہ محسوس کرتی ہے کہ کوئی مرد اس سے محبت نہیں کر سکتا۔

لیونیا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جو بات ہم دونوں میں مشترک ہے، وہ ایک دوسرے سے نفرت کرنے کے لئے کافی ہے۔

رائلی:۔ بلکہ اسے ایک ایسے بندھن کی طرح دیکھئے، جو آپ دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھے ہوئے ہے۔ جب آپ لوگ ذہنی تاریکی کے عالم میں تھے، تو آپ یہ کہہ سکتی تھیں کہ "یہ کسی عورت سے محبت نہیں کر سکتا۔" اور آپ کہہ سکتے تھے کہ "کوئی مرد اس سے محبت نہیں کر سکتا۔" آپ ایک دوسرے کو اپنی اپنی غلطیوں کا الزام دے سکتے تھے، اور اس طرح ایک دوسرے کو سمجھنے سے قاصر رہتے تھے۔ اب آپکو انہی مفروضات کو محض ان کے برعکس معنی دے کر ایک کر دینا ہے۔

لیونیا ۔ کیا یہ ممکن ہے۔

رائلی ۔ جس حالت میں آپ میرے پاس آئے تھے، اگر اسی حالت میں، آپ کو سینیٹوریم بھیج دیتا، تو میں یہ آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ وہ آپ کے لئے اتنا خوفناک عالم ہوتا جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ آپ کے پاس وہی کچھ ہوتا، جو آپ اپنے ساتھ لیکر آئے تھے یعنی تمناؤں کی پرچھائیں۔ آپ ایسی شیطانی قوتوں کا شکار بن جاتے، جو اپنی طاقت کے عروج پر اس وقت پہنچتی ہیں جب آپ انہیں تنہا مل جائیں۔

لیونیا ۔ پھر ایسے میں ہم کیا کر سکتے ہیں جب کہ ہم آگے بڑھ سکتے ہیں نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں؟ ایڈورڈ، ہم کیا کر سکتے ہیں؟

رائلی ۔ آپ نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دے دیا ہے، حالانکہ آپ یہ نہیں جانتیں کہ آپ کیا کہہ چکی ہیں؟

ایڈورڈ ۔ لیونیا، ان کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس بگڑی بات کو بنا لیں تو اچھا ہے۔

رائلی ۔ مسز چیمبرلین، جب آپ یہ معلوم کر لیں گی کہ ہم میں سے اکثر لوگ صرف یہی کر سکتے ہیں کہ بگڑی بات کو بنا لیں۔ سوائے ان لوگوں کے جو ولی اللہ ہوتے ہیں اور ان جیسے لوگ ہی سینیٹوریم میں داخل ہوتے ہیں ـــــ تب آپ یہ اصطلاح بھول جائیں گی۔ اور اس بات کو بھلا دینا ہی حالات کو تبدیل کر دے گا۔

لیونیا ۔ ایڈورڈ، اگر تم جانا ہی چاہتے ہو، تو میں سچ کہتی ہوں کہ نیو فارسٹ میں ایک اچھا ہوٹل ہے۔ اس کا مالک، جس نے حال ہی میں اسے خریدا ہے، الکزن کا دوست ہے۔ اگر چاہو، تو میں خود تمہارے ساتھ چلی چلوں گی، اور اگر تم تنہائی چاہتے ہو، تو میں تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس چلی آؤں گی . . . . .

ایڈورڈ ۔ مگر میں وہاں نہیں جا سکتا! پیر کے روز مجھے ایک مقدمہ کی پیروی کرنا ہے۔

لیونیا ۔ تو کیا اپنے کلب میں ہی رہو گے؟

ایڈورڈ ۔ نہیں وہ اجازت نہیں دیں گے ۔ مجھے کل ہی اسے چھوڑنا ہو گا ـــــ مگر تمہیں کیسے

معلوم ہوا کہ میں کلب میں قیام کئے ہوئے ہوں۔

لیونیا:۔ یہ کیا کہتے ہو، ایڈورڈ! مجھ میں ابھی ذمہ داری کا احساس باقی ہے۔ میں تمہارے لئے وہاں کچھ قمیصیں لے جانا چاہتی تھی۔

ایڈورڈ:۔ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ گھر چلا جاؤں۔

لیونیا:۔ تو آؤ، ہم ایک ہی ٹیکسی میں چپلے چلتے ہیں۔ کچھ کفایت شعاری ہو جائے گی۔ ایڈورڈ جانے سے پہلے تم ان سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟

ایڈورڈ: ہاں، پوچھنا تو ہے مگر کہنا بڑا مشکل ہے۔

لیونیا:۔ کہہ دو تو اچھا ہے۔ کم از کم میں یہ چاہتی ہوں کہ تم ان سے ایک بات پوچھ لو۔

ایڈورڈ:۔ وہ بات دوسروں کے . . . . مستقبل کے متعلق ہے۔ میں دوسرے لوگوں کی بربادی پر اپنی زندگی تعمیر کرنا نہیں چاہتا۔

لیونیا:۔ بالکل ٹھیک۔ اور مجھے بھی ایک سوال پوچھنا ہے۔ سر ہینری، کیا وہ تار آپ ہی نے بھیجے تھے۔

رائلی:۔ میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کے شوہر کے مسائل حل کر دوں۔

(ایڈورڈ سے) آپ کا کام یہ نہیں ہے کہ آپ اپنا ضمیر صاف کرتے رہیں، بلکہ یہ ہے کہ آپ اپنے ضمیر پر بوجھ اٹھانا سیکھ لیں۔ دوسرے لوگوں کے مستقبل سے آپ کا کوئی سروکار نہیں ہے۔

لیونیا:۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ نے میرے سوال کا جواب بھی دے دیا ہے۔ ان لوگوں کو خود ہمیں بتانا چاہئے کہ انہوں نے اپنے فیصلے کر لئے ہیں۔

ایڈورڈ: سر ہینری، آپ کو ہم سے کچھ اور بھی کہنا ہے؟

رائلی:۔ نہیں، اس حیثیت سے کچھ بھی نہیں کہنا۔

(ایڈورڈ اپنا چیک بک جیب سے نکالتا ہے اور رائلی ہاتھ اٹھا کر اسے منع کرتا ہے)

میری سکریٹری آپ کو میرا حساب بھیج دے گی۔ اطمینان سے جائیے اور اپنی نجات

حاصل کرنے کے لئے محنت و قابلیت سے کام لیجئے۔

(ایڈورڈ اور لیونیا چلے جاتے ہیں)

(رائلی کوچ کی طرف جاتا ہے اور جاکر لیٹ جاتا ہے ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے وہ اٹھکر بات کرنے لگتا ہے)

رائلی :۔ کون ؟ ہاں ..... اندر آجاؤ۔

(جولیا ایک طرف کے دروازے سے داخل ہوتی ہے)

وہ نیچے انتظار کر رہی ہے

جولیا :۔ مجھے معلوم ہے، ہیزی۔ میں ہی تو اسے اپنے ساتھ لائی ہوں۔

رائلی :۔ اچھا ؟ کہیں تم نے اسے یہ تو نہیں بتا دیا کہ اس سے پہلے تم مجھ سے ملوگی۔

جولیا :۔ ارے نہیں۔ میں نے ٹیکسی میں اسے یہاں تک چھوڑا، اور پھر میں ٹیکسی کو آگے سڑک کے موڑ تک لے گئی تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد، پچھلے دروازے سے اندر چلی آئی۔ میں صرف تمہیں یہ بتانے کے لئے آگئی کہ اب وہ فیصلہ کرنے کے لئے بالکل تیار ہے۔

رائلی :۔ کیا اسے بات ماننے میں کچھ تامل تھا ؟ کیا اسی لئے تم اسے اپنے ساتھ لائی ہو ؟

جولیا :۔ نہیں، اسے کوئی تامل نہ تھا ۔ صرف تذبذب تھا۔ اسے یہ یقین نہیں آتا کہ تم سنجیدگی سے اس کی بات پر توجہ دوگے ۔

رائلی :۔ ہاں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے ۔

جولیا :۔ اسے یہ بھی خیال ہے کہ وہ سنجیدگی سے توجہ کے قابل ہی نہیں ہے ۔

رائلی :۔ یہ تو بہت ہی غیر معمولی بات ہے

جولیا :۔ ہنری، اب اٹھ بھی جاؤ۔ تم اتنے تو تھکے ہوئے نہیں ہو۔ میں دوسرے کمرے میں انتظار کرتی ہوں ۔ اور اسکے چلے جانے کے بعد واپس آجاؤں گی ۔

رائلی :۔ ہاں، اسکے چلے جانے کے بعد۔

جولیا :۔ کیا الکز یہاں آئے گا ؟

رائلی :۔ ہاں، وہ بھی آئے گا۔

(جولیا باہر چلی جاتی ہے)
(رائلی بٹن دباتا ہے۔ نرس سکریٹری سیلیا کو ساتھ لئے
اندر داخل ہوتی ہے)

رائلی :۔ مس کوپل سٹون؟ ... تشریف رکھئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ مسز شٹل تھویٹ کی
دوست ہیں۔

سیلیا:۔ ہاں، جولیا نے ... مسز شٹل تھویٹ نے ہی مجھے آپ کے پاس آنے کا مشورہ
دیا تھا۔ مگر مجھے یوں لگتا ہے، جیسے میں آپ سے پہلے بھی مل چکی ہوں۔ کہاں ملے
تھے ہم؟ ... ہاں، یاد آیا۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا۔

رائلی :۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے جسے جاننے کی آپ کو ضرورت ہو۔ میں مسز شٹل تھویٹ
کے ایما پر وہاں آیا تھا۔

سیلیا:۔ اسنے بات کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے۔ خیر میں آپ کا وقت ضائع نہیں
کرنا چاہتی۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ آپ یہی سمجھیں گے کہ میں آپ کا وقت
خراب کر رہی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ جو لوگ آپ سے ملنے آتے ہوں گے، وہ ضرور
بیمار ہوں گے، یا آپ سے ملنے کے لئے اور بہتر وجوہات بتا سکتے ہوں گے۔ مگر
میں کوئی وجہ نہیں بتا سکتی۔ میں محض انتہائی ناامیدی کے عالم میں یہاں آگئی ہوں
اگر آپ مجھے یہاں سے ابھی چلے جانے کے لئے کہہ دیں گے، تو میں بالکل برا نہ مانوں
گی۔

رائلی :۔ مس کاپل سٹون، میرے اکثر مریض آتے ہی اپنا حال بیان کرنے لگتے ہیں کہ انکو
کیا شکایت ہے اور مجھے کیا کرنا ہے۔ انہیں یہ یقین ہوتا ہے کہ ان کا نروس
بریک ڈاؤن ہو چکا ہے۔ وہ اپنے مرض کو اسی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں۔ اور
وہ اکثر یہ سوچتے ہیں کہ ان کے مرض کا ذمہ دار کوئی اور ہے۔

سیلیا:۔ کم از کم میں اپنے سوا کسی کو الزام نہیں دیتی۔

رائلی :۔ اور اسکے بعد، میرے علاج کی تمہید یہ ہوتی ہے کہ میں انہیں یہ بتانے کی کوشش

کرتا ہوں کہ وہ اپنے مرض کی نوعیت کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اور پھر میں انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہوں کہ ان کا مرض اتنا دلچسپ نہیں ہے جتنا کہ وہ تصور کرتے ہیں جب میں اس حد تک پہنچتا ہوں، تو کچھ کرنے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔

سیلیا:۔ خیر، میں اس فریب میں مبتلا نہیں ہوں کہ میری تکلیف کسی دلچسپی کا باعث ہوگی۔ مگر میں اس طرح تمہید بیان نہیں کروں گی۔ میں اپنے آپ کو بالکل صحت مند محسوس کرتی ہوں۔ اگر کام کرنے کے لئے کوئی مشغلہ ہو ـــــ تو میں ایک عملی زندگی بھی بسر کر سکتی ہوں۔ میں یہ بھی تصور نہیں کرتی کہ میں کسی تشدد کا شکار ہوں۔ مجھے آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔ میں کسی فریب میں مبتلا نہیں ہوں ـــــ سوائے اسکے کہ جس دنیا میں میں رہتی ہوں، وہ ایک بہت بڑا فریب معلوم ہوتی ہے! مگر کیا سب سے پہلے آپ کو حالات بتانا مناسب نہیں ہے؟ میں بھول گئی تھی کہ آپ میرے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ اور گزشتہ چند ہفتوں میں جو کچھ مجھ پر بیت چکی ہے، اس سے متاثر ہو کر میں یہ سمجھ بیٹھی کہ اپنی طرف سے مجھے کوئی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

رائلی:۔ فی الوقت میں آپ کے متعلق بہت کچھ جانتا ہوں: آپ تو صرف اپنے ذہن کی موجودہ حالت بیان کر دیجئے۔

سیلیا:۔ دو باتیں ایسی ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں، اور جن کو آپ شاید مرض کی علامتیں تصور کریں۔ مگر اس سے قبل میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں واقعی یہ سوچنا چاہتی ہوں کہ مجھ میں کوئی خرابی ہے ـــ کیونکہ اگر یہ بات نہیں ہے، تو پھر اس دنیا میں ہی کوئی خرابی ہے یا اصل دنیا سے یہ کوئی مختلف دنیا ہے ـــ اور یہ بات بہت ہی بھیانک ہے۔ اور حد سے زیادہ ڈراؤنی۔ اس لئے میں یہ یقین کرنا بہتر سمجھتی ہوں کہ مجھ میں ہی کوئی خرابی ہے جس کا علاج کیا جائے۔ آپ جو کچھ فرمائیں گے میں اس پر عمل کروں گی تاکہ میں پھر 'نارمل' ہو جاؤں۔

رائلی:۔ قبل اس کے کہ ہم یہ فیصلہ کریں کہ 'نارمل' ہونا کیا ہے، میں آپ کے متعلق کچھ اور

بھی معلوم کرنا ہوگا۔ آپ نے دو باتوں کا ذکر کیا تھا۔ پہلی بات کیا ہے؟

یلیا:۔ تنہائی کا احساس۔ لیکن یہ بات کچھ سپاٹ سی معلوم ہوتی ہے۔ میرا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ کوئی تصادم ہوا ہے، حالانکہ تصادم ضرور ہو چکا ہے۔ یہ بات بھی نہیں کہ فریب نظر کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتا ہے، یا یہ کہ میں محض دغابازی کا شکار ہوئی ہوں۔ یہ تو ایسی چیزیں ہیں جو عام طور پر کئی لوگوں کے ساتھ ہوتی رہتی ہیں، اور وہ بہت جلد انہیں بھول جاتے ہیں، یا کم از کم کسی نہ کسی طرح زندگی گذارتے رہتے ہیں۔ نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہوا ہے، اسنے مجھے یہ احساس دلایا ہے کہ میں ہمیشہ سے تنہا ہوں۔ کہ انسان ہمیشہ سے تنہا ہے۔ یہ محض ایک تعلق کے ٹوٹ جانے کی بات نہیں، اور نہ یہ محض ایک احساس کی بات ہے کہ اس تعلق کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ یہ تو ایک انکشاف ہے اس بات کا کہ ہر ایک شخص کے ساتھ میرا کیا تعلق کیا رشتہ ہے۔ آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ اب تو کسی انسان سے بات کرنا بھی بے سود معلوم ہوتا ہے!

لی:۔ آپ کے والدین کہاں ہیں؟

یلیا:۔ وہ دیہات میں رہتے ہیں۔ اب شہر میں رہنا ان کی حیثیت سے باہر ہے۔ ان کی حیثیت بس اتنی ہے کہ وہ دیہات کا گھر چلا سکیں۔ اور پھر وہ گھر خاندان میں اتنے عرصہ سے چلا آرہا ہے کہ وہ اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتے۔

لی:۔ اور آپ لندن میں رہتی ہیں؟

یلیا:۔ میں نے اپنی ایک خالہ زاد بہن کے ساتھ ایک فلیٹ لے رکھا ہے اسوقت وہ ملک سے باہر گئی ہوئی ہیں۔ اور میرے والدین یہ چاہتے ہیں کہ میں وہاں جا کر انکے ساتھ رہوں۔ مگر میرے لئے یہ سخت مشکل ہے۔

لی:۔ تو آپ کسی سے ملنا نہیں چاہتیں؟

یلیا:۔ نہیں.... یہ بات نہیں کہ میں تنہا ہونا چاہتی ہوں۔ بلکہ ہر شخص تنہا ہے۔ یا مجھے یوں ہی محسوس ہوتا ہے۔ لوگ شور مچاتے رہتے ہیں اور اپنے تئیں یہ سمجھتے ہیں

کہ وہ گفتگو کر رہے ہیں۔ لوگ منہ بناتے رہتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو سمجھ رہے ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ ایک دوسرے کو بالکل نہیں سمجھتے۔ کیا یہ خودفریبی ہے۔

رائلی :۔ خودفریبی ایسا عالم ہے جہاں سے واپس لوٹنا ضروری ہوتا ہے۔ ذہن کی اور بھی کیفیتیں ہیں، جنہیں ہم خودفریبی سمجھتے ہیں، جن کو ہمیں تسلیم کرنا ہے اور وہیں سے آگے بڑھنا ہے اور آپ کی دوسری علامت کیا ہے؟

سیلیا:۔ وہ اور زیادہ عجیب ہے۔ بڑی مضحکہ خیز بات ہے ـــــ مگر اس کے لئے ایک ہی لفظ مجھے سوجھتا ہے اور وہ ہے احساسِ گناہ۔

رائلی :۔ آپ کو احساسِ گناہ ہے مس کوپل سٹون؟ یہ بہت ہی غیر معمولی بات ہے۔

سیلیا: مجھے تو یہ بہت ہی 'ایب نارمل' بات معلوم ہوتی ہے۔

رائلی :۔ 'ایب نارمل' کی اصطلاح استعمال کرنے سے قبل، ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ آپ کے لئے 'نارمل' کیا ہے۔ آپ مجھے یہ بتائیے کہ احساسِ گناہ سے آپ کا کیا مطلب ہے؟

سیلیا:۔ جو میرا مطلب نہیں، وہ بتا دینا زیادہ آسان ہے: گناہ سے میرا مطلب وہ نہیں جو عام معنوں میں ہوتا ہے۔

رائلی :۔ اور آپ کے خیال میں عام معنوں میں اس کا مطلب کیا ہے؟

سیلیا:۔ میرا خیال ہے کہ اس کے معنے بداخلاق ہونے کے ہیں ـــــ اور مجھے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ میں بداخلاق تھی: درحقیقت، جن لوگوں کو ہم بداخلاق سمجھتے ہیں، کیا وہ وہی لوگ نہیں جن کے لئے ہم کہتے ہیں کہ انہیں اخلاق کا احساس تک نہیں ہے؟ میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ بداخلاقی کے ساتھ احساسِ گناہ بھی ہوتا ہو: کم از کم میرے مشاہدے میں یہ بات نہیں آئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ دوسروں کو دکھ پہنچانا، یہ جانتے ہوئے کہ آپ انہیں دکھ پہنچا رہے ہیں، بہت بڑا ظلم ہے۔ میں نے اسے کوئی دکھ نہیں پہنچایا ہے۔ میں اس سے کوئی چیز ـــ جسے وہ چاہتی تھی ـــ چھین کر نہیں لے رہی تھی میں شاید احمق سی ہو رہی تھی: مگر مجھے اپنے احمق ہونے پر کوئی افسوس نہیں ہے۔

رائلی :۔ اور آپ کے خاندان کا نقطۂ نظر کیا ہے؟
سیلیا :۔ میری پرورش خاصے روایتی انداز میں ہوئی۔ مجھے ہمیشہ گناہ میں عقیدہ نہ رکھنے کی تعلیم دی گئی۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ کبھی اس کا ذکر بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ ہر خرابی، ہمارے نقطۂ نظر سے، بد اسلوبی تھی یا نفسیاتی تھی۔ بد اسلوبی سے ہمیشہ تباہی آجاتی تھی کیونکہ جن لوگوں کو ہم جانتے تھے، وہ اسے برا سمجھتے تھے۔ مجھے، بذاتِ خود اسلوب کی کوئی فکر نہیں ہے ــــ مگر جب ہر چیز کو بد اسلوبی یا ذہنی الجھاؤ میں شمار کیا جائے، تو آدمی یا تو بد اسلوب بن جاتا ہے، اور کوئی پرواہ نہیں کرتا، یا پھر اگر پرواہ کرنے لگے تو خبطی ہو جاتا ہے۔
رائلی :۔ تو آپ سمجھتی ہیں کہ آپ اسی ذہنی الجھاؤ میں مبتلا ہیں؟
سیلیا :۔ مگر اس وقت ہر چیز کتنی صحیح معلوم ہوتی تھی! میں اسکے متعلق، بار بار سوچتی رہی ہوں، اور اب میں سمجھ چکی ہوں کہ وہ ایک غلطی تھی۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ غلطیوں سے انسان اپنے آپ کو گنہگار کیوں محسوس کرنے لگتا ہے! باوجود اس خیال کے، مجھے اس کے لئے کوئی اور لفظ نہیں ملتا۔ یہ ایک ڈراؤنے خواب کی کوئی صورت معلوم ہوتی ہے۔ اور پھر میں اس خوف سے کانپ کانپ جاتی ہوں کہ یہ خواب میرے تمام عقائد سے بھی زیادہ حقیقی ہے۔
رائلی :۔ وہ کیا چیز ہے جو آپ کے عقائد سے بھی زیادہ حقیقی ہے۔
سیلیا :۔ یہ کسی عمل کا احساس نہیں ہے، جو میں نے کبھی کیا ہو اور جسکے نتائج سے میں بچنا چاہوں اور نہ یہ کسی ایسی چیز کا احساس ہے جو میرے اندر ہو اور جس سے میں نجات پانا چاہوں ــــ بلکہ یہ تو میرے وجود سے باہر کسی شخص یا کسی چیز کی نسبت ایک خلا یا ناکامی کا احساس ہے۔ اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے مجھے اس کا... کفارہ ادا کرنا چاہیئے۔ یہی لفظ ہے نا اس کے لئے؟ کیا آپ کسی مریض کی ایسی ذہنی کیفیت کا علاج کر سکتے ہیں؟
رائلی :۔ آپ کے خیال میں اس شخص سے آپ کے تعلقات کس نوعیت کے تھے؟

سیلیا :۔ اوہ، تو آپ نے اسکے متعلق اندازہ کرلیا تھا ہے نا؟ آپ بڑے ہوشیار نکلے نہیں شاید میں نے ہی بات واضح کردی تھی۔ آپ کو اس کے متعلق جاننے کی ضرورت تو نہیں — کیوں؟

رائلی :۔ نہیں۔

سیلیا :۔ شاید، میں ایک خاص نوع ("ٹائپ") کی انسان ہوں۔

رائلی :۔ مختلف انواع ہوتے ہیں بعض انواع نسبتاً شاذ ہوتے ہیں۔

سیلیا :۔ میں یہ سوچتی تھی کہ میں اسے بہت کچھ دے رہی تھی! اور وہ بھی مجھے بہت کچھ دے رہا تھا — اور یہ دینا اور لینا کتنا صحیح معلوم ہوتا تھا: اس حساب کے نقطۂ نظر سے نہیں کہ ساری جو شخصیتیں پہلے تھیں ان کے لئے کیا اچھا تھا، بلکہ اس نئی شخصیت کے لئے، جو "ہم" تھے۔ اگر میرے احساسات اُسی طرح کے ہوتے، جیسے اس وقت تھے، تو یہ اب بھی صحیح معلوم ہوگا۔ اور پھر میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ ہم دونوں محض اجنبی تھے، اور کوئی دینا ہوا تھا، نہ لینا — بلکہ ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا تھا۔ بڑی وحشت انگیز بات ہے یہ۔ کیا ہم صرف اسی چیز سے محبت کرسکتے ہیں، جو ہمارے تخیل نے پیدا کی ہو؟ کیا واقعی ہم لوگ نہ محبت کرتے ہیں اور نہ محبت کئے جانے کے قابل ہیں؟ اگر یونہی ہے، تو پھر ہر شخص حقیقتاً تنہا ہے۔ اور پھر عاشق اور معشوق دونوں یکساں طور پر غیر حقیقی ہیں۔ اور خواب دیکھنے والا بھی اپنے خوابوں کی طرح اتنا ہی غیر حقیقی ہے۔

رائلی :۔ اس شخص کو — وہ شخص اب آپ کو کیسا لگتا ہے؟

سیلیا :۔ ایک ایسے بچے کی طرح جو ایک خیالی ساتھی کے ساتھ کھیلتا ہوا جنگل میں بھٹک جائے — اور اچانک اسے یہ احساس ہوجائے کہ وہ تو محض ایک بچہ ہے، جو جنگل میں راہ بھول کر گھر واپس جانا چاہتا ہے۔

رائلی :۔ شاید یہ ایک اشارہ ہو، جس کے طفیل جنگل سے نکل آنے کی صورت پیدا ہوجائے۔

سیلیا :۔ لیکن اگر میں جنگل سے نکل آنے کا راستہ پا بھی لوں، تو مجھے اس خزانہ کی ناقابلِ تلافی یاد تڑپاتی رہے گی، جس کی تلاش میں، میں جنگل کی طرف گئی تھی، اور اسے پا نہ سکی۔ اور

جو وہاں موجود نہ تھا اور شاید کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ کہیں بھی موجود نہیں ہے، تو میں اپنے آپ کو اسے پا نہ سکنے کی گنہگار کیوں محسوس کرتی ہوں؟

رائلی :۔ فریبِ نظر کا ٹوٹنا خود ایک فریب ہو سکتا ہے اگر انسان اسی عالم پر مطمئن ہو جائے۔

سیلیا :۔ میں حجت نہیں کر سکتی۔ یہ بات نہیں کہ میں پھر چوٹ کھانے سے ڈرتی ہوں: اب تو کوئی چیز مجھے نہ زخم لگا سکتی ہے، اور نہ اچھا کر سکتی ہے۔ ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب میں اکثر سوچتی ہوں کہ کیفیتِ وجد ایک حقیقی چیز ہے حالانکہ جن لوگوں کو اس کا تجربہ ہوتا ہے، ممکن ہے ان میں کوئی حقیقت نہ ہو۔ کیونکہ اس عالم میں جو کچھ گذرتا ہے، اس کی یاد ایک ایسے خواب کی سی ہوتی ہے جس میں ہم شدتِ محبت سے روح کی علویت اور بالیدگی محسوس کرتے ہیں ــــ مسرت کی ایسی لرزہ خیزی جس میں خواہش کا گذر تک نہیں ہے کیونکہ خواہش کی تسکین محبت کی مسرتوں سے ہی ہوتی ہے۔ یہ ایسی کیفیت ہے جو ہوش آنے پر باقی نہیں رہتی۔ مگر میں نے کس چیز سے یا کس شخص سے محبت کی، یا مجھ میں کیا چیز تھی جو محبت کر رہی تھی ــــ یہ سب مجھے معلوم نہیں۔ اور اگر یہ سب کچھ بالکل بے معنی ہے، تو میں اس شدید آرزو سے نجات پانا چاہتی ہوں، جو ایسی چیز کے لئے ہے جس کو میں پا نہیں سکتی۔ اور اس شرمندگی کا علاج چاہتی ہو جو اُسے کبھی نہ پا سکنے کی وجہ سے مجھے محسوس ہوتی ہے کیا آپ میرا علاج کر سکتے ہیں؟

رائلی :۔ مرض کی یہ کیفیت قابلِ علاج ہے۔ مگر طریقۂ علاج کا انتخاب آپ ہی کو کرنا ہوگا: میں آپ کے لئے انتخاب نہیں کر سکتا۔ اگر آپ یہی چاہتی ہیں، تو میں اس انسانی حالت سے آپ کا سمجھوتہ کرا سکتا ہوں، جس پر بعض لوگ اتنا دور جانے کے بعد واپس آجاتے ہیں جتنا کہ آپ جا چکی ہیں۔ ان کو وہ منظر کبھی یاد آجاتا ہے جس سے وہ گذر چکے ہیں، مگر اب اس پر تاسف نہیں کرتے۔ بہت عامیانہ حسبِ معمول زندگی گذارتے ہیں، حد سے زیادہ امیدیں وابستہ کرنے سے پرہیز کرنا سیکھ لیتے ہیں، اپنے آپ سے اور دوسروں سے رواداری برتنے لگتے ہیں، مروجہ اعمال میں، جہاں کچھ لینے دینے کی گنجائش ہوتی ہے، وہاں لیتے دیتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی چیز پر تلملاتے

کبھی نہیں اس صبح سے بھی مطمئن رہتے ہیں جو الگ کر دیتی ہے اور اس شام سے بھی جو ایسے دو انسانوں کو آگ کے سامنے بیٹھ کر عامیانہ قسم کی باتیں کرنے کے لئے ملا دیتی ہے، جن کو یہ معلوم ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نہیں سمجھتے، جو ایسے بچوں کی افزائش کرتے رہتے ہیں جن کو وہ نہیں سمجھتے، اور جو کبھی انہیں بھی نہ سمجھ پائیں گے۔

سیلیا:۔ کیا یہی بہترین زندگی ہے؟

رائلی:۔ ایک اچھی زندگی کہنا چاہیے۔ حالانکہ جب تک آپ اختتام پر نہ پہنچیں، آپ یہ نہیں سمجھ سکیں گی کہ کتنی اچھی ہوگی۔ لیکن آپ کو کسی اور چیز کی خواہش نہ ہوگی۔ اور وہ دوسری زندگی ایک ایسی کتاب کی مانند ہوگی جسے ایک بار پڑھنے کے بعد آپ کھو چکی ہوں۔ پاگل پن، تشدد، حماقت اور ہوس کی اس دنیا میں ...... یہ زندگی غنیمت ہے۔

سیلیا:۔ اگر مجھے یہ اب بھی حاصل ہو، تو میں جانتی ہوں کہ مجھے اسکو قبول کرنے کے قابل ہونا چاہئے۔ مگر اسکے تصور سے ہی میں سراسیمہ ہو جاتی ہوں۔ شاید یہ بھی میرے مرض کا ایک جزو ہے۔ مگر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ شکست خوردگی کے مترادف ہوگا۔ نہیں شکست خوردگی نہیں۔ بلکہ غداری کے مترادف کہنا چاہیے۔ دیکھئے نا۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ مجھے سچ مچ کسی چیز کا روحانی مشاہدہ (VISION) ہوا تھا لیکن میں یہ نہیں جانتی کہ وہ کیا چیز ہے۔ میں اسے کھونا بھی نہیں چاہتی۔ میں اسکے ساتھ زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ اگر میں اسے اپنے دل میں برقرار رکھ سکوں، تو میں ہر دوسری چیز کے بغیر زندہ رہ سکتی ہوں، ہر چیز برداشت کر سکتی ہوں۔ اب تو یہ ہے کہ میں سوچتی ہوں کہ کسی اور کے ساتھ زندگی گذارنے کی کوشش کرنا بھی میرے لئے بددیانتی کے مترادف ہوگا۔ میں اب کسی کو وہ محبت نہیں دے سکتی ــ کاش میں دے سکتی ــ جو اس زندگی سے وابستہ تھی۔ اف! شاید یہ محض پاگل پن کی باتیں ہیں یا حد درجہ سٹری پن کی ...... پھر بھی ...... اگر کوئی اور راستہ نہیں ہے ...... تو میں اپنے آپ کو نہایت ہی ناامید محسوس کرتی ہوں۔

رائلی:۔ اگر آپ میں جرأت اور ہمت ہے، تو ایک راستہ اور ہے۔ پہلے راستہ کو میں معمولی

الفاظ میں اس لئے بیان کر سکا تھا، کیونکہ آپ سب کی طرح اسے دیکھ چکی ہیں۔ اور اس کی جیتی جاگتی مثالیں ہمارے چاروں طرف موجود لوگوں کی زندگیوں میں مل جاتی ہیں۔ دوسرا راستہ انجانا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے عقیدے کی ضرورت ہے۔ ایسا عقیدہ، جو نا امیدی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی منزل بیان نہیں کی جا سکتی۔ جب تک آپ وہاں تک پہنچ نہ پائیں، آپ کو کچھ معلوم نہ ہو سکے گا۔ آپ کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس کے لئے سفر کرنا ہو گا۔ مگر اس راستہ سے آپ وہ چیز پا سکیں گی، جس کو آپ غلط جگہ پر تلاش کرتی رہیں۔

سیلیا:۔ یوں لگتا ہے، جیسے میں یہی چاہتی ہوں۔ مگر میرے فرائض کیا ہوں گے۔

رائلی:۔ جو راستہ آپ منتخب کریں گی، وہ اپنے فرائض آپ متعین کرے گا۔

سیلیا:۔ کون سا راستہ بہتر ہے۔

رائلی:۔ کوئی بھی بہتر نہیں، مگر دونوں راستے لازمی ہیں۔ اور یہ بھی لازمی ہے کہ ان میں سے ایک کا انتخاب کیا جائے۔

سیلیا:۔ تو پھر میں دوسرے راستے کا انتخاب کرتی ہوں۔

رائلی سفر بڑا خوفناک ہے۔

سیلیا:۔ میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ بلکہ خوش ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ سفر وحشت انگیز ہو گا۔ کیوں؟

رائلی:۔ دوسرے سے زیادہ وحشت انگیز نہیں ہو گا۔ مگر جو لوگ دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں وہ اپنی وحشت اور تنہائی کو بھول سکتے ہیں۔ آپ بھول نہ سکیں گی۔ ہر ایک راستہ کے معنی تنہائی ـــــ اور وصال کے ہیں۔ دونوں راستے اکیلے پن کی اس ویرانی سے بچا لیتے ہیں، جو تصورات، بدلتی یادوں اور آرزوؤں کی اس نظر فریب دنیا کی پیداوار ہے۔

سیلیا:۔ یہی وہ جہنم تھا، جس میں میں محبوس تھی۔

رائلی:۔ یہ جہنم اس وقت تک ہے جب تک آپ اور کچھ کرنے کے قابل نہ ہوں۔ اب بتائیے کیا آپ نے عزم کر لیا ہے؟

سلیا :۔ ہاں، میں آپ کا دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہتی ہوں۔ اب مجھے کیا کرنا ہے؟

رائلی :۔ آپ کو سینیٹوریم جانا ہوگا۔

سلیا :۔ اوہ ــــ کیا اینٹی کلائمکس ہوا ہے! میں ایسے لوگوں کو جانتی ہوں، جو آپ کے سینیٹوریم میں رہ چکے ہیں۔ اور پھر واپس آ گئے ـــــ میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ پہلے سے بہتر محسوس نہیں کرتے ــــ میں انہی لوگوں کو دیکھ کر تو آپ کے پاس چلی آئی مگر وہ ــــ تو محض ..... روزمرہ کی عامیانہ زندگی کی طرف لوٹ آئے۔

رائلی :۔ ٹھیک ہے۔ مگر جن دوستوں کے لئے آپ کا یہ خیال ہے، وہ اس سینیٹوریم میں نہیں گئے ہوں گے۔ میں اس بات میں بڑا محتاط ہوں کہ کن لوگوں کو وہاں بھیجوں: جو لوگ وہاں جاتے ہیں، وہ ان کی طرح لوٹ کر نہیں آیا کرتے۔

سلیا :۔ وہ کوئی قید خانہ سا معلوم ہوتا ہے مگر وہ سب لوگ تو نہیں رہ سکتے۔ میرا مطلب ہے کہ ایسے میں تو وہاں لوگوں کا بہت ہجوم ہو جائے گا۔

رائلی :۔ اتنے زیادہ لوگ نہیں جاتے وہاں۔ مگر میں نے یہ کہا تھا کہ وہ وہاں سے ان معنوں میں لوٹ کر نہیں آتے جن معنوں میں آپ کے بعض دوست لوٹ آئے تھے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ وہاں ٹھہرے تھے۔

سلیا :۔ کیا ہوتا ہے ان کے ساتھ؟

رائلی :۔ وہ خود انتخاب کر لیتے ہیں، مس کوپل سٹون۔ ان کو کسی چیز پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ ان میں سے بعض واپس آ جاتے ہیں ــــ جسمانی معنوں میں۔ کوئی بھی غائب نہیں ہوتا۔ وہ لوگ اکثر و بیشتر دنیا میں بڑی ہی عملی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔

سلیا :۔ آپ مجھے وہاں کب اور کتنا جلد بھیج سکتے ہیں؟

رائلی :۔ آپ کتنی جلدی تیار ہو جائیں گی؟

سلیا :۔ آج رات، نو بجے تک۔

رائلی :۔ تو آپ گھر جائیے اور اپنی تیاری مکمل کر لیجئے۔ (کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کچھ لکھتا ہے)

اپنے دوستوں کو یہ پتہ دیجئے گا۔ آپ اپنے خاندان کو بھی فوراً مطلع کر دیجئے تو اچھا ہے۔
میں آپ کے لئے نو بجے موٹر بھیج دوں گا۔

سیلیا:۔ مجھے اپنے ساتھ کیا سامان لے جانے کی ضرورت ہوگی؟

رائلی :۔ کچھ بھی نہیں۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہوگی، اس کا انتظام کر دیا جائے گا۔ اور سینیٹوریم میں بھی آپ کے اخراجات کچھ نہ ہوں گے۔

سیلیا:۔ مجھے صریحاً کچھ معلوم نہیں کہ میں کیا کر رہی ہوں اور کیوں کر رہی ہوں۔ اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے: شاید یہی ایک وجہ ہے۔

رائلی :۔ یہی بہترین وجہ ہے۔

سیلیا:۔ مگر میں یہ جانتی ہوں کہ یہ فیصلہ میں نے ہی کیا ہے: یہ میں آپ کو بتا دینا چاہتی ہوں۔
ارے، میں تو بھول ہی گئی ــــ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کی فیس کیا ہے؟

رائلی :۔ میں نے اپنی سیکریٹری کو بتا دیا ہے کہ کوئی فیس نہیں ہے۔

سیلیا:۔ مگر.....

رائلی :۔ آپ جیسے 'کیس' کی کوئی فیس نہیں ہے (بٹن دباتا ہے)

سیلیا:۔ آپ نے بڑا کرم کیا ہے۔

رائلی :۔ اطمینان رکھو۔ میری بچی۔ اور محنت سے اپنی نجات پانے کی کوشش کرو۔

(نرس سکریٹری دروازے پر آجاتی ہے۔ سیلیا چلی جاتی ہے۔
رائلی ضمنی ٹیلی فون پر نمبر گھماتا ہے)

رائلی :۔ (ٹیلی فون پر) ملاقات ختم ہوگئی۔ اب تم اندر آسکتی ہو (جولیا ایک طرف سے داخل ہوتی ہے) وہ ــــ وہ تو بہت دور جانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

جولیا:۔ ہاں، بہت دور تک۔ میں جانتی ہوں۔ مجھے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے شروع سے معلوم تھا۔

رائلی :۔ مجھے دوسروں کی فکر ہے۔

جولیا:۔ کیا فضول بات کرتے ہو، ہنری۔ میں ان پر نگاہ رکھوں گی۔

رائلی :۔ ان کو یوں واپس بھیج دینے کی فکر: کیا رکھا ہے ان کے لئے جس کی طرف وہ واپس جائیں؟ اسی باسی کھانے کی طرف، جو ان کے نعمت خانہ میں سڑ رہا ہے، انہی باسی خیالوں کی طرف، جو ان کے ذہنوں میں سڑ رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنا کمینہ پن اپنے آپ سے چھپا رہا ہے، کیونکہ دوسرا اسے جانتا ہے۔ یہ ایک دوسرے سے باہمی غداری کی بات نہیں، بلکہ یہ کہ دوسرے اس کا مقصد اور ما فی الضمیر سمجھتے ہیں — ایک آئینہ کے سامنے دوسرا آئینہ خود پسندی کو منعکس کر رہا ہے۔ میں نے بڑا خطرہ مول لے لیا ہے۔

جولیا :۔ ہمیں ہمیشہ خطرات مول لینے چاہئیں۔ یہی ہماری قسمت ہے۔ اگر تم اس فیصلہ کو قابلِ گرفت سمجھتے ہو، تو اس کا نعم البدل کیا سمجھتے ہو؟

رائلی :۔ کچھ بھی نہیں۔

جولیا :۔ دیکھا تم نے۔ لہٰذا ہمیں خطرہ مول لینا چاہئے۔ ہم صرف یہی کر سکتے تھے کہ ان کو ایک موقع دیں۔ اور اب جب کہ وہ اپنی روح کی حد تک بالکل ننگے ہو چکے ہیں، اور اب یہ انتخاب کر سکتے ہیں کہ صحیح لباس پہننے لگیں یا جلدی سے کوئی نیا بھیس بدل لیں، تو کم از کم پہلی مرتبہ وہ کسی مقام سے ابتدا کر سکتے ہیں۔ ہاں، بہت ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگیں۔ مگر میں نہیں سمجھتی کہ وہ ایسا کریں گے۔ دیکھ لیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔ مجھے تو صرف سیلیا کا خیال کھائے جا رہا ہے۔

رائلی :۔ سیلیا کا؟

جولیا :۔ سیلیا کا۔

رائلی :۔ مگر میں نے جب ابھی یہ کہا کہ وہ بہت دُور تک جا سکتی ہے، تو تم نے مجھ سے اتفاق کیا تھا۔

جولیا :۔ بے شک، وہ بہت دور تک جانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ مگر اس سفر کی ہولناکیاں ہم کیا جانیں؟ تمہیں اور ہمیں اس عمل کا کوئی علم نہیں ہے جس کے ذریعہ انسان مافوق الانسان بن جاتا ہے۔ جو لوگ روح کی روشنی

راستہ اختیار کرتے ہیں، وہ کیا اذیتیں جھیلتے ہیں، ہمیں کیا معلوم؟

رائلی :۔ کیا وہ منعکس روحوں کے پہلے ہی جلوہ سے ڈر تو نہیں جائے گی؟

ولیا :۔ ہینری، تم کو معلوم ہی نہیں کہ معصومیت کیا چیز ہے ۔ وہ کسی چیز سے خوفزدہ نہیں ہوگی: اسے تو یہ تک معلوم نہ ہوگا کہ خوفزدہ ہونے کے لئے کوئی چیز موجود ہے ۔ وہ کوستے ہوئے پہاڑوں اور تضحیک کی وادیوں سے اس بچہ کی طرح بڑے صبر اور شوق سے گذر جائے گی، جسے آپ کسی کام کے لئے بھیج دیتے ہیں مگر اسکے باوجود اسے اذیت ضرور برداشت کرنی ہوگی۔

ائلی :۔ جب میں کسی چیز میں اعتماد کا اظہار کیا کرتا ہوں، تو تم ہمیشہ شبہات پیدا کر دیتی ہو۔ اور جب میں اس کے متعلق تذبذب میں مبتلا ہوتا ہوں، تو تم اعتماد کا اظہار کرنے لگتی ہو۔

لیا :۔ یہ تو وہ طریقہ ہے جس کی وجہ سے میں تمہارے لئے کارآمد ثابت ہوتی ہوں۔ تمہیں تو شکر گذار ہونا چاہئے۔

لی :۔ اور جب میں اس جیسے کسی انسان سے یہ کہتا ہوں کہ وہ محنت سے اپنی نجات پانے کی کوشش کرو، تو میری خود سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

لیا :۔ تمہیں اپنی کمزوریوں کو تسلیم کر لینا چاہئے —— مگر یہ الکز ہمیں کب تک یہاں انتظار کرائے گا؟

لی :۔ اب تک تو اسے آجانا چاہئے تھا۔ میں مس باروے سے پوچھتا ہوں (ضمنی ٹیلی فون اٹھاتا ہے) مس باروے، جب مسٹر گبز تشریف لائیں . . . . . اچھا۔ بہت اچھا۔ (جولیا سے) وہ ادھر کو ہی آرہا ہے (ٹیلی فون پر) مس باروے اب وہ کشتی اور گلاس لے آؤ۔

(الکز داخل ہوتا ہے)

کز :۔ کہئے! کہاں تک پہنچی بات؟

لیا :۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔

الکز :۔ مسٹر اور مسز چیمبر لین نے اپنا انتخاب کر لیا؟
رائلی :۔ انہوں نے اپنے مقدر کو تسلیم کر لیا ہے۔
الکز :۔ اور "اس" نے بھی فیصلہ کر لیا۔
رائلی :۔ آج رات کو اسے لے لیا جائے گا۔

(نرس سکریٹری ایک کشتی میں تین گلاس اور ایک بوتل لے کر
داخل ہوتی ہے۔ اور پھر چلی جاتی ہے۔ رائلی گلاس بھرنے لگتا ہے)

اور اب ہم مقدس دیوتاؤں کو جام تجویز کرنے کے لئے تیار ہیں۔
الکز :۔ اور ہم وہ الفاظ تجویز کرتے ہیں، جو گھر بسانے کے لئے ہیں

(وہ گلاس اٹھاتے ہیں)

رائلی :۔ ہماری دعا ہے کہ وہ ستاروں کی چھاؤں میں الاؤ بنائیں۔
الکز :۔ اور اس الاؤ کے دونوں طرف کرسیاں ڈال کر بیٹھیں۔
جولیا :۔ ہماری دعا ہے کہ مقدس روحیں ان کی چھت کی نگہبانی کریں اور چاند ان کے بستر پر رحمت کرے۔

(وہ جام پیتے ہیں)

الکز :۔ اب وہ الفاظ تجویز کریں جو سفر کرنے والوں کے لئے ہیں۔
رائلی :۔ مسافروں کا نگہباں، اس راستہ پر رحمت کرے۔
الکز :۔ بیابان میں اس کی حفاظت کرے، پہاڑوں میں اس کی نگہبانی کرے، تنگ و تاریک راہوں پر اس کا محافظ ہو، اور دلدلوں میں اس کی پاسبانی کرے!
جولیا :۔ "آوازوں" سے اسے محفوظ رکھے، فریب نظر سے اسے بچائے، ہنگامے میں اسے محفوظ رکھے اور خاموشی میں اس کی حفاظت کرے۔

(وہ جام پیتے ہیں)

رائلی :۔ ایک شخص ہے، جس کے لئے جام دعا کے الفاظ نہیں کہے جا سکتے۔
الکز :۔ وہ ابھی نہیں کہے جا سکتے۔

جولیا :۔ تمہارا مقصد پیٹر کونلپ سے ہے۔
رائلی :۔ ابھی وہ اس مقام پر نہیں پہنچا جہاں الفاظ اہمیت رکھتے ہیں۔
جولیا :۔ کیا ہم لوگ ان الفاظ کو کہہ سکیں گے۔
الکز :۔ شاید دوسرے لوگ کہیں گے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میرے تعلقات ــــ کیلیفورنیا میں بھی ہیں۔

پردہ

تیسرا ایکٹ

لندن میں چیمبرلین کے فلیٹ کا ڈرائنگ روم۔ دوسال
بعد۔ وقت سہ پہر۔ کیٹرر کا ایک ملازم کھانے کی میز پر
'بوفے' کا انتظام کر رہا ہے۔ لیونیا ایک دروازے سے
داخل ہوتی ہے۔

کیٹرر کا ملازم:۔ بیگم صاحبہ، ہمارے لئے اور کیا حکم ہے؟

لیونیا:۔ ٹرالی میں گلاس رکھ کر لے آؤ، اور انہیں تیار کر کے یہاں چھوڑ دو

کیٹرر کا ملازم:۔ جی، بہت اچھا، بیگم صاحبہ۔

(باہر چلا جاتا ہے۔ لیونیا غور سے کمرہ کا جائزہ لیتی ہے
اور ایک گلدان کو ذرا سرکا دیتی ہے)

(کیٹرر کا ملازم ٹرالی لے کر آتا ہے)

لیونیا:۔ اُس طرف، اُس کونے میں۔ وہیں آسانی ہوگی۔ تم ادھر کی طرف آجا
گے۔ کیا تمہیں کسی ایسی چیز کی ضرورت ہے جو باورچی خانے میں موجود نہ

کیٹرر کا ملازم :۔ جی نہیں۔ آپ کو اور کسی چیز کی ضرورت ہو گی ؟
لیونیا :۔ نہیں۔ میرے خیال میں ساڑھے چھ بجے تک اور کوئی ضرورت نہ ہو گی ۔

(ملازم چلا جاتا ہے)

(ایڈورڈ سامنے کے دروازہ سے اندر داخل ہوتا ہے)

ایڈورڈ :۔ میرا خیال ہے کہ میں ٹھیک وقت پہ آ گیا ہوں۔ تم پریشان تو نہیں ہوئیں ؟
لیونیا :۔ نہیں تو۔ میں نے تمہارے دفتر میں فون کیا تھا۔ اور تمہارے منشی نے بتایا کہ تم روانہ ہو چکے ہو۔ مگر میں نے ٹیلی فون صرف اس لئے کیا تھا کہ تم اطمینان رکھو...
ایڈورڈ :۔ (مسکرا کر) کہ تم بھاگ نہیں گئیں۔
لیونیا :۔ دیکھو ایڈورڈ، یہ بے انصافی نہیں تو اور کیا ہے ! تم جانتے ہو کہ پچھلے دو سالوں میں ہم کئی دعوتیں کر چکے ہیں۔ اور میں سب کی سب میں شریک ہوئی۔ کیا تم بہت تھکے ہوئے تو نہیں ہو ؟
ایڈورڈ :۔ نہیں تو۔ بڑا پُر سکون دن رہا۔ دو بہت ہی آسان سے مقدموں میں سالیسٹروں سے مشورہ کرنا تھا۔ تھکی تو تم ہو گی۔
لیونیا :۔ ابھی تک تو نہیں تھکی۔ ہاں یہ سب کچھ ختم ہو جائے تو مجھے اطمینان ہو گا۔
ایڈورڈ :۔ آج جو لباس تم پہنے ہوئے ہو، مجھے بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔ آج مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے کہ تم نے یہ لباس پہن رکھا ہے۔
لیونیا :۔ ارے واہ، ایڈورڈ ! کیا تم جانتے ہو کہ زندگی میں پہلی بار کسی دعوت سے پیشتر تم نے میری تعریف کی ہے ؟ اور یہی وقت ہوتا ہے جب تعریف کی ضرورت ہوتی ہے۔
ایڈورڈ :۔ تم اس کی مستحق بھی ہو ——— ہم نے کچھ زیادہ ہی لوگ بلا لئے ہیں۔
لیونیا :۔ ٹھیک کہتے ہو۔ ہم نے جتنے لوگوں کے آنے کا سوچا تھا، اس سے کہیں زیادہ لوگوں نے دعوت قبول کر لی ہے۔ بہرحال، اب کیا کیا جا سکتا ہے ؟ عموماً بہت سے لوگ آنا تو نہیں چاہتے، مگر اس کے باوجود یہ سنکر کہ ہم نے ان کو بلائے بغیر کوئی دعوت

کردی ہے، تو وہ بہت خفا ہو جاتے ہیں۔
ایڈورڈ:۔ ہمیں شاید ایک کے بجائے دو دعوتوں کا اہتمام کرنا چاہیے تھا۔
لیونیا:۔ یہ طریقہ بھی اطمینان بخش نہیں ہوتا جس کو آپ ایک دعوت میں مدعو کریں، اسے یہی شک گذرتا ہے کہ دوسری دعوت اس سے زیادہ زوردار اور اہم تھی۔
ایڈورڈ:۔ بالکل صحیح کہا تم نے۔ تمہارا ذہن بڑا عملی ہے۔
لیونیا:۔ مگر میرا خیال ہے کہ تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جن لوگوں نے دعوت قبول کرلی ہے، وہ سب کے سب نہیں آئیں گے۔ تم جانتے ہو کہ ہم یہی کہہ رہے تھے کہ "ہم اور بیس آدمیوں کو بلا سکتے ہیں، کیونکہ ہمارے ہاں آنے کے بجائے وہ گننگز کی دعوت میں چلے جائیں گے۔
ایڈورڈ:۔ ہاں مجھے یاد ہے کہ ہم اس وقت یہی کہتے تھے۔ مگر میں یہ بھول گیا تھا کہ گننگز کی دعوتیں کس طرح کی ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں تو مہمانوں کو بس اتنا ہی ملتا ہے کہ وہ اور پیاسے ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد، وہ شراب پینے کے لئے ہمارے ہاں دھاوا بول دیں گے۔ خیر اب یہی امید کرنی چاہیے کہ جو لوگ پہلے ہمارے ہاں آئیں گے۔ وہ کچھ دیر بعد گننگز کے یہاں چلے جائیں گے اور اس طرح ان لوگوں کے لئے جگہ ہو جائے گی جو گننگز سے لوٹ کر ہمارے ہاں آئیں گے۔
لیونیا:۔ اگر بھیڑ بہت ہو گئی تو لوگ کاکٹیلس تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ اور نہ ملازم کشتی ہاتھ میں لئے ہجوم میں جا سکے گا۔ اس لئے لوگ پھر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ بہرحال، اگر یہی صورت ہوئی، تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اور ہر شخص ایسی دعوت میں جانا چاہتا ہے، جہاں باقی سب لوگ بھی موجود ہوں تاکہ وہ یہ ظاہر کر سکے کہ اسے بھی مدعو کیا گیا ہے۔ یہی بات ہے جو کسی دعوت کو کامیاب بناتی ہے۔ کیا یہ تصویر سیدھی معلوم ہوتی ہے؟
ایڈورڈ:۔ ہاں، سیدھی ہی ہے۔
لیونیا:۔ نہیں۔ ٹھیک نہیں ہے۔ اسے ذرا سیدھا کر دو۔

ایڈورڈ :۔ کیا اب سیدھی ہے؟
لیونیا :۔ بائیں طرف کچھ جھک گئی ہے۔
ایڈورڈ :۔ اب کیسی ہے ؟
لیونیا :۔ نہیں۔ میرا مطلب داہنے ہاتھ تھا۔ اب ٹھیک ہی ہے۔ میں اتنی تھکی ہوئی ہوں کہ اب اس کی پرواہ نہیں۔
ایڈورڈ :۔ جب سب لوگ چلے جائیں گے، تو ہم لوگ، صرف ہم دونوں شیمپین پئیں گے۔ لیونیا، اب تھوڑی دیر کے لئے تم لیٹ جاؤ۔ آدھے گھنٹے تک تو کوئی نہیں آئے گا۔ اس لئے ذرا سستا لو۔
لیونیا :۔ تم میرے پاس آکر بیٹھو، تو مجھے چین آجائے گا۔
ایڈورڈ :۔ پوری دعوت میں یہ سب سے بہترین لمحہ ہے۔
لیونیا :۔ نہیں، ایڈورڈ۔ بہترین لمحہ وہ ہے جب یہ ختم ہو جائے۔ اور یہ یاد آجائے کہ موسم ختم ہو چکا اور اب کوئی اور مزید دعوتیں نہیں ہوں گی۔
ایڈورڈ :۔ اور نہ مزید کمیٹیاں ہوں گی۔
لیونیا :۔ کیا ہم یہاں سے جلد ہی کہیں اور چل سکتے ہیں۔
ایڈورڈ :۔ آئندہ ہفتہ کے آخر تک میں بالکل فارغ ہو جاؤں گا۔
لیونیا :۔ اور پھر ہم دونوں تنہا ہو سکیں گے۔ مجھے اس گھر سے بہت محبت ہے کیونکہ وہ اتنا دور ہے۔
ایڈورڈ :۔ اسی لئے تو ہم نے اسے خرید لیا۔ اور میں بڑا شکر گذار ہوں کہ مجھے لوگوں سے نہ ملنے کا یہ بہانہ مل گیا ہے۔ اور اب تمہیں ذرا آرام کر لینا چاہئے۔
(دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے)
لیونیا :۔ ارے، کیا مصیبت ہے! اتنا جلد بھلا کون آسکتا ہے۔ مجھ سے تو اٹھا بھی نہیں جاتا۔
کیٹرر کا ملازم :۔ مسز شٹل تھویٹ!

لیونیا:۔ اوہ، یہ تو جولیا آگئی۔

(جولیا داخل ہوتی ہے)

جولیا:۔ لو، میں آگئی، میرے پیارو! معلوم ہوتا ہے کہ میں نے تمہیں اونگھتے ہوئے پکڑ لیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وقت سے بہت پہلے ہی آگئی ہوں۔ مگر بات دراصل یہ ہے کہ مجھے ابھی گلنگز کی دعوت میں بھی جانا ہے۔ اور یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ کھانے پینے کے معاملہ میں ان کے ہاں کیا ملتا ہے! اور پھر میں نے ابھی چائے بھی نہیں پی۔ اور اسوقت مجھے شدید بھوک لگی ہے اور پیاس سے بُرا حال ہو رہا ہے۔ پارکنس (کیٹرر) والے میری کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ ہاں ہاں، مجھے معلوم ہے کہ یہاں "پارکنس" والوں کا انتظام ہے۔ دروازے پر ان کے ایک ملازم کو میں فوراً پہچان گئی۔ بلکہ وہ تو دراصل میرا ایک پرانا دوست ہے۔ افوہ! میں تو بھول ہی گئی! تمہارے لئے حیرت کا سامان لائی ہوں۔ بوجھو تو بھلا! میں الکز کو اپنے ساتھ لائی ہوں! وہ آج صبح ہی واپس پہنچا ہے کہیں سے ــــ اپنی کسی پراسرار مہم سے۔ ہم یہ کریں گے کہ آج اس سے اس کے متعلق قصہ سنیں گے۔ مگر وہ کہاں چلا گیا۔

(الکز داخل ہوتا ہے)

ایڈورڈ:۔ الکز! تم زمین کے کس کونے سے ٹپک پڑے؟

الکز:۔ زمین کے کس کونے سے؟ یورپ سے۔ جزیرہ "کنکنجا" سے ــــ جس کا تم نے ابھی تک نام بھی نہیں سنا ہوگا۔ آج صبح ہی پہنچا ہوں۔ میں نے جب تمہاری دعوت کے متعلق سنا، اور میں نے سوچا کہ تم لوگ شاید دیہات کی طرف چلے جاؤ۔ تو میں نے کہا کہ ایڈورڈ اور لیونیا سے ملاقات کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دوں۔

لیونیا:۔ تمہارے مزاج کیسے ہیں، الکز؟

الکز:۔ دوپہر میں کھانے کے بعد میں نے تم سے ٹیلی فون پر بات کرنے کی کوشش کی تھی، مگر میری سیکریٹری کو تمہارا ٹیلی فون نہیں مل سکا۔ میں نے کہا، کوئی مضائقہ

نہیں ___ یہ میں نے اپنے آپ سے کہا، سیکریٹری سے نہیں ۔ کوئی مضائقہ نہیں ہے : بن بلائے مہمان کی آؤ بھگت سب سے زیادہ گرمجوشی سے ہوتی ہے ۔ میں اتنا تو ان لوگوں کو جانتا ہوں۔

جولیا :۔ مگر، الکز ۔ تم ہمیں یہ بتاؤ کہ تم اس عجیب سے مقام پر کیا کر رہے تھے ___ کیا نام ہے اس کا ؟

الکز :۔ کنکنجا ۔

جولیا :۔ تم کنکنجا میں کیا کر رہے تھے ؟ کسی سلطان سے ملاقات کے لئے گئے تھے ؟ یا شیروں کے شکار پہ گئے تھے ۔

الکز :۔ کنکنجا میں شیر نہیں ہوتے، جولیا ۔ میں وہاں گورنر کے پاس ٹھہرا ہوا تھا ۔ ہم تین آدمی وہاں کے مقامی حالات کا جائزہ لینے گئے تھے ۔

جولیا :۔ کس سلسلے میں ؟ بندروں کے لئے مونگ پھلیوں کا انتظام کرنے کے لئے ؟

الکز :۔ تمہارا قیاس بہت ہی قریب ہے حالانکہ تمہیں اس کا خیال نہیں ہے ۔ نہیں ۔ بندروں کے لئے مونگ پھلیوں کی بات نہیں ہے ۔ مگر اس کا تعلق بندروں سے ہے ضرور ___ حالانکہ میں کہہ نہیں سکتا کہ بندر اس مسئلہ کا باعث ہیں یا صرف اس کی علامت ہیں ۔ کم ازکم بندر وہاں کے مقامی باشندوں میں انتشار کا ایک بہانہ ضرور بن گئے ہیں ۔

ایڈورڈ :۔ مگر بندر کس طرح انتشار پیدا کر سکتے ہیں ؟

الکز :۔ پہلی بات تو یہ ہے بندر بڑی تباہی مچاتے ہیں . . . .

جولیا :۔ مجھے یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ بندر تباہی کا باعث ہوتے ہیں ۔ میں تو میری میلنگٹن کے بندر کو کبھی نہ بھولوں گی ۔ خدا کی مار اس ستیاناسی جانور پر ___ اسنے میرا مینٹن جانے کا ٹکٹ چرالیا اور پھر مجھے ایک بہت ہی سست رفتار گاڑی میں سفر کرنا پڑا ۔ اور وہ بھی ایک بہت ہی چھوٹے تنگ ڈبے میں ۔ وہ مجھ سے بڑی خفا ہوگئی جب میں نے یہ کہہ دیا کہ اس جانور کی تو گردن مار دینی چاہئے ۔

لیونیا :۔ اگر یہ بندر اتنا پریشان کرتے ہیں، تو انہیں ختم کیوں نہیں کر دیتے ؟

الکز :۔ بدقسمتی سے، مقامی باشندوں کی اکثریت کافر ہے : وہ ان بندروں کا بڑا احترام کرتے ہیں اوران کے مارنے کو پسند نہیں کرتے۔ اس لئے، بندر جو نقصان کرتے ہیں، اس کا الزام وہ حکومت کو دیتے ہیں۔

ایڈورڈ :۔ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔

الکز :۔ زیادتی تو ہے، مگر یہی ان کی خصوصیت ہے۔ صرف یہی بدترین بات نہیں ہے، ان میں کچھ قبیلے عیسائی ہو گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کا نقطۂ نظر مختلف ہے۔ وہ بندروں کو پکڑتے ہیں اوران کو کھاتے بھی ہیں۔ کمسن بندر بڑے لذیذ ہوتے ہیں، میں نے خود بھی پکائے ہیں.....

ایڈورڈ :۔ اور جب تم نے پکائے، تو کسی نے کھائے بھی ؟

الکز :۔ ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ میں نے مقامی باشندوں کے لئے پکانے کے کئی نسخے بنائے تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ عیسائی باشندے جی بھر کر بندروں کو کھاتے رہتے ہیں اور دوسری طرف اپنی فصلوں کو بھی ان سے محفوظ رکھتے ہیں، اس لئے وہ بہت خوشحال ہوتے جارہے ہیں۔ یہ بات ان میں اور دوسرے مقامی باشندوں میں جھگڑے کا باعث ہے۔ یہی اصل مسئلہ ہے۔ میں آپ کو بور تو نہیں کر رہا ؟

ایڈورڈ :۔ نہیں تو : ہم تو مسئلہ کا حل جاننے کے منتظر ہیں۔

الکز :۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ اس کا کوئی حل بھی ہے۔ مگر یہ بات بھی دراصل مسئلہ کی تہہ تک نہیں پہنچاتی۔ وہاں کچھ غیر ملکی انتشار پسند عناصر ہیں، جو فتنہ پیدا کر رہے ہیں۔

لیونیا :۔ انہیں وہاں سے نکال کیوں نہیں دیتے ؟

الکز :۔ وہ ایک ہمسایہ ملک کے باشندے ہیں، جسکو ابھی حال ہی میں ہم نے تسلیم کیا ہے۔

لیونیا : حالات بڑے سنگین ہوتے جارہے ہیں۔

ایڈورڈ :۔ یہ جو انتشار پسند عناصر ہیں ــــ وہ کس طرح انتشار پھیلاتے ہیں ؟

الکز :۔ وہ کافر باشندوں کو یہ یاد کراتے ہیں کہ بندروں کے قصاص نے ان پر آسیب کر دیا

ہے، جو صرف عیسائیوں کے **قتلِ** عام سے دُور ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ کچھ نئے عیسائیوں کو بھی ورغلاتے رہتے ہیں کہ وہ پھر کافر ہو جائیں ـــــ وہ لوگ بھی تو آخر قتل ہونا نہیں چاہتے۔ اس لئے وہ بندروں کو کھانے کے بجائے عیسائیوں کو کھاتے ہیں۔

جولیا:۔ جو بندروں کو کھاتے رہتے ہیں۔

الکنز:۔ مقامی باشندوں ہیں، ظاہر ہے کہ منطق نہیں ہے۔

جولیا:۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ تم بندروں کے قصہ میں ہمیں کہاں لئے جارہے ہو، مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں ابھی بندر کھانے جارہی تھی: مگر انسان عیسائیوں کو تو نہیں کھا سکتا ـــــ شاید کافر بھی نہیں کھا سکتے۔

الکنز:۔ پورا قصہ سننے کے بعد تو یقیناً نہیں۔

ایڈورڈ:۔ کیا وہاں کسی انگریز کو بھی قتل کیا گیا ہے؟

الکنز:۔ ہاں، مگر عموماً انہیں کھایا نہیں جاتا۔ جب وہ کسی یوردپی پہ ہاتھ صاف کر لیتے ہیں، تو عام طور پہ وہ کھانے کے قابل نہیں رہتا۔

ایڈورڈ:۔ اور تمہارے کمیشن نے کیا کیا؟

الکنز:۔ ہم نے ابھی ایک ابتدائی رپورٹ مکمل کرلی ہے۔

ایڈورڈ:۔ کیا اسے شائع کیا جائے گا؟

الکنز:۔ ابھی تو وہ شائع نہیں ہو سکتی: اس میں بین الاقوامی سطح کی پیچیدگیاں حائل ہوں گی۔ کچھ عرصہ بعد، حکومت کی طرف سے کوئی اشاعت ضرور ہوگی۔

ایڈورڈ:۔ مگر کب؟

الکنز:۔ دو ایک سال میں۔

ایڈورڈ:۔ اس عرصہ کے درمیان کیا ہو گا؟

الکنز:۔ اس درمیان میں بندر بڑھتے جائیں گے۔

لیونیا:۔ اور عیسائی؟

الگز:۔ ہاں، عیسائی بھی! مگر اب مجھے تمہیں اسکے متعلق بتانا چاہئیے، جیسے تم لوگ جانتے ہو ــــ یا جانتے تھے .....

جولیا:۔ ایڈورڈ! کوئی شخص ضرور میری لاش پر سے گذر گیا ہے: مجھے اسی لئے بہت سردی محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے ذرا سی جن دے دو ــــ کاکٹیل نہیں۔ سردی سے میں برف ہو رہی ہوں ــــ اور وہ بھی جولائی کے مہینے میں!

کیٹرر کا ملازم:۔ مسٹر کوئلپ!

ایڈورڈ:۔ اب کون.....

(پیٹر داخل ہوتا ہے)

ارے، یہ تو پیٹر ہے!

لیونیا:۔ پیٹر!

پیٹر:۔ ہلو! آداب عرض ہے!

لیونیا:۔ تم کب آئے؟

پیٹر:۔ کل رات کو نیویارک سے ہوائی جہاز سے پہنچا ہوں ــــ تین روز قبل لاس اینجلز سے چلا تھا۔ دوپہر کے کھانے پر شیلا پیزلے سے ملاقات ہو گئی ــــ اور اسنے بتایا کہ تم نے پارٹی دے رکھی ہے ــــ وہ بھی گنگر کے ہاں سے لوٹتے ہوئے یہاں آئے گی۔ اس لئے میں نے کہا کہ میں بھی بن بلائے پہنچ جاؤں تو کیا برا ہے: ایڈورڈ اور لیونیا سے ملنے کا یہی ایک موقع ہے۔ میں صرف ایک ہفتہ کے لئے آیا ہوں۔ اور آج ہی رات کو کار کے ذریعہ دیہات کی طرف جا رہا ہوں۔ اس لئے میں نے سوچا کہ میرے یوں آجانے پر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ہم صدیوں کے بعد مل رہے ہیں! اور الگز، تم کیسے ہو؟ اور میری عزیز جولیا، تم!

لیونیا:۔ تو تم ابھی نیویارک سے آئے ہو۔

پیٹر:۔ ہاں، نیویارک سے۔ بولوگولومسکی اور اس کی بیوی مجھے چھوڑنے آئے تھی۔ تمہیں شہزادی بولوگولومسکی یاد ہے جن سے اگلے وقتوں میں ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ چند روز پہلے ہم نے

رات کا کھانا 'سیزن مونکی' (زعفرانی بندر) میں ساتھ کھایا تھا۔ آج کل کھانے کے لئے وہ بہت اچھی جگہ ہے۔

الکز:۔ بڑی عجیب بات ہے۔ میرے بندر بھی زعفرانی رنگ کے ہیں۔

پیٹر:۔ تمہارے بندر، الکز؟ میں ہمیشہ کہتا تھا کہ الکز ہر شخص کو جانتا ہے۔ مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی ملاقات بندروں سے بھی ہے!

جولیا:۔ مگر تم اپنی خبریں سناؤ، پیٹر۔ کچھ دنیا کے متعلق اپنی خبریں سناؤ۔ ہم لوگ تو، لندن میں بڑی خاموش سی زندگی بسر کرتے ہیں۔

پیٹر:۔ جولیا، تمہیں ہمیشہ دوسروں کو ستانے میں لطف آتا ہے: مگر تم لوگ یہ تو جانتے ہو کہ میں بین۔ ام۔ ایگل، کے لئے کام کر رہا ہوں؟

ایڈورڈ:۔ نہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ یہ بین۔ ام۔ ایگل، کیا چیز ہے؟

پیٹر:۔ واقعی تم لوگ بالکل ہی خاموش زندگی بسر کرتے ہو! تم لوگ فلم نہیں دیکھتے؟

لیونیا:۔ کبھی کبھار۔

پیٹر:۔ الکز کو معلوم ہے۔ الکز، تم نے میری آخری فلم دیکھی؟

الکز:۔ میں نے اس کے متعلق سنا ضرور ہوگا مگر میں اسے دیکھ نہ سکا۔ کنکنجا میں سینما ہی نہیں ہے۔

پیٹر:۔ کنکنجا؟ یہ کیا چیز ہے؟ وہ فلم نہیں دیکھتے کیا؟ بین۔ ام۔ ایگل کو اس پر توجہ دینی چاہئے۔ شاید فلم بنانے کے لئے وہ بڑا اچھا مقام ہو گا ــــ الکز بین۔ ام۔ ایگل کے متعلق سب کچھ جانتا ہے ــــ دراصل اسی نے میرا تعارف اس عظیم شخصیت بیلا سے کرایا تھا۔

جولیا:۔ یہ عظیم بیلا کون ہیں؟

پیٹر:۔ بیلا سزد گوڈی ــــ وہ میرے 'باس' ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ ہر شخص ان کے نام سے واقف ہے۔

جولیا:۔ الکز، کیا کیلی فورنیا میں وہی تمہارا متعلقہ آدمی ہے؟

الگزنڈ :۔ہاں، ہم اکثر ایک دوسرے کے کام آتے رہتے ہیں۔
پیٹر :۔ خیر، تو ہیلا نے ہی تو مجھے ہفتے بھر کے لئے بھیجا ہے۔ اور میں بہت مصروف ہوں۔
آج رات کو میں ''بولٹ ویل'' جا رہا ہوں۔
جولیا :۔ کیا وہاں ڈیوک کے ہاں قیام کرو گے؟
پیٹر :۔ یہ تو میں اس پر احسان کروں گا۔ ہم لوگ انگریزوں کی زندگی پر ایک فلم بنا رہے
ہیں۔ اور اسی سلسلے میں بولٹ ویل کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔
جولیا :۔ مگر میں نے تو یہ سنا تھا کہ بولٹ ویل بڑی بوسیدہ حالت میں ہے
پیٹر :۔ ہاں، ہے۔ اور اسی لئے ہمیں اس سے دلچسپی ہے! انگلینڈ کی بوسیدہ ترین شاہی
عمارت! کم از کم ان سب میں بوسیدہ ترین ہے، جو عمارتیں اب بھی آباد ہیں۔
ہم نے ماہرین کے ایک گروہ کو اس کی بوسیدگی کا مطالعہ کرنے کے لئے وہاں
بھیج دیا ہے تاکہ وہ اس کا ایک خاکہ تیار کر لیں۔ پھر ہم کیلی فورنیا میں ایک اور
بولٹ ویل تعمیر کریں گے۔
جولیا :۔ مگر تم کس حیثیت سے کام کر رہے ہو، پیٹر؟ کیا تم بھی بوسیدہ عمارتوں کے
ماہرین گئے ہو۔
پیٹر :۔ ارے نہیں تو! میں نے اس فلم کا ''اسکرپٹ'' لکھا ہے۔ اور ہیلا نے اسے بہت
پسند کیا۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے ''اصلی بولٹ ویل'' ضرور دیکھنا چاہیے۔ اسکے
علاوہ اس نے یہ بھی خیال ظاہر کیا کہ چونکہ میں انگریز ہوں، اس لئے ایک ڈیوک
سے معاملات طے کرنے کا بہترین طریقہ مجھے ہی معلوم ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ
ہمارے ساتھ ایکٹر بھرتی کرنے کیلئے ڈائریکٹر بھی ہیں۔ وہ خالص نمائندہ انگریز چہروں
کی تلاش میں ہیں ـــــ صرف چھوٹے چھوٹے پارٹوں کے لئے ...اور میں انہیں
یہ فیصلہ کرنے میں مدد کروں گا کہ کون سے چہرے نمائندہ چہرے ہیں۔
جولیا :۔ پیٹر، مجھے اس وقت بڑا زبردست خیال سوجھا ہے! کیلی فورنیا جانے کی مجھے
ہمیشہ سے بڑی آرزو رہی ہے: کیا تم اپنے بھرتی کرنے والے ڈائریکٹر کو اس بات

پر آمادہ نہیں کر سکتے کہ ہم سب کو بھرتی کرے؟ ہم لوگ تو بہت ہی نمائندہ ہیں

پیٹر:۔ نہیں، مجھے افسوس ہے کہ . . . .

کیٹرر کا ملازم:۔ سر ہینری ہارکورٹ رائلی!

جولیا:۔ ارے میں تو بھول گئی تھی۔ تمہارے لئے حیرت کا ایک اور سامان مہیا کر رہی ہوں۔ (رائلی داخل ہوتا ہے) میں تمہاری ملاقات سر ہینری ہارکورٹ رائلی سے کرانا چاہتی ہوں۔

ایڈورڈ:۔ ہمیں ان کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی ہے۔ مگر ہم ان سے پہلے ہی مل چکے ہیں۔

جولیا:۔ اگر انہیں پہلے ہی سے جانتے ہو، تو تم ان سے نہیں ڈرو گے کبھی، میں تو پہلی مرتبہ ان سے بہت ڈر گئی تھی: وہ اتنے رعب دار معلوم ہوتے ہیں۔

رائلی:۔ میری عزیز جولیا، مانا کہ تعارف کرانا ضروری تھا، مگر تم میرا بڑا خراب تعارف کروا رہی ہو۔

جولیا:۔ میرے عزیز ہنری، تم میری بات کاٹ رہے ہو۔

لیونیا:۔ سر ہنری، اگر آپ جولیا کی بات کاٹ سکتے ہیں، تو آپ وہ موزوں ترین مہمان ہیں جسکے ہم منتظر تھے۔

رائلی:۔ جولیا کی بات کاٹنے کی کوشش کرنے کا تو میں خواب بھی دیکھنا نہیں چاہتا. . .

جولیا:۔ مگر تم دونوں میری بات کاٹ رہے ہو!

رائلی:۔ اب کس نے کاٹی بات؟

جولیا:۔ بہرحال، تمہیں میرے بات کاٹنے کو بھی کاٹنا نہیں چاہئے: یہ تو بات کاٹنے سے بھی زیادہ بری بات ہے! اب تو میرا سر چکرانے لگا ہے۔ میں ایک کاکٹیل لینا چاہتی ہوں۔

ایڈورڈ:۔ (رائلی سے) آپ کاکٹیل لیں گے؟

رائلی:۔ مجھے پانی کا ایک گلاس مل جائے گا؟

ایڈورڈ:۔ اور اس کے ساتھ کچھ؟

رائلی :۔ کچھ نہیں شکریہ۔

لیونیا :۔ میں آپ کا تعارف مسٹر پیٹر کونلپ سے کراؤں؟ سر سبزی ہارکورٹ رائلی۔ پیٹر میرے شوہر کے اور میرے بہت پرانے دوست ہیں۔ ارے، میں بھول گئی ـــــ (الکز کی طرف مڑکر) میں نے فرض کر لیا تھا کہ آپ ایک دوسرے کو ضرور جانتے ہوں گے ـــــ معلوم نہیں میں نے یہ کیوں سوچا تھا۔ مسٹر منک کا لگی گبز۔

الکز :۔ ہاں، یقیناً ہم مل چکے ہیں۔

رائلی :۔ کئی کمیشنوں پر۔

جولیا :۔ ہم بڑی دلچسپ گفتگو میں مصروف تھے۔ پیٹر ابھی ابھی کیلی فورنیا سے آیا ہے جہاں اسنے فلمی دنیا میں بڑی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ آج کل انگریزوں کی زندگی پر کوئی فلم بنا رہا ہے۔ اور اب ہم سب کو اس میں پارٹ دلوا رہا ہے۔ ذرا سوچو تو!

پیٹر :۔ مگر جولیا، میں یہ وضاحت کرنے والا تھا کہ ـــــ مجھے افسوس ہے کہ میں اس فلم میں کسی کو کوئی پارٹ نہیں دلوا سکتا۔ ـــــ یہ میرا کام نہیں ہے۔ اور پھر یہ کام اس طرح نہیں کیا جا سکتا۔

جولیا :۔ مگر، پیٹر۔ اگر تم بولٹ دیل کو کیلی فورنیا لے جارہے ہو، تو مجھے کیوں نہیں لے جا سکتے؟

پیٹر :۔ ہم بولٹ دیل کو نہیں لے جارہے، ہم تو بولٹ دیل کو از سر نو تعمیر کریں گے۔

جولیا :۔ ٹھیک ہے، تو پھر مجھے بھی کیوں نہیں از سرِ نو تعمیر کر لیتے؟ یہ کام تو بہت ہی سستا ہے۔ ارے خیر جانے دو، میں دیکھ رہی ہوں کہ مجھے نہ لینے کا تم عزم کر چکے ہو: کیلی فورنیا جانے کی میری آرزو کو خدا حافظ کہنا ہی بہتر ہے۔

پیٹر :۔ تمہیں معلوم ہے کہ اگر ہم تمہیں دعوت دیں تو تم کبھی نہ آؤ گی۔ مگر میں کسی اور کے لئے دریافت کرنا چاہتا تھا۔ جسکو فلموں میں جانے کی بڑی آرزو تھی ـــــ اور میں ہمیشہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر اسے موقع مل جائے، تو وہ بہت کامیاب ثابت ہوگی میں اسلیا کوپل سٹون کے لئے کہہ رہا ہوں۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتی تھی۔ اور اب میں اس کی مدد

کرسکتا ہوں۔ میں سیلیا سے اس کے متعلق پہلے ہی بات کرچکا ہوں۔ اور میں اس کا تعارف بھرتی کرنے والے ڈائرکٹر سے کرانا چاہتا ہوں۔ ایک اور فلم کا پلاٹ بھی میرے ذہن میں ہے۔ آپ لوگ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں ہے۔ ٹیلی فون ڈائرکٹری میں بھی اس کا نام نہیں مل سکا۔

جولیا :۔ نہ اس ڈائرکٹری میں، نہ کسی اور ڈائرکٹری میں مل سکے گا۔ الکز، اب تم انہیں بتا سکتے ہو!

لیونیا :۔ یہ جولیا کیا کہہ رہی ہے۔

الکز :۔ میں اسی کے متعلق بات کرنے لگا تھا کہ تم آگئے پیٹر۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں سیلیا نہیں مل سکتی۔

پیٹر :۔ اچھا . . . . کیوں کیا اس کی شادی ہو گئی ؟

الکز :۔ نہیں، شادی نہیں ہوئی۔ وہ مرگئی۔

لیونیا :۔ سیلیا ؟

الکز :۔ مرگئی۔

پیٹر :۔ مرگئی۔ تو تو معاملہ ہی ختم ہو گیا!

ایڈورڈ :۔ سیلیا مرگئی۔

جولیا :۔ الکز، بہتر یہ ہے کہ تم انہیں کنکنجا کی تمام خبریں سنا دو۔

لیونیا :۔ کنکنجا ؟ سیلیا کنکنجا میں کیا کر رہی تھی ؟ ہم نے تو سنا تھا کہ وہ نرسوں کی ایک تنظیم میں شامل ہو گئی تھی۔

الکز :۔ وہ ایک تنظیم میں ضرور شامل ہو گئی تھی۔ اور تنظیم بھی بڑی مقدس تھی۔ اور اس کو نرسنگ کا تجربہ بھی تھا۔

لیونیا :۔ ہاں مجھے معلوم ہے کہ وہ اعزازی امدادی جماعت (وی۔اے۔ڈی) کی ممبر تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

الکز :۔ اسے کنکنجا بھیجا گیا تھا، جہاں بہت سے وبائی امراض ہیں۔ علاوہ ان امراض کے

جو یورپی لوگ وہاں لے جاتے ہیں۔ اور وہاں پلیگ کے لئے بھی حالات بڑے
سازگار ہیں۔

ایڈورڈ:۔ بات جاری رکھو۔

الکز:۔ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کے ایک گاؤں میں تین نرسیں متعین تھیں۔ گاؤں کے
مقامی لوگوں کی نصف آبادی اس موذی مرض سے مر رہی تھی۔ وہ تینوں نرسیں ہفتوں سے
حد سے زیادہ کام کر رہی تھیں۔

ایڈورڈ:۔ پھر کیا ہوا؟

الکز:۔ اور پھر کافروں میں بغاوت پھیل گئی۔ وہی جس کا میں ذکر رہا تھا۔ انہیں اسکی اطلاع
ملی، مگر وہ مرتے ہوئے مقامی باشندوں کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ بعد میں ان
میں سے دو تو وہاں سے بچ نکلیں: ایک جنگل میں مر گئی، اور دوسری پھر کبھی عام زندگی
بسر کرنے کے قابل نہ ہو سکے گی۔ مگر سیلیا کوپل سٹون ـــــ وہ پکڑلی گئی۔ جب
ہمارے آدمی گاؤں میں پہنچے، تو انہوں نے گاؤں والوں سے ـــــ جو بھی بچ گئے تھے اسکے
متعلق پوچھا۔ اور انہیں اس کی لاش مل گئی۔ یا کم از کم لاش کے چند نقوش مل گئے۔

ایڈورڈ:۔ مگر اس سے پہلے .....

الکز:۔ اس کے متعلق کچھ بتانا مشکل ہے۔ مگر مقامی طریقوں کا جو کچھ علم ہمیں حاصل ہے، اسکی
بنا پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے چیونٹیوں کے بل کے قریب ذبح کیا گیا ہوگا۔

لیونیا:۔ مگر سیلیا! ..... کیا دنیا میں وہی رہ گئی تھی۔

ایڈورڈ:۔ اور پلیگ میں مبتلا مٹھی بھر مقامی باشندوں کے لئے کون مر سکتا ہے۔

الکز:۔ ہاں، مریض تو سب کے سب مر گئے۔ چونکہ پلیگ کے مریض تھے، اس لئے انہیں کھایا
نہیں گیا۔

لیونیا:۔ ایڈورڈ، مجھے بہت افسوس ہے ـــ مگر یہ کہنا کتنی پھیکی بات معلوم ہوتی ہے مگر تم
جانتے ہو کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔

ایڈورڈ:۔ اور تم جانتی ہو کہ میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں۔

پیٹر :۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں دو سال باہر رہا ہوں اور مجھے کچھ معلوم نہیں کہ ان دو سالوں میں سیلیا پر کیا گذری۔ دو سال! سیلیا کے متعلق سوچتے ہوئے دو سال!

ایڈورڈ :۔ مجھے تو اس کی زندگی کے ضائع ہونے کا بہت رنج ہے۔

پیٹر :۔ تم لوگ مجھ سے زیادہ جانتے ہو: میرے لئے تو اور جو کچھ ہے، وہ ضائع ہو گیا۔ دو سال! یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی تھی۔ جولیا! تم کیوں کچھ نہیں کہتیں؟

جولیا :۔ تم نے اپنے حسب حال اسے دو سال دے دیئے۔

پیٹر :۔ اسنے ..... یہ کام کب لیا تھا؟

جولیا :۔ دو سال ہوئے۔

پیٹر :۔ دو سال ہوئے! میں نے اسے بھول جانے کی کوشش کی یہاں تک کہ میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھنے لگا تھا اور مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ اور پھر نہ جانے کیوں میں اس کے متعلق سوچنے لگا۔ اس کا خیال اور زیادہ ستانے لگا۔ پہلے تو میں سیلیا کے متعلق کچھ جاننا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے کسی سے نہیں پوچھا۔ پھر میں نے جاننا چاہا، مگر پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس وقت بھی میں نے بڑی ہمت سے کام لے کر تم سے پوچھ لیا۔ مگر میں نے ایسی بات کا تصور بھی نہ کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاید میں اسے جان نہ سکا، میں اسے سمجھ نہ سکا۔ میں کچھ بھی نہیں سمجھتا۔

رائلی :۔ آپ اپنے کام کو سمجھتے ہیں، مسٹر کوئلپ ـــــ اس سے زیادہ ہم آپ سے کوئی توقع نہیں رکھ سکتے۔

پیٹر :۔ کیا خوب کام ہے صاحب! میں نے اس میں یقین پیدا کرنے کی کوشش کی، تاکہ مجھے اپنے آپ پر یقین ہو سکے۔ میں سوچتا تھا کہ میرے تخیلات سینما کی دنیا میں انقلاب بپا کر دیں گے، جن کو کوئی شخص نظر انداز نہیں کر سکتا ـــــ اور اب میرا حال یہ ہے کہ میں ایک دوسرے درجے کی عامیانہ فلم بنا رہا ہوں! مگر میں سمجھتا تھا کہ اس تجربہ سے آئندہ بہتر کام کر سکوں گا۔ اور جب تک سیلیا زندہ تھی، یہ بہت ممکن نظر آتا تھا۔

میں سیلیا کے لئے ہی یہ کام کرنا چاہتا تھا اور اسی کے لئے اس کام میں میرا عقیدہ تھا۔
میں سیلیا کے لئے ہی کچھ کرنا چاہتا تھا ــــ سب سے اہم چیز یہی تھی کہ سیلیا زندہ
تھی اور اب سب کچھ ہیچ اور بے معنی ہے۔ سیلیا زندہ نہیں ہے۔

لیونیا:۔ نہیں، یہ سب کچھ بے معنی نہیں ہے، پیٹر۔ تم نے ابھی تو ابتدا کی ہے۔ میرا مقصد یہ
ہے کہ اس واقعہ نے تمہیں اس نقطہ پر پہنچا دیا ہے جہاں سے تمہیں شروع کرنا چاہئے
تم ابھی کہہ رہے تھے کہ تم سیلیا کو کبھی سمجھ نہ سکے تھے ہم میں سے کوئی بھی اسے سمجھ نہ سکا
سیلیا کا جو تصور تم نے اپنی زندگی کے لئے قائم کر رکھا ہے، وہ تم نے خود اپنے لئے اپنی
ضروریات کی تسلی کے لئے بنایا ہے۔ پیٹر، تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں یہ تمہارا دل دکھانے
کے لئے کہہ رہی ہوں . . . . .

پیٹر:۔ نہیں لیونیا، میں نہیں سمجھتا کہ تم میرا دل دکھا رہی ہو، اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ٹھیک
کہہ رہی ہو۔

لیونیا:۔ میں جو کچھ کہہ رہی تھی، وہ شاید کم تکلیف دہ ثابت ہو اگر میں تمہیں یہ سمجھا سکوں کہ
درحقیقت یہ باتیں میں اپنے متعلق ہی کہہ رہی تھی۔

ایڈورڈ:۔ لیونیا نے صحیح کہا تھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے تمہیں شروع کرنا ہے۔ پیٹر، اگر اس
وقت تمہیں وہ باتیں معلوم ہو جائیں، جن کا تم مقابلہ نہیں کرنا چاہتے، تو یہ یاد رکھو
کہ بعض لوگوں کو اپنے متعلق اس سے بھی بدتر باتیں معلوم کرنی پڑتی ہیں، اور
اس وقت معلوم ہوتی ہیں، جب کہ سنبھلنا اور ایک نئی ابتدا کرنا بہت مشکل
ہوتا ہے۔ تمہارے لئے یہ اتنا مشکل نہیں ہے۔ تم تو فطری طور پر ایک نیک انسان

پیٹر:۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ جو کچھ تم نے کہا، اس کا میں قائل ہو گیا ہوں
مگر اس کے باوجود میں بہت شکر گذار ہوں۔ جتنی دیر تم باتیں کر رہے تھے، ایک خیال
میرے ذہن میں مسلسل گردش کرتا رہا ہے ــــ کہ مجھے صرف اپنی ذات ہی میں دلچسپی
رہی ہے: اور سیلیا کے لائق بننے کے لئے یہ کافی نہیں ہے۔

جولیا:۔ پیٹر، تم نے دوسروں کو دیکھنا ضرور سیکھ لیا ہوگا کیونکہ تم انہیں فلموں کے نقطۂ نگاہ

سے دیکھا کرتے ہو: یعنی اس وقت جب تم اپنے آپ سے بے خبر ہوتے ہو اور محض ایک آنکھ بن جاتے ہو۔ ایک دن، سیلیا کو بھی تم اسی طرح دیکھنے لگو گے۔ اس وقت تم اسے سمجھ سکو گے، حالات سے سمجھوتہ کر لوگے اور اس کے خیال میں تم خوش رہو گے۔

لیونیا:۔ سر ہنری، میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔ جب الکز ہمیں یہ بتا رہا تھا کہ سیلیا پر کیا بیتی، اس وقت میں آپ کے چہرے کو دیکھ رہی تھی اور آپ کے چہرے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی موت جس طریقہ سے واقع ہوئی، اسنے آپ پر مطلق کوئی اثر نہ کیا۔ اور نہ اس حقیقت کا آپ پر کوئی اثر ہوا کہ وہ اس لئے مرگئی کہ وہ چند ایک مقامی باشندوں کو مرتا ہوا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

رائلی:۔ یہ کون جانے مسز چیمبرلین کہ اس کی موت سے ان مرتے ہوئے مقامی باشندوں کے لئے کیا فرق پڑا یا وہ کس ذہنی عالم میں مرگئے؟

لیونیا:۔ میں یہ بات تسلیم کرنے کو تیار ہوں۔ مگر جو بات میرے لئے قابلِ توجہ تھی، وہ یہ کہ جس طریقے اس کی موت واقع ہوئی، اس سے آپ کے چہرے پر حیرت یا دہشت کے کوئی آثار پیدا نہ ہوئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ اسے جانتے تھے یا نہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ آپ اسے جانتے تھے۔ بہرحال اسکے متعلق آپ کو علم ضرور تھا۔ اس کے باوجود مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آپ کے چہرے کا تاثر اطمینان کا سا تھا۔

رائلی:۔ مسز چیمبرلین، یا تو میں بہت ہی شفاف ہوں، یا آپ کی بصیرت بڑی تیز ہے۔

جولیا:۔ ہینری، لیونیا کی قوت مشاہدہ تمہارے اندازے سے کہیں زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ لیونیا نے تمہیں کھل کر مقابلہ پر مجبور کر دیا ہے۔

رائلی:۔ تم نے صورتحال کو بالکل صحیح بیان کر دیا ہے جولیا، اگر میں اشعار کا سہارا لوں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا، مسز چیمبرلین؟

لیونیا:۔ بالکل نہیں ـــ آپکو شعروں میں گفتگو کرتے ہوئے سنکر مجھے بے حد مسرت ہوگی..

جولیا:۔ اسنے حجت بالکل صحیح کی ہے، ہینری۔

لیونیا:۔ ... اگر شعروں سے میرے سوالات کا جواب مجھے مل جائے۔

رائلی:۔ "بابل کے خاک ہو جانے سے قبل
اے میرے مُردہ بچے، عظیم زرتشت نے
اپنے ہی عکس کو باغ میں ٹہلتے دیکھا
اسنے اس ہیولی کو انسانوں کے خمیر کو دیکھا
جانو کہ موت و زیست کے دو عالم ہیں۔
ایک، جو تم دیکھ سکتے ہو، مگر دوسرا
قبر کے نیچے جہاں،
ان تمام صورتوں کے سائے موجود ہیں جو سوچتی ہیں، اور زندہ رہتی ہیں۔
یہاں تک کہ موت انہیں ملا کر ایک کر دیتی ہے، اور پھر وہ ایک دوسرے سے
کبھی جدا نہیں ہوتیں۔"

جب میں پہلی مرتبہ اسی کمرے میں مس کوپل سٹون سے ملا، تو میں نے ان کی کرسی کے پیچھے ایک ایسی سیلیا کوپل سٹون کا ہیولی دیکھا جسکے چہرے پر ایسا استعجاب دیک رہا تھا جو تشدد سے واقع ہونے والی موت کے بعد پہلے پانچ منٹوں میں پیدا ہوتا ہے اگر اس بات پر یقین کرنے میں آپ کو دقت پیش آئے، مسز چیمبرلین، تو میں آپ کو صرف اس بات کو ماننے پر آمادہ کروں گا کہ بعض ذہنوں پر جب اچانک کوئی کشف ہوتا ہے، تو وہ اکثر ایک تصویر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کبھی کبھار میرے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے۔ اس لئے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک ایسی عورت تھی، جسے موت کی سزا ہو چکی تھی، یہی اس کا مقدر تھا۔ اس وقت سوال صرف یہ تھا کہ کس قسم کی موت میں کیسے جان سکتا تھا۔ کیونکہ خود اسے ہی ایسی زندگی کا انتخاب کرنا تھا جو اسے موت تک پہنچا دے، اور باوجودیکہ اسکو اختتام کا کوئی علم نہ تھا، اسے موت کے طریقے کا بھی انتخاب کرنا تھا۔ اب ہمیں معلوم ہے کہ اسنے کیسی موت کو منتخب کیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اسکی موت اس طرح واقع ہو گی۔ اسے بھی معلوم نہ تھا۔ اسلئے میں صرف یہ کر سکتا تھا کہ میں اسکو اس کیلئے تیار رہنے کا راستہ بتا دوں، وہی راستہ جسکو اس نے قبول کر لیا تھا، اسے اس موت کی طرف لے گیا۔ ادھ

اگر یہ موت خوشگوار نہیں ہے تو اور خوشگوار موت کیا ہو سکتی ہے؟

ایڈورڈ:۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ جب اسنے موت کے طریقے کا انتخاب کر لیا، تو اُسے وہ تکلیف نہیں ہوئی ہو گی، جو عام آدمیوں کو ہوتی ہے؟

رائلی:۔ میرا مطلب یہ بالکل نہیں ہے۔ میرا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں تو یہ کہونگا کہ اسے وہ سب کچھ سہنا پڑا جو ہم خوف، اذیت اور شدید نفرت میں ــــ بلکہ ان سب احساسات کے ایک ساتھ ہونے پر ــــ اور جسم کے ایک "شے" بن جانے سے انکار کی حالت میں محسوس کر سکتے ہیں۔ میں یہ بھی کہوں گا کہ اسنے اور بھی زیادہ تکلیف برداشت کی ہو گی کیونکہ وہ ہم تمام لوگوں سے زیادہ باشعور تھی۔ اس کے تکلیف برداشت کرنے کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہ اس کے مقدر کا ہی ایک حصہ تھا۔

لیونیا:۔ شاید وہ اس سے قبل اس سے بھی زیادہ کرب میں مبتلا رہ چکی تھی۔ میں یہ اسلئے کہتی ہوں کہ ــــ مجھے اس کے آخری دو سالوں کے متعلق کوئی علم نہیں ہے۔

رائلی:۔ یہ آپ کی بصیرت کی دلیل ہے، مسز چیمبرلین۔ مگر ایسے تجربہ کی نشاندہی صرف تصور اور دیومالاؤں میں ہی ہو سکتی ہے۔ اسکے متعلق بات کرتے سے ہم محض تاریکی، بھول بھلیوں یا مینوتورس، دہشت انگیزیوں جیسی گھناؤنی باتوں پر اتر آتے۔ مگر وہ دنیا اس دنیا کی جگہ نہیں لیتی۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ صحرا میں بیٹھے ہوئے راہب کو جس کی گردن پر روحانی بدی ہمیشہ منڈلاتی رہتی تھی۔ بھوک سے، سیل سے، سردی سے، معدہ کی تکلیف سے، شیروں کے خوف سے، رات کی سردی اور دن کی گرمی سے ہمارے مقابلے میں کم اذیت برداشت کرنی پڑی تھی؟

ایڈورڈ:۔ اگر یہ سب کچھ صحیح تھا ــــ اگر یہ سیلیا کے لئے صحیح تھا ــــ تو کوئی اور چیز ضرور ہے، جو خطرناک حد تک غلط ہے اور اس غلط چیز کے لئے ہم سب لوگ ذمہ دار ہیں مجھے صرف اپنے لئے ہی کہنا چاہئے۔ اور میں یہ کہتا ہوں کہ میں بھی اسکا ذمہ دار ہوں۔

رائلی:۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپکے ذہن سے ایک رکاوٹ دور کر دوں: آپ خود کو

اس چیز سے الگ رکھنے کی کوشش کیجئے جب آپ اب بھی اپنی ذمہ داری تصور کرتے ہیں۔

ایڈورڈ۔ میں یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوں کہ ایک طرح سے، چند نیم پاگل وحشیوں کے ایک گروہ کے مقابلے میں میں اس کا زیادہ ذمہ دار ہوں۔

لیونیا :۔ ایڈورڈ، میں اسی وقت سمجھ گئی تھی! میں سمجھ گئی تھی کہ تم کیا سوچ رہے ہو! کیا تمہیں اس سے کچھ تقویت نہیں ہوتی کہ میں بھی اپنے آپ کو مجرم سمجھتی ہوں؟

رائلی :۔ اگر ہمیں اپنے الفاظ اور اپنے اعمال کے نتائج کی بنا پر پرکھا جائے، جانچا جائے، اور اپنے مافی الضمیر اور اپنے ارادے اور دوسروں کیلئے ہماری محدود سمجھ کو ملحوظ نہ رکھا جائے، تو ہم سب عذاب النار کے لائق ٹھہریں گے۔ مسز چیمبر لین، مجھے اکثر ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں جو کسی مریض کی صحتیابی یا خاتمے کا باعث بن سکتے ہیں ـــــ اور مجھ سے بعض دفعہ غلط فیصلہ بھی سرزد ہوا ہے۔ جہاں تک مس کوپل سٹون کا تعلق ہے، آپ چونکہ اس کی موت کو ایک زندگی کا ضائع ہونا تصور کرتی ہیں، اس لئے آپ اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھتی ہیں، اور چونکہ آپ اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتی ہیں، اس لئے اس کی موت کو اسکی زندگی کے ضائع ہوجانے کے مترادف سمجھتی ہیں۔ میں تو اسکی موت کو اسکی کامرانی سمجھتا ہوں۔ مگر اس کامرانی کا ذمہ دار میں نہیں ہوں ـــــ اور اس کی ذمہ داری جتنی آپ پر ہے، اتنی مجھ پر بھی ہے۔

لیونیا :۔ اس کے باوجود میں خود کو اسکے ساتھ اتنی بے مروتی ـــــ اور اتنا کینہ کرنے پر الزام دیتی رہوں گی۔ میری آنکھوں میں ہمیشہ وہ منظر چبھتا رہے گا، جب دو سال پہلے اسنے ہمیں خدا حافظ کہا تھا۔

ایڈورڈ۔ تمہاری ذمہ داری میری ذمہ داری کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، لیونیا۔

رائلی :۔ آپ کو ان یادوں کے ساتھ زندہ رہنا ہے اور انہیں ایک نئی شکل دینی ہے۔ صرف ماضی کو اپنانے سے ہی آپ اسکو نئے معنی دے سکیں گے۔

جولیا :۔ ہنری، میں سمجھتی ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ میں بھی کچھ کہوں۔ ہر انسان کسی نہ کسی قسم

کا انتخاب ضرور کرتا ہے اور پھر اس کو اس کے نتائج بھی بھگتنا پڑتے ہیں۔ سیلیا نے بھی ایک
انتخاب کیا تھا جس کا نتیجہ کنکنجا تھا۔ پیٹر نے بھی ایک راستہ منتخب کیا، جس کی
منزل بولٹ ویل ہے : اور اسے وہاں ضرور جانا ہے۔۔۔۔۔

پیٹر :۔ میں سمجھا تمہارا کیا مقصد ہے۔ کاش مجھے جانا نہ ہوتا۔ مگر موٹر ــــ اور وہ ماہرین میرا
انتظار کر رہے ہوں گے ــــ میں تو انہیں بھول ہی گیا تھا۔ مجھے یہ احساس ہے کہ میں اس
سے نکل نہیں سکتا ــــ اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔

الکز :۔ یہ تمہاری اپنی فلم ہے۔ اور مجھے معلوم ہے کہ سیلیا کو اس سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

پیٹر :۔ اچھا تو میں چلا۔

ایڈورڈ :۔ پیٹر، کیا انگلینڈ سے جانے سے قبل تم سے ملاقات ہو گی؟

لیونیا :۔ اگر ہو سکے تو ہم سے ضرور آ کر ملنا۔ ہم تینوں ــــ تم، میں اور ایڈورڈ۔ مل کر سیلیا
کی باتیں کریں گے اور اس سے ہمیں کچھ تسکین حاصل ہو گی۔

پیٹر :۔ شکریہ۔ مگر پھر کبھی ــــ اس مرتبہ تو میرے لئے ممکن نہ ہو گا۔

ایڈورڈ :۔ مگر آئندہ جب آؤ گے تب؟

پیٹر :۔ ہاں، آئندہ جب انگلینڈ آیا تو ضرور ملوں گا۔ دراصل میں تم دونوں سے ملنے کی بڑی
آرزو کرتا ہوں۔ خدا حافظ جولیا۔ خدا حافظ الکز۔ خدا حافظ سر ہنری۔

(چلا جاتا ہے)

جولیا :۔ ۔۔۔۔۔ اور اب مسٹر اور مسز چیمبرلین کے انتخاب کا نتیجہ ہے ایک کاکٹیل پارٹی۔
ان کو اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ ان کے مہمان بس آنے ہی والے ہیں۔

رائلی :۔ جولیا، تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اب مسٹر اور مسز چیمبرلین کو ایک دعوت
کرنی چاہیئے تھی۔ جو کہ وہ کر رہے ہیں۔

لیونیا :۔ میں گذشتہ پانچ منٹ سے یہی سوچ رہی تھی کہ میں مہمانوں سے کیونکر مل سکوں
گی۔ کاش، یہ دعوت ختم ہو جائے۔ میرا مطلب ہے کہ ۔۔۔۔۔ بڑا اچھا ہوا کہ آپ
لوگ آئے ۔۔۔۔۔ اچھا ہوا کہ الکز نے بتا دیا ۔۔۔۔۔ اور پیٹر کو بھی معلوم

ہو ہی گیا۔

ایڈورڈ:۔ اب میں سمجھ گیا کہ .....

لیونیا:۔ تو پھر مجھے بھی سمجھا دوگے نا!

ایڈورڈ:۔ مگر میں ابھی اتنا زیادہ بھی نہیں سمجھا! میرا خیال ہے کہ سر ہینری یہ فرمار ہے تھے کہ
ہر ایک لمحہ ایک نئی ابتدا، ایک نیا آغاز ہے۔ اور جولیا یہ کہہ رہی تھی کہ زندگی محض
چلتے رہنے کا نام ہے۔ اور کسی طرح یہ دونوں خیال ایک دوسرے سے منسلک معلوم
ہوتے ہیں۔

لیونیا:۔ مگر اسکے باوجود ..... میں ان لوگوں سے ملنا نہیں چاہتی۔

رائلی:۔ یہ کوفت تو آپ کے لئے متعین ہے۔ جہاں تک دعوت کا تعلق ہے، مجھے یقین ہے
کہ وہ ضرور کامیاب ہوگی۔

جولیا:۔ ہینری، میرا خیال ہے کہ ہمیں پارٹی شروع ہونے سے پہلے چل دینا چاہئے۔ ہماری غیر موجودگی
میں یہ زیادہ بہتر نبھا سکیں گے۔ تم بھی چلو الکز۔

لیونیا:۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ آپ لوگ چلے جائیں۔

الکز:۔ ہمیں کہیں اور جانا ہے۔

رائلی:۔ اور اس موقع پر میں بن بلائے نہیں جارہا ہوں

جولیا:۔ چلو ہینری، چلو الکز۔ گنگز کے یہاں ہو آئیں۔

(جولیا، رائلی اور الکز چلے جاتے ہیں)

لیونیا:۔ ایڈورڈ، میں کیسی لگ رہی ہوں؟

ایڈورڈ:۔ اچھی لگ رہی ہو۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ مگر تم تو ہمیشہ
ہی بہت خوبصورت لگتی تھیں۔

لیونیا:۔ یہ کہہ کر تم نے بات کا مزا کرکرا کر دیا، ایڈورڈ۔ کوئی عورت یہ یقین نہیں کر سکتی کہ
وہ ہمیشہ خوبصورت لگتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ جب تم صرف مجھے خوش کرنے کے
لئے باتیں بناتے ہو، تو تمہارے چہرے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ میں ہمیشہ

بہت خوبصورت لگتی ہوں۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہوسکتا ہے کہ میں بہت
بری لگتی ہوں۔

ایڈورڈ۔ میں تعریف کرنا اور داد دینا کبھی نہ سیکھ پاؤں گا۔

لیونیا:۔ تمہیں صرف میرے لباس کی تعریف کرنی چاہئے تھی۔

ایڈورڈ۔ مگر اس کے لئے تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مجھے بہت پسند ہے۔

لیونیا:۔ مگر اس کے بعد اتنا کچھ ہو چکا ہے۔ اور پھر ایک تعریف کو دوبارہ سننے کو بھی تو جی
چاہ سکتا ہے۔

ایڈورڈ:۔ اب تو دعوت کے متعلق سوچنا چاہئے۔

لیونیا:۔ ہاں دعوت کے متعلق سوچنا چاہئے۔

ایڈورڈ۔ ذرا دیر میں ختم ہو جائے گی۔

لیونیا:۔ کاش کہ اب شروع ہو جائے۔

ایڈورڈ:۔ لو سنو، دروازے پر گھنٹی بج رہی ہے۔

لیونیا:۔ ہاں! اب اطمینان ہوا۔ ابتدا تو ہوئی۔

پردہ

فٹ نوٹ

۱؎ صفحہ ۱۲۳ انیسویں صدی میں فرانس کی دولت مند خواتین اپنی تشہیر کے لئے ادیبوں اور فنکاروں کی سرپرستی کرنے اور ان کو ایک دوسرے سے ملانے کے لئے یا کسی نئے فن کار کو پرانے فنکاروں اور نقادوں سے ملوانے کے لئے وقتاً فوقتاً ایک خاص مقام پر پُر تکلف ڈنر دیا کرتی تھیں ان مقامات کو "SALON" کہا جاتا تھا۔

۲؎ صفحہ ۱۲۴ کنسرٹ:۔ یورپ کے معاشرے میں، کلاسیکی موسیقی کی محفلیں بہت

اونچی سطح پر منعقد ہوتی ہیں ان میں کوئی مشہور آرکیسٹرا قدیم کلاسیکی دھنوں پر اپنے ہنر کے کمالات کا مظاہرہ کرتا ہے تو اسے کنسرٹ کہتے ہیں۔

۳ صفحہ ۱۳۳ اصل متن میں GOOD SAMARITANS الفاظ ہیں۔ یہ انگریزی کا محاورہ توریت اور انجیل سے ماخوذ ہے۔ سمارٹین سماریہ کے باشندوں کو کہتے ہیں جو مذہبا بہت سخی مشہور ہیں۔ انگریزی میں یہ فقرہ بے لوث سخاوت کے معنوں میں مستعمل ہے۔ طنزیہ مفہوم کے لئے بھی مستعمل ہے۔ میں نے اپنے ہی ادب کے مشہور سخی کردار حاتم طائی کا نام ترجمہ میں استعمال کیا ہے تاکہ کوئی ضم کا پہلو نہ رہے ۔۔۔ اور معنوی لحاظ سے بھی ربط قائم رہے۔

۴ صفحہ ۱۴۲ عیسائیوں میں ایک مذہبی روایت ہے کہ ہر انسان کا اپنا ایک محافظ فرشتہ یا سینٹ ہوتا ہے THE GUARDIANS اسی طرف اشارہ ہے۔

۵ صفحہ ۲۱۷ مینا تور MINOTOUR یونانی دیو مالا کا ایک بھیانک کردار جس کا آدھا جسم بیل کا اور آدھا انسان کا تھا۔ اور جو انسانی گوشت پہ زندہ رہتا تھا۔

افسانے

زخمِ دل

ابوالفضل صدیقی کا ناولٹ "زخمِ دل" قسط وار نیا دور میں شائع کیا جا رہا ہے۔ دو قسطیں پہلے شائع کی جا چکی ہیں ۔ تیسری قسط اس شمارہ میں شامل ہے ۔ ہر قسط اپنی جگہ مکمل بھی ہے اور اگلے پچھلے حصوں سے مربوط بھی۔

(ادارہ)

ابوالفضل صدیقی

کچھ خاص بانکپن کے ساتھ الفت اپنی خاص مشکی (سیاہ) گھوڑی پر سوار جنگل کی سمت بڑی مخصوص
ادا کے ساتھ بانکتا ہوا چلا جا رہا تھا اور گھوڑی کی آسن کی مخصوص لپک سے سوار کے دلی جذبات بھانپ
رہی تھی، آپوں آپ ناچنے جیسے قدم اٹھا اٹھا کر چل رہی تھی۔

چنتامن بھگت پیپل کی چھاؤں میں اپنی بانسری اور تان کی [illegible] ہوئی دوارے کے سامنے چوپال
پر پیپل کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور چلم کا دم لگا رہے تھے۔ کنور الفت رائے کو دیکھ کر بولے
"واہ جی واہ آج تیسرا دن ہے خبر آئی ہے تمہارے اس چاکر کی زبانی — کیا نام ہے اس کا —
دھنوا، — میں تو خود آجاتا پر ادھر وہ پنچھ سے آتا ہوا مل گیا اور میں بھی ذرا آتے جھجکتا تھا بات دہار
بستی پر ٹھہرایا۔ نہیں ہوا کرتی، اب یہاں سب ٹھٹے کھل کر ہوگی۔

"ہاں یار وہ مجھے معلوم تو برسوں ہی ہو گیا تھا کہ تم نے بلایا ہے — پھر میں کر آتا کو تھا —
چپ چاپ بیت گئی۔"

"کیسی چپ چاپ؟ — ہاں ٹھیک ساون کی اماوس تھی رات بس اسی اندھیرے میں وہ لگ
اڑ گئے — کیوں چپ چاپ کیوں پھیل گئی، پانچ مہینہ تو مزے لوٹ لئے اب ذرا دم لو — پیٹ بھر
ہیں" بھگت جی کی آنکھوں میں سرور تو پہلے ہی سے تھا لال ڈورے کی شوخی اور زیادہ اچھل آئی۔

"نہیں وہ یہ بات نہیں اور بات ہوں آں اور تم نے کیوں بلوایا تھا؟"

"تیر ٹھیک سمجھا۔ میری طلبی آگئی اور میں جب تک تم سے بات نہ کرلوں کیسے جاؤں بس پانچ
سال کو ایسا سا کر آؤں گا کہ کسی بات نہ بھولے!"

"ہاں وہ تو ہے — میں سمجھا — پھر وہ آں، ایں اول بھی بات ایسے نہیں بنتی"

"اب دیکھو جی یہ باتیں مت کرو بھئے ان کی — تمہاری بنتا ایسی بنائی ہے کہ بس بینک

[illegible] ہو گئی؟ اور بات کس لیں دو ہی سودہ جو تم پہلے دن دے گئے تھے پہنچے ہیں اور ابھی دوسو ہم نے اپنی حکمت [illegible] بڑی رانی جی سے چھپائے ہیں۔ اس میں تو ہم نے ساکھ کوئی۔ اچھا انہیں انہوں نے خوشی سے دیئے ہم نے لیے آپ [illegible] جب ہماری رقم پوری کرنے کا وقت آیا تو تم کہتے ہو کہ بات ایسے نہیں تھی۔ میں پوچھتا ہوں چار دوہ [illegible] اور پوچھا کر بولے لو دوسرے بھی لوٹا آگیا۔ پانسو تم نے دینے کہے تھے دوسو تمہارے ہاتھ سے مشکل پہنچ گئے [illegible] ہاتھ دھو [illegible] ادھر جا رہا ہوں تو وہاں کے کام کاج ہاتھ سے علیحدہ ہونا چاہیئے [illegible] اپنی بات تو پوری کر دیجئے"

"یار دو تین سو اور پانسو کی بات نہیں ہے، کام اور صورت سے بنا تب بات ہے [illegible] ایسے [illegible] سو تو بیوی کے بیاہ کی [illegible] اور جیسے میں بتاؤں ویسے کام بناؤ اور تین سو اور ہزار اور پورے [illegible] کر لو۔"

بھگت جی کی آنکھیں چمک اٹھیں، کنور کے مانڈنگ کوٹ کی دوہری جیب اس سے بھی زیادہ [illegible] [illegible] تھی، بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر کر استفساریہ انداز میں بھویں چلائیں، کنور نے ادھر ادھر دیکھ [illegible] جنگل میں سناٹا اور مکمل تخلیہ تھا پھر بھی ایسی بات صاف صاف لفظوں میں تو کہی نہیں جاتی ہے چنتا من [illegible] سر کھجانے لگے۔ اور جلدی جلدی پلک مار کر رہ گئے۔

"بات میں نے پہلے بھی کان میں ڈال تھی، بلکہ سب سے پہلے ایسے ہی ہوئی تھی۔ پھر یہ پانچ سال والی [illegible] بات تو دوسرے روز ہم نے خود ہی۔ سچ سچ کرتا ہم کی تھی یاد کرو۔"

"یہ میں کب کہتا ہوں، لیکن میں نے ہاں کب کی تھی؟" چنتا من نے کہا۔

"تم ہاں کرتے کیسے۔۔۔ اس وقت تمہیں ادھر پہنچنے کا یقین کب تھا۔ بس امید ہی امید تھی کہ بلائے [illegible] بھی جاؤ گے۔"

"مگر الفت رائے یار یہ بہت ٹیڑھا کام ہے۔"

"ہاں میں تو خود کہتا ہوں کہ ذرا ٹیڑھا کام ہے، پھر؟" اور اپنی پھولی ہوئی جیب پر ہاتھ پھیر کر غور [illegible] کے ساتھ چنتا من کا جھکا ہوا چہرہ دیکھنے لگا۔ اور آہستہ سے بولا۔

"سیدھا اور ٹیڑھا بھی کام ہوتا ہے۔"

"ہاں تو پھر۔۔۔ میرے پاس تو کوئی ایسی خاص چیز نہیں ہے۔"

"چیز پہنچانا بھی میرا ذمہ رہا اور وہاں تم اسے کھلا دو اور ادھر لے آ کسی نہ کسی طرح ..... ہوں۔
اب آں سمجھے"

"بھائی میری ہمت ہاتھ ڈالنے کی پڑتی نہیں ذرا دیر میں الٹی آ پڑے گلے پڑ جائے۔ ویسے ہی ایشور کی کرپا سے بہتر اکٹھا کھاتے ہیں۔ اس کام میں پڑنے کو جی بھی نہیں چاہتا"

"بھاؤ تو بڑھاؤ مت اگر یہ بات ہے تو یہ لو اپنے پچھلے تین سو اور کام کراؤ اور تیرہ اور لے جاؤ بس تیرہ تین سولہ ہو گئے" اور دس دس کے نوٹوں کی گڈی بڑھائی۔

تین مٹھی میں دبا کر اور تیرہ تین سولہ کا عدد سن کر بھگت جی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بے خود ہو کر بولے "خیر چیز بھی میں اپنے جھولے سے نکال لوں گا۔ اب تمہاری انٹی میں تو لگی نہیں ہے ذرا ایک دن کہیں سے لانے میں لگیں گے، ادھر تین دن سے برابر وہ لوگ رستہ دیکھ رہے ہیں پھر تم چیز کسی اور سے تم کر یا مول جیسے بھی ہو گا کہیں سے لاؤ گے بات ... ہی ہوتی ہے، ایک آدمی اور بیچ میں آئے گا میں آج شام ہی سے کام شروع کر دوں گا۔ جنم اشٹمی تک آدھا سامان اُدھر تمہاری طرف بھجوا دوں گا اور آدھا وہاں کام آ جائے گا۔ ہے نا بس، ان دنوں روزانہ ملتے رہنا"

"ہوں وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر تمہارے پاس کیا چیز ہے؟"

"ایسی کہ بس دیر نہ لگے۔ اپنی گاؤں والی ہی جو سنتے ہیں کہیں کہیں چالاک چمار گھاس پر مل دیا کرتے ہیں اور ڈھور ڈنگر ٹھکانے لگ جاتے ہیں اور کھال ان کے ہاتھ آ جاتی ہے"

چونکے بھگت جی ان لڑکوں سے بھی نہیں، بجائے اس کے کہ سیدھے طریقے سے پیپل کے تلے کھڑے ہوتے ایک موٹے سے جھکے ہوئے گدے پر چپٹ گئے جو بمشکل زمین سے چھ سات فیٹ بلند رہا ہو گا۔ بیچارے لڑکے اندھیرا اٹے پیپل کے نیچے آئے اور اچھی طرح دیکھ کر اور موٹے تنے کے گرد گھوم کر واپس چلے گئے جب چند قدم بڑھ گئے تو پیچھے سے عجب سی آواز پیدا کی انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو انہیں ایسا نظر آیا کہ پیپل کے نیچے کی نم سیاہ مٹی میں سے کوئی کالی کالی چیز بتدریج ابھر رہی ہے اور بل کھا کھا کر گھوم گھوم کر اوپر آ رہی ہے۔ لڑکوں کے پلٹتے ہی وہ چپکے سے اتر کر کچھ ایسے انداز سے اکڑوں بیٹھے ہوئے آہستہ آہستہ کھڑے ہونے

قسم کی ہمہ گیری اور لہجہ میں خود اعتمادی تھی۔ ٹھکرائن نے کہا۔

"میں تو اسے آپ کو دان کر چکی یہ آپکی چیری ہے، مار دیا جلاؤ تم جانو تمہارا کام"۔

پدمنی گھٹنوں کے بل ہاتھ جوڑے کھڑی تھی اب گٹھری سی بن کر اوندھے منہ سجدہ میں پڑ گئی [illegible]

نے بڑے مشفقانہ انداز میں نہایت نرم ہاتھوں سے بیچاری لڑکی کو اٹھا کر بٹھایا جیسے اس کی اس کیفیت

سے اور بھی زیادہ متاثر ہو کر کہا۔

"بیٹی تم بھگت پر وشواش کرو، ایشور کا ہاتھ پکڑے گا بھگت ــ اور ہم دیوی دیوتا [illegible]

کنی کاٹے رہتے ہیں، اب اگر دیر بھی نہیں مانیں گے تو پھر دو دو ہاتھ کرنا پڑیں گے، مگر ہم پہلے اپنے بیٹے

کھونٹے سے ہوشیار رہو لیں اگر ایشور کی یہی اچھا ہے کہ بھگت کے دن پورے ہو جائیں تو بھگت کو اپنے

جیو کی پرواہ نہیں، چاہیں آج جان، ہاتھ سے جاتی رہے۔ تیرا بال بیکا نہ ہوگا اور اب مجھے [illegible] کنور تیرے

پتی کی حفاظت کا بھی دھیان رکھنا پڑے گا، کہیں اس بیچارے لڑکے کے اوپر نہ گھوم پڑیں تو پھر لینے

کے دینے پڑ جائیں"۔

جیسے پدمنی نے کچے پھوڑے کو دبا دیا، الفت رائے کے اوپر گھوم پڑنے کے بھیانک اندیشے پر

وہ بجلا کر جا پڑی، جہاں تک بھگت جی سے اس وقت [illegible] کا سوال تھا یہ بھی اس کی اپنی زندگی کے ساتھ

کم بلکہ کنور الفت رائے کی جان کے ساتھ اپنی زندگی وابستہ کرنے کے لئے یہ سب کھڑاگ [illegible]

اور اس نے اپنی جان چلی جانے اور الفت کے بال بیکا ہو جانے کو بھی مقابلہ پر رکھ کر تولا تو اس کو کوئی

مناسبت نہ محسوس ہوئی، جیسے دونوں چیزوں کی قیمت میں کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے، ڈر، خوف [illegible]

سب ایک ہی عنصر کے رخ ہیں، عقیدہ کی جگہ یکدم پہلے تو یک گونہ خوف نے لے لی اور پھر دم زدن میں

یکدم اس کے اندر سے عورت نے اچھل کر باہر آپڑنا چاہا مگر نہ معلوم کیوں اندر ہی اندر ایک [illegible]

رہ گئی اور جیسے اس کو اپنے اندر بے پناہ شکتی محسوس ہوئی، بھگت جی کا چھوڑا ہوا [illegible] کے اندر

توڑ پھوڑ کرنے کے رگ رگ میں طاقت سی بنکر لہرا گیا، ٹکرانے اور [illegible] کا جذبہ [illegible]

پتی کے معاملے میں وہ پہلے ہی سے بہت ذکی الحس ہو رہی تھی، دیوتا کے گھوم پڑنے کے جملے نے [illegible]

نے ایسا محسوس کیا کہ وہ آندھی اور شیر شکر سے جا ٹکرائے گی دیوی کی تو کیا حقیقت ہے میں اس کی بال

ہی توڑ لیں گے مگر چند ہی ثانیہ کے اندر اس کے اندر عورت رہی اور پھر کچھ خوف اور خوشامد کا جذبہ [illegible]

ہوا— اور یہ کیفیت اِک ذرا دیر رہی تھی کہ عورت، بیوی اور عقیدہ و خوف ٹوٹ پھوٹ ہو گئے اور آہستہ سے
بغاوت سے اثر کردہ اپنا حق طلب کرنے پر آ گئی۔ اور اس کو اس وقت اپنی آپا تمکنت یاد آئی اور چڑھی چڑھی
تیوری اور ترچھے ترچھے ہونٹوں سے نکلتے ہوئے اس کے کل کے کل الفاظ گونج گئے۔ اللہ ان دیوجی کے متعلق
...کیسی بے باک ؟ آپا تمکنت! اور جیسے اس کے دل سے دیوجی کا خوف کچھ کم ہوا اور پھر عورت اور بیوی
کا دوسرا پہلو شعور کی گہرائیوں سے اچھل کر اک ذرا جھلک دکھاتا ہوا پھر اتر گیا، باجی سلطنت بڑبڑاتیں
تھیں کچھ وہ بھی کچھ نہ سمجھی نہیں اس نے باجی کی بات سمجھ کر نہ سمجھنا چاہی تھی اور باجی تو خواہ مخواہ بدگمانی تک جا
پہنچیں تھیں - اور چند ساعت خاموش رہنے کے بعد اس کے اندر سے نکھر کر جو جذبہ سامنے آیا وہ عجیب سا تھا
خطرہ، مکر اک، خوشامد و منت سماجت کر کے اِکتی کاٹ کر بھی ہٹایا جا سکتا ہے اور وہ حق و ناحق کی کشمکش
میں مبتلا ہو کر ذرا آگے بڑھنا چاہتی تھی کہ خیر دیوجی اور پھر سامنے بیٹھے چھ فٹ لمبے سوا ایمن فٹ چوڑے
بھگت جی کا پاسِ ادب مانع آیا۔ اس کی آواز بالکل سنبھل گئی تھی لہجہ میں مطلق رقت نہ رہی تھی۔ دیوجی
نے اپنی دانست میں بڑی دکھتی نس پکڑنی چاہی تھی مگر کچھ زیادہ دبا گئے تھے اور بھگت جی اس کی آواز
کے تراتے پر چونک پڑے اس نے اپنے سوال کی نوعیت اور جرأت پر بغیر کبھی اجازت طلب کئے اور
بالکل معافی کے الفاظ زبان پر لائے بھگت جی سے کہا۔

"آپ نے ان دیوجی کو دیکھا ہے جنھوں نے ہمارے لئے یہ حکم لگایا ہے؟" اس کا لہجہ جملہ ختم
کرتے وقت بھگت جی کو مائل بہ طنز محسوس ہوا۔

بھگت جی کو صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے اک ذرا لمحۂ فکر پیدا ہوا جسے انہوں نے بار بار
کھنکار کر پُر کیا اور بڑی گہری نگاہ ڈال کر بولے۔

"ہاں دیکھا ہے"۔

"یہ کبھی جب یہ ہماری جھٹانی پر آتے تھے یا پہلے بھی کہیں اور"۔

"نہیں اس سے پہلے ہی کئی روپ میں، اور میں تو ان کے ساتھ کا ہوں، یہ امر ہو گئے اور میں
چولے بدلتا، رام بھگتی، کرشن بھگتی کرتا آج تمہارے سامنے منش کر روپ میں ہوں"۔

"تو آپ نے ان کے بول ہماری جھٹانی کے ہی منہ سے سنے یا کہیں اور بھی مول آن ملی بات ہوئی"۔

"ہوں میں نے تو ان سے نہ معلوم کب کب اور کس کس جگہ میں مول آن ملی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر

کیا کیا بات کی ہے، اس کا پوچھنا کیا، ہاں تمہارے سسرالیوں نے اور سسرالیوں کے علاوہ ساری بستی اور آس پاس کی سبھی عورتوں اور مردوں نے ان کے درشن کیے۔ ڈر کے مارے بڑوں بڑے کے چھکے پانی ہو گئے، تھے جس وقت ہی نے درشن کراتے تھے کئی عورتیں بیچاریاں تو بیہوش ہو گئی تھیں اور تمہارے پتی جیٹھ، سسر سب کے سب بھاگ کھڑے ہوتے تھے ان کے درشن کوئی ہنسی کھیل تھوڑی ہی ہیں، تمہاری جٹھانی کے چولے پر چڑھ کر اک ذرا سی جھلک دکھائی تھی"۔

پدمنی نے دیر جی کے متعلق کچھ اور سوال کرنا چاہا، مگر بھگت نے روک دیا، مگر وہ نہ مانی اور بولی۔

"بھگت جی ایک بات اور بتا دیجئے بس ایک بات"۔

"نہیں بیٹی اب کچھ نہیں، کیا تو بھی اپنی جٹھانی کی طرح دیر جی کی شان میں گستاخی کر کے ان کو اپنے سر لینا چاہتی ہے"۔ بھگت جی نے فیصلہ کن الفاظ میں گفتگو بند کر دی۔ اور اس کے اندر والی عورت اور بیری دونوں بولیں۔

"آپا تمکنت تو الٹی جوتی سے ناک کاٹنے کی بات لے کر گئی ہیں ان کے تو سر دکھنے کی بھی خبر نہ آئی اور نہ آتے پھر جٹھانی کے چولے پر چڑھ کر درشن دینے اور اسی کے بولوں میں آواز سننے پر باجی سلطنت کی بات اک ذرا اچھلی اور اس نے اس چلتی آپا تمکنت کی بات پر لعنت اور باجی تمکنت کے خیال پر ملامت کرتے ہوئے دھیمی پڑ کر جیسے کچھ بناوٹ کے انداز میں لجاتے ہوئے وہی بندھا ٹکا جملہ کہا" تو بھگت جی اب آپ ہی کہئے یہ مدت کم ہو سکتی ہے اور یہ بلا ٹل سکتی ہے"۔

انہوں نے بڑی چابکدستی کے ساتھ اس کو تسلی دیتے ہوئے خاموش کیا اور ماں کی جانب متوجہ ہوئے اور سرگوشیوں میں بات کی جو پدمنی کے کان میں بھی پڑتی رہی۔

"بہن جی یہ نادان بچی ہے اور یہ باتیں کیا جانے، تم اس کو سمجھائے رہو کہ ان باتوں کے متعلق نہ سوچے اور دیروں دیوتاؤں اور بھگتوں کے بھید نہ پوچھے، ذرا دیر میں کہیں وہ ایسے آ کر نہ دبا لیں، اور جو بلا اس کی جٹھانی سے آم راہ کے ڈال ملی ہے وہ کہیں تمہارے گھر پر نہ پڑ جائے ابھی بیچارہ ماں بیٹے لوٹ کر بھی نہیں آئے ہیں بیا گئے بھاگتے پھیپھڑے پھول گئے دونوں بڑھیا بڈھے ماں بیٹے کے۔ اب تم مجھ سے بات کرو بھگت بچوں سے بات نہیں کیا کرتے"۔ میں نے اب دیا جلا کر سب پوچھ لیا، خوشبو پھیل گئی، سمجھیں، ہون کو کہتے ہیں دشنو جی"۔

اور رحم، محبت، خوشی کے مظہر وشنو جی کا پیارا پیارا نام سنکر بڑی بی کی باچھیں کھل اٹھیں اور دل
امید و عقیدت کے جذبات سے لبریز ہو گیا اور کشت امید آنکھوں کے سامنے اک آن کی آن میں لہلہا کر
پھلتی پھولتی نظر آنے لگی۔

"ہے رام تیری لیلا!" وشنو جی کا مقدس نام سنتے ہی ٹھکرائن کے منہ سے بے اختیار نکلا جیسے اگر
بھگت جی چاہیں تو اپنی نذر کے لئے وہ اپنا ہر دہ چیر کر رکھدیں اور بھگت جی نے ہون کی اجناس کی بزبان
تفصیل بولنا شروع کر دی۔ جس میں کودوں ساٹھی جوار اور باجرے سے لے کر مشک عنبر زعفران تک دنیا
کی کوئی چیز باقی نہ رہی تھی۔ اب ان کے وزن کا حساب کتاب یوں بتایا کہ

"جتنا زور دار ہون ہوگا اتنا ہی جلدی وشنو جی توجہ کریں گے"۔ اور پھر کہا کہ۔

"میں تو چرنوں میں جاکر کھمبی بھر یوں گا۔ اور ان کے ہاتھ کا بنایا ہوا پرشاد لے کر لوٹوں گا۔ اور وہ پرشاد
ادھر ہماری بٹیا کھائے گی اور ادھر آپ اپنے ہی خاص انتظام سے داماد کے لئے بھیج دیں۔ دیوی جی تو کیا
وشنو جی کے سامنے سے تو شیو شنکر جی بھی سنکر کنی کاٹ جاتے ہیں، اندر مہاراج انہیں کے اشاروں پر سنسار
چلاتے ہیں، شیو شنکر جی کو تو کبھی کبھی جب کام نہیں چلتا اور آنکھ بگاڑتے ہیں تو خود ہی اشارہ کر دیتے ہیں کہ
"متّا دو"۔ اور پھر وشنو جی کو بلانا پڑتا ہے"۔

کام ہونے اور بات بننے میں جلدی کرانا تھی، خاص وشنو جی کے ہاتھ کے پرشاد کا تصور۔ کتنا مقدس
کتنا شاداب، کس قدر دائمی جیسے امرت مل جانے جیسا تھا۔ بس جلد از جلد آسمان سے اتری ہوئی یہ
نعمت مل جانی چاہیئے۔ بڑے بڑے ہون کے انتظام کی مرضی ظاہر کر دی۔ جس کی مقدار سب بھگت جی کی رائے
پر رہی اور انہیں کو دوں۔ ساٹھی جوار باجرے سے لے کر مشک عنبر زعفران تک بھاؤ ہر چیز کا حفظ تھا، آئے
دن کرتے ہی رہتے تھے۔ میزان جاکر کہیں دو ہزار روپے پر لگا۔ اتنی رقم سردست تو ہاتھ میں نہ تھی ٹھکرائن
کے کرچھ کے ملے زیر زمین دفن تھے جن میں دلیم سے لے کر جارج پنجم تک کی نسلوں کی سب اشرفیاں اور
روپیہ بھرے تھے رات بھر کی مہلت مانگی جس پر بھگت جی بخوشی تیار ہو گئے اور چلنے لگے تو ٹھکرائن نے
نہایت ہی عقیدت بھرے انداز میں خوش ہو کر کہا۔

"آپ؟ آپ نے اپنے لئے تو کچھ بتایا ہی نہیں"۔

"رانی جی یہ کنیا دان ہے میں اپنے لئے کیا بتاؤں"۔

"وہ تو ہے پر ہم تو سیوک ہیں - اور ویسے تو بھی میری بیٹی ویسی آپ کی - آپ اسے کلیش سے نجات
دلا رہے ہیں، آپ اس کے باپ کے برابر ہیں"
"تو پھر ٹھیک ہے - باپ بیٹی سے کیا لے گا"
"نہیں بھگت جی کچھ تو ضرور --- اور مجھے معلوم ہے آپ نے کسی جگہ سے لیا، پھر مجھ کو کیوں پن
سے محروم کرتے ہیں"
"وہ لیا ہے گا تو انہیں کے لئے ہوگا، بھلا رانی بھگت کیا کرے گا چاندی کے ٹھیکروں کا - گیان
دھیان ہی سے پیٹ بھرا رہتا ہے - اندر مہاراج اور وشنو جی کے درشنوں کا ہی نشہ نہیں اترتا" اور
یہ کہتے ہوئے وہ ایک قلندرانہ شان سے چل پڑے - مگر ٹھکرائن نے جوش عقیدت اور بیٹی کے ساتھ ہمدردی
اور مدد کے جذبہ سے متاثر ہو کر دونوں پاؤں جکڑ کر پکڑ لئے اور سامنے سجدہ میں گر پڑی -
"نہیں نہیں نہیں بھگت جی ایسا نہیں ہو سکتا" اور وہ رونے لگی -
تو پھر رانی پانسو اور بھیجت بجے کستوری عنبر، کیسر، اگر کا وزن ہون میں بڑھا دوں گا بس وشنو جی
مہک اٹھیں گے، بات اور بھی جلدی بن جائے گی ویسے جنم اشٹمی سے پہلے پہلے ہی پرشاد پہنچانے کی کوشش
کروں گا تم تک --- اندر تو دالانوں صحنچیوں میں دیوار گیریوں پر لالٹینیں ٹمٹما رہی تھیں، صحن کی لالٹین بھی
روشن تھی - بھگت جی جس چور دروازے سے آئے تھے اسی سے باہر جانے لگے جو مویشی خانہ کے ایک گوشہ
میں غلہ کے ایک تاریک و بند گودام میں کھلتا تھا --- گودام لق و دق مویشی خانہ کے میدان سے ملا
ہوا تھا جس کے گرد چاروں طرف سائیس، اصطبل، اور چارہ دانہ بھوسہ کے گودام اور گوالوں ساتھیوں کی
کوٹھریاں تھیں اور ایک جانب کو بڑا اونچا پھاٹک تھا اتنا اونچا کہ ہاتھی مع ہودج کے سواریاں لے کر گذر سکے
--- مویشی خانہ کے میدان ہی میں بڑی مہیب تاریکی تھی --- اور ٹھکرائن تو پیچھے پیچھے پھاٹک تک گئیں اور
پھاٹک کے بھاری بلند و بالا کواڑ بند تھے لیکن حجام کا لونڈا تعینات تھا کواڑ میں کٹی ہوئی کھڑکی کھلی ہوئی تھی جس
میں سے آہستہ سے بھگت جی باہر نکل گئے، اور باہر تو بلا کی تاریکی تھی، بھادوں کے اماوس والی رات، اور
آسمان پر بادل کالے کالے لٹک رہے تھے - نیچے کالی کالی زمین، جیسے اوپر سے تاریکی نیچے کو آ رہی تھی اور نیچے
سے سیاہی اوپر کو اٹھ رہی تھی اور سیاہیوں کا تصادم ہو رہا تھا، اور اسی تاریکی میں بھگت کھڑکی سے باہر نکل

یں ایک متداخل کوٹھری کا کرتا لمکھود کر برآمد کی اور مرغ کی پہلی اذان پر چھوٹے بیٹے کو بیدار کر کے تھیلی حوالے کردی اور رات ہی یں سمجھا دیا تھا کہ صبح تڑکے چپکے سے گھوڑی پر سوار ہو کر میرٹھ جانا ہے؟ اور گھر یں کوئی سوکر نہ اٹھنے پائے واپس آجانا ہے۔

وہ صبح کے ناشتہ کے بعد جب وہ دوپہر کے کھانے پر جمع ہوئے تو چترا کچھ چپکی چپکی سی تھی اور اس کے چہرے پر گہرے غور و فکر کے آثار جھلک رہے تھے صبح کے ناشتے والے رنگ سے بالکل برعکس، حالانکہ اس وقت بات بڑے ہی اچھے موڈ اور نہایت ہی فیصلہ کن انداز یں ہوئی تھی اور سات بھر سوچ سمجھ کر پورے منصوبے کے بعد اس نے ہم پر جانے کی اجازت دی تھی معاوہ یہ سمجھا کہ ان لوگوں کی واپسی اسی ہفتے کے اور تو ہونے والی ہے۔ اور وہ تو خیر عورت ذات تھی یہ خود مرد ہو کر خیال کر کے آزردہ ہو جاتا تھا، ایسی بے داغ خلوتیں اور لامتناہی عیش کی اچھلتی پھڑکتی زندہ ساعتیں میاں بی بی کو ماہ عسل کے دور یں بھی مشکل ہی سے میسر آیا کرتی ہیں۔ فکر دنیا، غم جاناں ہر چیز سے آزاد و بے نیاز، لق و دق مسکن کے اندر دن رات برابر، یکساں طور پر عید و شب برات منائی جاتی رہی تھی۔ حتیٰ کہ اندر یا باہر ایک مہمان بھی نہ پھٹکا تھا۔ صبح دوپہر اور شام صرف تین مرتبہ بڑے راجہ جی کا کھانا لینے کے لئے اک ذرا کی ذرا چھوکرے کی جھلک نظر آیا کرتی اور یہ ایسے اوقات تھے کہ چترا دیوی رسوئی ہی یں تھال سجائے ملتی ادھر آیا ادھر تھال ہاتھ یں تھما دیا اور کھڑے ہی کھڑے چلتا کردیا۔ سوتا پڑے کا دودھ بھی کھانے کے تھال یں رکھ کر بالکل فارغ کر دیا کرتی اور چلتے چلتے چلم ٹھنڈی نہ ہونے کی تاکید کا مزید تازیانہ جڑ کر کلیتاً اس کو کنور جی کی چارپائی سے باندھ دیا کرتی، چلتے وقت رانی جی راجہ جی کو بتا گئی تھیں کہ جب تک ہم تیرتھ پر رہیں تو جس جس تیرتھ کے جتنے جتنے دنوں قیام کی اطلاع دیں اس دوران یں وہ انہیں دیوتا کے نام کی مالا جپتے رہیں لہٰذا بوڑھے راجہ جی ہر وقت اسی تیرتھ اور دیوتا پر توجہ رکھ کر مالا جپتے رہے اور بجز حوائج ضروری کے اور کسی وقت چارپائی سے نہ اُٹھتے تھے۔ رہی برتن سالنے والی بڑھیا اس کے ساتھ صبح دوپہر کھانے کی خاص تیاری کے وقت چترا خود رسوئی یں رہا کرتی اور پھر اسے رکھ دی جاتی تھی لہٰذا دن چھپتے چھپتے وہ کام نبٹا کر کسی گوشہ یں نپٹ اندھی ہو کر جا پڑا کرتی۔ دوپہر کا کھانا گیارہ بجے بجے تیار ہو جاتا اور بڑھیا بھی دوپہری یں پھر اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتی۔ اور بڑھیا کو تو رات ہی کو رکھ دی

آتی تھی، یہ دونوں دن دہاڑے کھلی آنکھوں اندھے ہو رہے تھے، مگر جوں جوں واپسی کا وقت قریب آ گیا چترا دیوی کی آنکھیں بوناً فیوماً کھلتی گئیں ویسے نیم واکنور جی کی بھی ہو رہی تھیں لیکن انہیں نہ تو نشیب و فراز دکھائی پڑتے تھے اور نہ کوئی زاویہ ہی نظر آتا تھا بس حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد کی تاریکی کے سوا اور کچھ نہ دکھائی دیتا تھا جس میں آج کی بنائی ہوئی بھگت جی کی اسکیم کی کامیابی کے انحصار پر دور سے اس آگ کی مری مری سی کرن نظر آئی تھی جس کی تیز و تند تابناکیوں سے پانچ ماہ بلکہ فقط انہوں نے دن رات پریم کے رنگ برنگے دیئے جلائے تھے۔ جب خود اس کا اپنا دل شبِ وصل کی بھیانک سحر کے تصور سے لرز لرز جاتا تھا تو وہ چترا کی اس گھبراہٹ کا سبب پوچھ کر اس کے زخم کو کیوں کریدتا اور سر پر جو بری گھڑی ڈاک گاڑی کی رفتار سے بڑھ رہی تھی اس کا خود اپنے منہ تذکرہ کر کے ان باقی ماندہ گھڑیوں کو کیوں پراگندہ کرتا۔

نہ معلوم کتنے عرصہ بعد آج طویل دوپہران دونوں نے برابر برابر پڑی ہوئی الگ الگ چارپائیوں پر گذاری۔ وہ تو سو گیا لیکن چترا پلو سے منہ ڈھانکے گہری سوچ میں پڑی رہی۔ دن ڈھلے جب اس کی آنکھ کھلی تو سینے کے اندر سے اک ہوک سی اٹھی، وہ عنقریب بدل جانے والے حالات کے تحت یہ پیارا پیارا فردوسیں ماحول بدل جانے کے تصور سے تھرا اٹھا۔ اب کہاں ہم اور کہاں یہ گھڑیاں — نہ معلوم کب تک وہی پہلے والی بھیڑیئے بکری کی چوری جیسی وارداتیں چلیں۔ ایک ایک ثانیہ زریں ہے۔ نیند جیسے فضول عمل ۔۔۔ رب کر اس کو ضائع کرنا کس قدر بد نصیبی ہے وہ اپنی مجرمانہ غفلت جیسی نیند پر متاسف و منفعل سا ہو گیا اور اچھل کر چترا کے پہلو میں جا لیٹا اس کے منہ سے پلو ہٹایا تو نہ جاگ رہی تھی۔ یہ قدرے متعجب ہوا۔ وہ اس درجہ متاثر تھی کہ اس کا خیر مقدم بھی نہ کر سکی۔ ایک ہلکی ہلکی مریل مری سی مسکراہٹ مائل بہ خشکی سرخ ہونٹوں پر نکر بکھر گئی۔ اس کے تیوروں میں رنج، لحر دی اور کچھ خوف جیسے ملے جلے آثار نمایاں تھے جوش کے ساتھ ہونٹ سے ہونٹ ملا کر الفت نے جیسے اس کے غم کو چوس لینا چاہا۔ مگر اس نے اندازہ کیا کہ اس پر اثرات نہایت گہرے اور کارگر ہیں اور اس کا یہ بے پناہ وار بھی تقریباً خالی سا گیا اور خیر مقدم اور ترکی بہ ترکی جواب دینا تو درکنار ایک گونہ بیزاری جیسے طور کا احساس ہوا خوب اچھی طرح ہلا جلا کر اور نہ ہی بات سمجھ کر جو اس کے اپنے اندر گھوم رہی تھی اس کو یقین ہو گیا کہ اس پر آنے والے دور اور جانے والی گھڑیوں کے اثرات نہایت گہرے اور کارگر ہیں تو ایک دو منٹ وہ خاموش پڑا رہا اور پھر "ہول کا ما" نکال کر آہستہ سے اٹھا۔ الماری سے ایک وسکی کی شیشی نکال کر لایا۔ پانی ملا کر ایک اچھا ڈبیڑھ جام بنا

پہلے ایک جرعہ نس کر خود لگایا۔ باقی ماندہ ایک تہائی گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پینے کو تو وہ یہ بھی
پی گئی چون و چرا پی گئی کیونکہ اس کی پلائی ہوئی نہ معلوم وہ کیا کیا پئے پڑی تھی — اور آن کی آن میں دہکی رگ
رگ اور رگ و پے میں لہرا کر لال لال ڈوروں میں جھلک اٹھی اور غزالی انکھڑیوں میں چھلکنے لگی۔ ہونٹوں کی مرجھائی
ہوئی گلابی پنکھڑیاں جن کی آبیاری میں ابھی ابھی چند ساعت قبل الفت کے ہونٹ ناکام رہے تھے کھلنے اور
مہکنے لگے۔ مگر شراب کے نشہ میں بڑا خلوص ہے کہتے ہیں کہ شرابی کی زبان سے کبھی جھوٹ نہیں بولا جاتا —
اور جو شدید جذبات اُسے زیر و زبر کئے ہوئے تھے وہ اس کی زبان پر نہایت کھل کر آ گئے اور چڑھی ہوئی
تھی وہ اور بھی زیادہ چڑھ گئی اور نشہ کی دیوانگی بلا کی وارفتگی کا روپ دھار کر سامنے آئی - ویسے تو ان
پانچ ماہ میں یہ جرعے اور چسکیاں شب ماہتاب و روز ابر سے بڑھ کر تقریباً روزانہ برسات کی پروائی مضراب
پھواروں اور بوندوں کا جل ترنگ بجاتی ترغیب انگیز کالی کالی عصیاں پوش راتوں کا معمول ہو گیا
تھا' اور ان کی گرم گرم خلوت میں سرتاپا ٹسے یہ جرعے اور چسکیاں بڑی شادابی و لمحی پیدا کر دیا کرتے'
تھے۔ اور من و تو مدعی و مدعا علیہ' فاعل و مفعول کی تمیز مٹ کر بس پیہم جرعوں ہی جرعوں اور مسلسل چسکیوں
ہی چسکیوں میں صبح نکل آتی تھی' مگر آج تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی اٹھارہ سالہ پرانی شراب کی بوتل
اپنی شگفتگی اور کیف کھو چکی ہے اور معکوس تندی دکھا رہی ہے — جام چڑھانے کے بعد وہ الفت کا خیر مقدم
کرنے سے تقریباً قاصر رہی' اور مٹی کا تودہ سی بنی پڑی رہی — اور ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی - تاہم جتنی حد
امکان میں تھی الفت نے بجائی' لیکن تا بکے اس کے منہ کا ذائقہ کچھ ایسا ہو گیا جیسے کباب چینی ملی ہوئی
گلاب جامنیں غپک رہا ہے - یا جیسے بچپن میں شوخی سے کسی سیدھی سادی گھوڑی پر دم کی جانب منہ کر کے
اس کو چلانے کی دوڑانے کی کوشش میں اس کا آسن اور ہاتھ پاؤں محسوس کیا کرتے تھے — مگر اُس نے
اپنی بدمزگی کو دبا کر ہر پہلو سے عملی کوشش کی یہ بچی کھچی چند اڑتی ہوئی گھڑیاں اور کیف و نشاط میں کاٹ لے
الفت میں قبل از مرگ واویلا' خواہ مخواہ کیوں ابھی سے تکدر میں جا پڑیں — اور وہ سپاہی بھی جس کو علی الصبح
گولا گولیوں کی بوچھار کا سامنا کرنا ہوتا ہے رات میں اپنی ریکائی کو پہلو میں لے کر بھرپور لطف میں ڈوب
جاتا ہے اور ماضی و مستقبل سے بے نیاز ہو کر صرف حال ہی حال کو پیش نظر رکھتا ہے۔

تاہم اس نے خیال کیا کہ چترا لڑکی ہے' اور درحقیقت ان دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی
کے رنگین ترین لمحات گذارے ہیں اور اس میں اب خلل واقع ہو رہا ہے آزردگی فطری امر ہے اور جب اُس

نے خود اپنے دل کو ٹٹولا تو جیسے سینہ پر دو دھاری تلوار سی پڑی، مگر یہ عورت و مرد کی توفیق کا فرق ہے کہ وہ یہاں روح کے ساتھ برداشت کئے پڑا تھا اور آنے والے دور کو اپنے راستہ سے تنکے کی طرح اٹھا کر پھینک دینے پر سرگرم عمل تھا۔ اور صنف غالب کی حیثیت سے اس نے چترا کے دل کو تھامنے کی کوشش کی اور چند کلمات تسلی کے نکالتے ہوئے مستقبل کے سبز باغ کی جانب اشارہ کیا تو وہ چونک سا پڑا۔ چترا تو حضرت ناصح کی ناصح بن گئی۔ صبح تو ناشتہ کے بعد بغیر پیے ہی اس اسکیم پر وہ آگرے سے لے کر چلے تھے بڑے جوش کے ساتھ رضامندی درست کرانے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے الفت کے راستے نگ کوٹ کی جیبوں میں روپیہ بھر کر چھوڑا تھا۔ اور یہ پانچ سال والا جامعہ معترضہ جو گھر کی چار دیواری کے اندر پہنچنے کے بعد نہ معلوم کیوں شاید اپنے بوڑھے نہال رائے کی صورت دیکھ کر چترا کے اپنے ذہن کی پیداوار اور منصوبہ کی ترمیم تھا جس کو آج صبح اس نے خود ہی رد کر دیا تھا۔ اور اس وقت دیکھی کہا پیک کا ہے کو عقل، مصلحت، دور اندیشی، دانشمندی اور شاید وفاداری اور نیک نیتی کی کاک ٹیل چڑھا کر بات کر رہی تھی۔ کنور حیران رہ گیا چترا کے اندر والی محبوبہ جو ہمیشہ سے بے پیئے ہی متوالی رہا کرتی تھی آج پینے کے بعد عورت بن کر بول رہی تھی اور کسی کسی وقت بوسے برسنے والی روح کی سطح کو چھو چھو آتی تھی۔ "بھلا دیکھو تو آدمی ہے کہ گرگٹ! ۔ تھالی کے بینگن کی طرح لڑھکتی ہے!! ۔ وہاں کچھ یہاں کچھ صبح کچھ دوپہر کچھ! شام کچھ!!" ۔ الفت سے رہا تھا۔ تمام رات انہیں بحث و مباحثہ میں کٹ گئی اور صبح تک وہ بہت الٹی سیدھی باتوں سے نام کے گھر اس بھیانک اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کرتی رہی پھر اپنی بات کی تائید میں مضبوط دلائل دیتے مصلحت اور دور اندیشی کے مختلف پہلو دکھلائے حتیٰ کہ قانونی گرفت میں آجانے کا خوف دلایا، مگر پھر یہ بات تو معمولی ہے لابد کہ کنبہ برادری اور بستی میں کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہا کرتی ۔ انکشاف کے بعد کی رسوائی اور کئی پشتہا پشت کے لئے سارے خاندان کو قعر مذلت میں پڑ جانے کے بھیانک اندیشوں سے دوچار کیا۔ مگر پر جو وہ آگرے کے واپسی کے سفر میں چڑھی ہوئی آئی تھی یا یوں کہیئے کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے اوپر چڑھا کر لائے تھے وہ الفت کے اوپر سے نہ اترنا تھی نہ اتری ۔ جب مصلحتوں اور قوتوں کے ہتھیار کام پائے تو چترا نے رقیہ رہی کے ساتھ سانپ بھی مرے لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کے کئی امکانات اس کے ذہن میں لانے کی کوشش کی ۔ مگر وہ تو آج ہی مرغی کے سب انڈے پیٹ چیر کر نکالنے پر تلا ہوا تھا ۔ الفت معاملہ میں ڈھیٹ ہو کر شاید وہ اس سطح پر پہنچ چکا تھا کہ نہال رائے اور چترا دیوی کی اس جھوٹ موٹ کی

بچوں جیسی دولہا دولہن والے کھیل کو بھی برداشت نہ کر سکتا تھا اور سانگی مردہ خلوت کے تصور سے بھی اس
کے اندر شعلے سے بھڑک اٹھتے تھے اور جب وہ اس ضمن میں سوچتا تو "سانپ مر جائے چاہے لاٹھی ہی
ٹوٹ جائے" کہ مقام پہ جا کھڑا ہوتا ۔۔۔ پترا دیوی نے ہر زاویہ سے اپنے چار دل شانہ پٹ پچھڑا ہوا
پاکر و بسری بیٹھک لگالی اور "جب سارا جاتے دیکھئے تو آدھا دیجئے بانٹ" کے اصول پر گامزن ہوتے
ہوئے نہایت شاطرانہ انداز میں کشت بچاتے ہوئے خود کو ڈوب میں لگا دیا اور جبر کی سل سینہ پر دھر کر
یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنا گونا (رخصتی) کرا لائے اور ہمارا سلسلہ بدستور چلتا رہے ۔۔۔ مگر وہ تو اب بجز پترا کے
کسی اور کے تخیل سے ہی بھڑک اٹھتا تھا۔ پدمنی غریب ۔ کے لئے اس کے پاس گنجائش ہی کہاں تھی اور پانچ
ماہ تسلسل کے ساتھ جو رنگین خواب دیکھا تھا اس کی دائمی اور ابدی تعبیر سامنے لانے کے لئے اندھا ہو رہا تھا

بحث میں شام سے صبح ہوئی اور صبح سے شام اور پھر لوٹ پھر جوں جوں حضرت ناصح کی نشتیں بڑھیں
اور تیز ہوئیں دیوانہ کی دیوانگی بڑھی اور تلخی تیز تر ہوئی ۔۔۔ پترا کے تمام دلائل اور مستقبل کے منصوبے
الفت کے چند لفظوں کے آگے ہیچ تھے نہ رہے بانس نہ بجے بانسری ۔۔۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے
جب وہ اس کا اور وہ اسکی ہو چکی ہے تو سانس لیتے کلنکے اور زندہ بابت کاہے کے لئے باقی رکھے جائیں ۔۔۔
یہاں تک کہ منطق کے ہر پہلو سے الفت نے اُسے زچ کر کے رکھ دیا تو وہ بھی ہر پہلو سے قائل ہو
گئی کہ اٹل ہے جو حتمی طور پر وہ دونوں ریل کے ڈبہ سے طے کر کے اتر رہے تھے اور پوری رات غور کر کے
صبح کو جس پر ناشتہ کے بعد اس روز تیار ہو گیا اسکو تیار کر کے بھگت جی کے پاس نوٹوں سے جیبیں
بھر کر بھیجا تھا ۔۔۔ یہاں تک کہ ہر پہلو سے خوب ٹھونک بجا کر اور ماں اور بھائی کی واپسی کی تاریخ
کا حساب لگا کر وہ بھگت جی سے ان دونوں نذیں امور کی انجام دہی کے لئے جنم اشٹمی کے دن کی
مبارک ترین ساعت بھی طے کر آیا تھا۔

آج جیسے اپنی موت کو خود لینے جانے کی صبر آزما خدمت بھی اسی بدنصیب کو انجام دینی پڑی
تھی ایک گھوڑی پر خود لدا ہوا دوسری کوتل سائیس کے ہاتھ میں ننہال روانہ کرنے کے لئے پیچھے پیچھے ماں کی
سواری کے لئے یہ لے کر الفت جس قدر جوش و خروش کے ساتھ الوداع کرنے گیا تھا اتنی ہی آزردگی سے
استقبال کرنے پہنچا جیسے پانچوں ماہ کے مسلسل نشہ کا خمار اس وقت یکدم سر پر پھٹ پڑا ۔۔۔ آسمان
پر برسات کی شفق پھیلی ہوئی تھی، مشرق سے مہیب سیاہی کا طوفان امڈ رہا تھا، مغرب سے توہیں

سرخی بڑھ رہی تھی، ماحول پر سیاہی و سرخی کے اجتماع ضدین نے بڑی عجیب سی اداس اداس کیفیت طاری کر رکھی تھی، در و دیوار دیکھ کر رو پڑنے کو جی چاہتا تھا۔ گھر کے اندر غیر معمولی مصروفیات کے باوجود چترا کے سینے سے ہوکیں سی اٹھ رہی تھیں۔ تمام دن چپکے چپکے روتی رہی تھی اور وہ اس وقت تو اندر ہی اندر دہاڑیں سی اٹھ رہی تھیں بڑے بیٹے کو تو باہر والے مکان ہی میں باپ نے روک لیا بڑے بیٹے سے اتنے لمبے عرصہ کے لئے کبھی جدا نہ ہوئے تھے پھر عمر کے اعتبار سے کچھ غیر متوازن ہی تھے لہذا آج اور اسی وقت اس کے منہ سے پورا سفرنامہ سن لینا چاہتے تھے اور پھر اس کے پیچھے کی یہاں کی سب سے ضروری سے ضروری بات تک بتا دینا چاہتے تھے۔ اندر حویلی میں چھوٹے بیٹے کو رانی جی کلیجہ سے لگائے بیٹھی تھیں۔ بڑی تجربہ کار اور جیسے کہتے ہیں کینڈے کی بی بی تھیں، بوڑھی ضرور تھیں لیکن نوجوانوں کے جذبات کی بڑی محرم، وہ اس تلوار کی دھار کو خوب پہچانتی تھیں جو ان کے پندار میں ان کے نوجوان بیٹے کی چھاتی پر پڑی تھی اور اس کو خاندان، گھر، سماج، دیر جی، بھگت جی، بھائی بھاوج ہر ایک کے سامنے اطاعت کے ساتھ سر جھکا دینے پر دل ہی دل میں دھن باد کہہ رہی تھیں اور ایسے بہادر اور اطاعت شعار بیٹے کو دل ہی دل میں مہاراجہ رام چندر والا مقام دے کر سفر پر بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی کا مقام سمجھاتی رہی تھیں اور بحقیقت نہال رائے تیرتھوں سے دل کے اندر الفت رائے کا مقام سگے پوت والا لے کر پلٹا تھا، سفر کے دوران جس جس تیرتھ پر گیا اس کے دماغ اور دل سے یہ بات کسی وقت بھی جدا نہ ہوئی کہ چھوٹے بھائی نے کتنی بڑی قربانی دی ہے کہ جوانی غارت ہو گئی۔ اس کی بیوی کی اک ذرا سی غلطی کے ہاتھوں جس پر دیر جی ناراض ہوئے۔

"تو اتنا دبلا کیوں ہے؟" شاید بہت دنوں بعد دیکھ کر ماں کا مخصوص سوال تھا جو رانی جی نے آغوش میں لے کر ایک ہاتھ سے بیٹے کے بالوں میں گہری انگلیاں ڈالتے ہوئے اور دوسرا بدن پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"نہیں ماتا جی! دبلا! دبلا تو نہیں ہوں۔"

"کیا کہنے ہیں دبلا نہیں ہے، کیا میں تجھے ایسا ہی چھوڑ گئی تھی؟ تیرا جی کیسا ہے۔ ادں ہوں" (دونوں ہاتھوں سے جگہ جگہ بدن ٹٹولتے ہوئے) "آدھا نہیں رہا۔"

کبھی کبھی وہی چکر گھنی ہو جایا کرتی ہے!" اس کی آواز اور لہجہ خاص ماں کے جذبات کی بازگشت تھا

اور نوجوانی کے اسباب اور علاج کو بھی ماں ازواجی زندگی اور مسائل سے محرومی پر محمول کرتی تھی اور پانچ
سال تک مزید محرومی کے احساس نے مجبور ماں کے دل پر چھری سی ماری جس کے نوجوان بیٹے کی امنگیں
اور آرزوئیں یکدم وقت کے بے تصور قدرت کی بہرہ دستی نے پامال کر دی تھیں اور اس نے صبر
کی سل رکھ کر پیشانی پر ادنیٰ سی بھی شکن لائے بغیر بہادر ساونت اور عقلمند منشی زادہ کی طرح۔ تلخ
گھونٹ شہد کی طرح حلق سے اتار لیا تھا اور خاندان کو تباہی اور ہلاکت سے نجات دلائی تھی۔ برہم چار
کے تیاگ کی بھٹی میں پھنکتے ہوئے بیٹے کو ماں نے اس طرح آغوش میں دبا لیا جیسے کبھی ایام رضاعت
میں بخار آجانے پر موسم سے بچانے کے لئے دبا لیتی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنے بیٹے کے بشرہ میں کچھ
ایسے ہی انتشار کی نشانیاں زینے سے اترتے ہی پہلی نگاہ میں بھانپ لی تھیں اور جس طرح کسی ننھی عمر
کے بچے کو جھوٹی تسلیوں اور ناممکن وعدوں سے بہلایا جاتا ہے اسی طرح ایک باطل سی تسلی اور جھوٹے
موٹے دلاسہ دیتے ہوئے بولی۔

"میں نے استھان استھان تیرتھ تیرتھ اپنے بیٹے کے گھر آباد ہونے کی پرارتھنا کی ہے" سادہ ہو کر
اپنی بات کا ہلکا پن خود ہی محسوس کرتے ہوئے اس کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ "پرارتھنا اور دعا نوشتۂ تقدیر
نہیں مٹا سکتی اور اس لعنت رات کی جوانی غارت ہونا تو مقدر ہو چکا تھا اور اس کی ماں اس چیز کو طے کر کے اور
اس کی کرموں جلی دولہن کو اطلاع کر کے گئی تھی بس بے اختیار ہو کر بلبلا دینے لگی یہ ایک مجبور کا مشغلہ تھا اور
ماں نے بیٹے دونوں ہاتھوں میں چہرہ دبا لیا اور بولی۔

"میرا پوت نہیں بہت دبلا ہے میرا بچہ! دیکھو تو کیا تجھے کھانے میں تکلیف رہی ہے"
اس نے تعجب اور طنز کے انداز میں جواب دیا۔

"ہوں! کھانے پینے کی تکلیف ماتا جی! پتا جی سے پوچھیں وہ مال کھلانے میں بھابی نے اپنے ہاتھ
سے پکا پکا کر کہ پتا جی کہہ رہے تھے تمہاری ماتا جی کا زمانہ یاد آ گیا بھابی نے رسد یا کر بھی وہاں بھجوا دیا۔
سب کام خود ہی کیا!"

بہو کی تعریف سے ساس کچھ مکدر سی ہو گئی اور بات کاٹتے ہی موڑ کر چپکے سے سرگوشی میں بولی۔
"تیری بہو کے لئے ڈھیروں ساڑھیاں زربفت، پوت کی لائی ہوں کاشی جی سے" جیسے بہو بیٹے کے
نام پر ہی بڈھی ماں نے مجبور ہو کر بنارسی ساڑھیوں کا پہاڑ رکھا۔

"میں تجھے چپکے سے دکھاؤں گی بڑی بہو نہ دیکھے۔ یہ میں اپنے پاس کے پیسے سے لائی ہوں۔ اسی دیوالی اور دسہرے پہ تیری بہو کو بھیجوں گی۔ کیسی اچھی ہے میری ننھی سی بہو۔ ماتھے پہ چاند ٹھوڑی پہ تارا — بس جگمگ جگمگ ہو جائے گی بن کر۔ ایشور اس کا سہاگ بنائے رکھے"۔

"بڑی بہو اور تیری بہو" کے الفاظ ماں کے منہ سے سن کر اس کا ذہن یکدم اپنی بہو کی جانب منتقل ہو گیا اور اس کو تصور میں ایسا نظر آیا کہ اس کی بیوی میکے میں بیٹھی بھگت جی کے پرشاد سے جنم اشٹمی کا برت کھول رہی ہے اور وہ ایک نامعلوم سے خوف سے دوچار ہوا جیسے ایک دفعہ کو اس کے اندر دھکے سے ہو گیا ایک عجیب قسم کی گھبراہٹ اور عجلت جیسے انداز کے ساتھ وہ ماں کی آغوش سے غیر اختیاری طور پر چھڑکر چلا آیا مردانہ مکان کے ایک گوشے میں باپ اور بھائی تسلسل کے ساتھ مصروف گفتگو تھے، اس نے انکی بات بناوٹ تو سنی مگر لفظ ایک بھی نہیں۔ بلند چبوترے کی سیڑھیاں ایک سانس میں عجلت کے ساتھ اتر تا چلا گیا اور لپکتا ہوا گلی سے گذر کر بستی سے باہر جا کر اس راستہ کے کنارے کھڑا ہو گیا جو اس کی سسرال کے قصبہ کی سمت سے آتا تھا، جیسے کسی کا منتظر ٹہل رہا ہے بار بار منہ اٹھا کر آتے ہوئے راستہ کی جانب دیکھتا رہا۔ انتظار کرتے کرتے تقریباً سوا گھنٹہ ہوا تو دور سے کوئی آتا دکھائی دیا۔

حجام کا لڑکا اس کو دیکھ کر متعجب سا ہو گیا۔

"ہوں کنور جی، آپ اچھے تو ہیں! بٹیا جی نے یہ آپ کے لئے بھیجا ہے۔ آپ اس سے برت کھولیں" اس کے مختصر سے الفاظ تھے، بغیر حیرت اور بالکل اور اجنبیت کا انداز بدلتے ہوئے اس نے وہ سرخ پوٹلی جس میں برت کھولنے کے لئے اس کی بیوی نے پرشاد بھیجا تھا، چپ چاپ ہاتھ میں لے لی اور وہ ادھر پلٹا اور ادھر یہ پلٹ پڑے۔

چور والی چوپال سے آہستہ آہستہ گلیوں سے گذرتا جیسے ایک ایک سیڑھی گن گن کر چڑھتا ہوا بلند چوپال کے چبوترے پر پہنچا تو سناٹا ہو چکا تھا۔ اس کی ڈیڑھ سوا گھنٹہ کی غیر حاضری میں سب کام ختم ہو چکا تھا۔ قد کا ٹھا نہال وہاں باپ سے باتیں کرتے ہی کرتے بستر پر سو کر رہ گیا تھا۔ گھر کے اندر جب راہب جی ملی سے بات کرنے گئے۔ اور بعد جن کے لئے بلوایا تو معلوم ہوا سو گئے۔ بار بار تقاضہ آنے اور چونکانے پر

...یدے کر کروٹ لے کر کھانے سے انکار کر دیا۔ رانی جی نے بھی ایسا ہی کچھ الٹا سیدھا کھایا پیا۔ البتہ انہوں نے
...پار نہال رائے نے آج دوپہر بھی ریل میں کھانا نہیں کھایا ہے بس صبح ناشتہ کیا ہے اور اسی لئے بار بار
...اُن کو کھلوانا چاہا۔ راجہ جی بھی دودھ کے گلاس پر اکتفا کر کے چلے آئے اور اپنے بستر پر دراز ہو کر گہری
...ند سو گئے۔ بڑی جلد ہی آج خلاف معمول خاموشی چھا گئی۔ شاید لمبے سفر کے مارے ہوئے نہال رائے اور
...ی رانی کی نیند میں خلل پڑنے کے سبب۔ یوں بھی تمام دن گھر میں انکی آمد کی تیاری کے بہت کام رہا تھا۔
وہ دبے پاؤں کوٹھی میں سے گذر کر حویلی میں آیا، عین کوٹھی کے اندر والے ہرے سے ملی ہوئی صحنچی
...ں محراب کے نیچے پلنگ پر جیسے وہ کسی کی منتظر سی بیٹھی تھی آہستہ سے کوٹھی کا پٹ بھیڑا ایک ساعت
...ڑے ہو کر اس نے حویلی کا جائزہ لیا، کوئی چیز نظر نہ آئی — البتہ ماں کی گہری نیند والے خراٹے کان
...ں پڑے — چترا کے بالکل قریب پہنچ کر نہایت رازدارانہ سرگوشی میں متوجہ ہوا۔

"تم نے بت کھول لیا؟"

"ہوں آں، ایں! نہیں ابھی چندر ماں نہیں نکلا ہے"۔

"وہ تو بھوجن نہیں کر گئے ابھی؟"

"ایں!" جیسے وہ اچھل پڑی "نہیں - ایں آں ایں دُو — کون؟ - آں ہاں - کئی بار بلوایا،
...ں ایسے تھکے ہارے آئے تھے کہ جہاں کے تہاں سو کر رہ گئے"۔

"مگر ابھی تو رات زیادہ نہیں گئی ہے وہ آئیں گے ساڑھے دس گیارہ بجے تک ضرور"۔

"تو پھر؟" چترا کا انداز ذرا ذرا سوالیہ سا تھا۔

"تو پھر — پھر کیا — یہ لو یہ ہے، انہیں بھوجن کے ساتھ کھلا دینا - سمجھیں"۔

"ایں کیا ہے؟" — اس نے سٹپٹا کر پوٹلی کی جانب دیکھا مگر ہاتھ میں نہ لی۔

"مگر وہ تو شاید اب نہ آئیں گے، بھوجن کو پتا جی نے بار بار بلوایا۔ یہ اتنے میں اندر آئے وہ وہاں
...و کر رہ گئے۔ جب خود پتا جی باہر گئے اور جگا کر بھیجنا چاہا تو نیند میں دھت تھے بڑبڑا کر کہدیا بھوجن نہیں کرینگے"

"خیر اگر اب وہ لیٹنے کے لئے کسی وقت اٹھ کر آئیں گے تو ضرور اندر تم انہیں اصرار کر کے کھلا دینا
...یں خیر میں انہیں اٹھا کر ابھی بھیجے دیتا ہوں کہ بھابی بلا رہی ہیں فوراً آئیں گے"۔

"گو اس میں ہے کیا چیز؟"

"تم نہیں جانتیں کیا چیز ہے"۔
اور چترا دیوی نے تو گھر کے اندر گھستے ہی اس کے ہاتھ میں بھانپ لیا تھا کہ آ گیا موت کی پوٹ لئے ہوئے اور اس کے سینہ میں تو دیکھتے ہی کبوتر سا پھڑ پھڑا رہا تھا اور اس وقت اس کا رنگ سفید پڑ گیا اور جیسے اُس کے اندر سے اس کے سوال کا جواب ابھرا۔" ہاں میں سب کچھ جانتی ہوں اور پھر بھی انجان ہوں"۔ اور الفت اس کے سکوت اور اس کے خائف خائف چہرے چہرے سے انداز اور تیوروں پر بھونچکا سا رہ گیا اور حیرانی کے ساتھ ذرا تلخ سا انداز بناتے ہوئے کہا۔
"تم ہچک رہی ہو عورت میں یہی تو کمزوری ہوتی ہے ہمارے درمیان سب کچھ قول قرار ہو چکا ہے"
وہ جیسے باوجود کوشش کے بھی کوئی جواب نہ دے سکی، پتھر کی مورت کی طرح کبھی الفت کے چہرہ کو دیکھتی اور کبھی اس کے ہاتھ میں لٹکی ہوئی پوٹلی کو"۔
" چترا یہ وقت کھونے کا نہیں ہے ہمت کرو اور کام کے لئے مستعد ہو جاؤ میں ابھی نیند سے بیدار کر کے انہیں اندر بھیجتا ہوں۔ اسی میں میری اور تمہاری دونوں کی قسمت لٹک رہی ہے سمجھیں ادھر کر دیا ادھر"۔ اور یہ کہتے ہوئے سرخ پوٹلی چترا کی جانب بڑھائی۔ مگر پوٹلی کو ڈری ڈری نگاہوں سے دیکھ کر وہ سمٹ سی گئی اور ہاتھ نہ بڑھایا۔
"کیوں کیا بات ہے پکڑو اسے میں ابھی جگا کر بھیجتا ہوں۔ تم بھی ساتھ ہی برت کھولنا بس اور ساتھ ہی ساتھ کھانا کھانا سمجھیں"
وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ گردن اوپر اٹھا کر رحم کی بھیک سی طلب کرتی ہوئی نظروں سے گنبر کو دیکھا کچھ بولنے کی کوشش کی مگر شاید وفورِ جذبات نے زبان بند کر رکھی تھی۔
آنکھیں اگر اندھیرے میں بول سکتی ہیں تو دیوار گیری کی مدھم روشنی میں الفت رائے نے چترا کا کہا سُن لیا مگر سنی ان سنی کرتے ہوئے بات کو ہلکا اور تعلّی کرنے کے انداز میں بولا۔
" لو نا، میں جاؤں پھر باہر تم تھال سجا دو رسوئی میں جا کر"۔
اس نے آہستہ سے حلق صاف کیا اور آنکھیں نیچی کر لیں اور زیر لب بولی۔
"میرا ہردہ کانپتا ہے۔ ہمت نہیں پڑتی"۔
"کیوں؟" الفت کا لہجہ دوسرا رُخ اختیار کر گیا۔

اور چترا نے گھونٹ سا لے کر کہا۔

"تُم۔ تُم مو جھے — مجھے اس کا انجام اچھا نہیں معلوم پڑتا — الفت سوچ لو۔ ہماری دونوں ہی کی خرابی ہے"۔

الفت کو طیش آیا، جیسے بجلی کے کرنٹ کا شاک مار دیا۔

"چترا کہاں سے بول رہی ہو تم ہوش میں ہو؟ اب کہتی ہو سوچ لو! اس دن کیوں اس پر پکی ہو گئی تھی۔ اب جب تیر کمان سے چھوٹ گیا اور میں آدھا کریا میں بھسم ہو گیا تو کہتی ہو سوچ لو۔ یہ تو آگرہ سے ہی کر سوچ چکے تھے ہم تم، پھر اُس روز صبح کو اچھی طرح سوچ چکے تھے، جس روز تم نے مجھ کو بھگت کے پاس بھیجا تھا اور پھر کل پرسوں سوچ چکے تھے۔ اب کیا سوچ لوں، جب میری آدھی زندگی ختم ہو چکی"۔

چترا سہم سی گئی — اور بہت ڈرے ڈرے لہجہ میں بولی۔

"آدھی زندگی کیسے ختم ہو گئی میں نہیں سمجھی"۔

الفت غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو گیا

"کیسی ننھی نادان بنتی ہے — یہ تو سچ کہتی ہے کہ تو نہیں سمجھی مکار کہیں کی — اچھا سن تیرے لفظوں پر بھروسہ کرکے میں نے اپنا کام اس سلسلے میں پورا کر دیا اور جو مجھ پر تکیہ کئے بیٹھی تھی اور اگر تو درمیان میں نہ آتی تو جو میرا سہارا تھی وہ (سرخ پوٹلی بڑھا کر دکھاتے ہوئے) اس میں سے اپنا حصہ کھا کر موت کی نیند سو چکی اب تیرا پارٹ باقی ہے، اُس کو پورا کر دو ورنہ —"

اور وہ سنبھل گئی اور ذرا ترچھی ہو کر بولی۔

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ کیا، بتاؤں، ورنہ یہ کہ یہ میں خود کھاؤں گا۔ مگر یاد رکھ عورت تیرے لئے ایک بھی نہ رہے گا نہیں، چھتری پتر ہوں، پہلے تیرے اُس کے گولی ماروں گا جو تو یہ سمجھتی ہو کہ تیرے گلے کا ڈھول بنانے کے لئے اُس کو چھوڑ جاؤں"۔

"نہیں الفت، تم کیوں کھاؤ گے، اور کیوں گولی مارو گے، قصور میرا ہے شروع سے آخر تک — میں کھاؤں گی"۔ (اُس کے ہاتھ سے پوٹلی لینے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے)۔ "لاؤ ابھی تمہارے سامنے کھاتی ہوں"۔

الفت کچھ ڈھیلا سا پڑ گیا اور پوٹلی ایک جانب کو ہٹا کر بولا۔

"سمجھ سے کام لے — ابھی کچھ نہیں بگڑا' تو کہتی ہے - نادان پاؤں تلے کی بھی نہیں دیکھتی - یہ
پہلے خوب سوچ سمجھ کر اور چاروں کھونٹ دیکھ بھال کر تونے ہی تو مجھے اس پر اکسایا - پہلی بات تو یہ ہے
کہ چترا میرے تو پرکھوں کی بھی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا کہ دیور بھاوج اور بھائی بہن دو دو ہو سکتے ہیں' چترا یہ
مطلب بھی تم ہی نے مجھے سمجھایا پھر خوب سوچ سمجھ کر جو مسئلہ آج درپیش ہے تم ہی نے پیش کیا اور مجھ کو
اس پر اکسایا اور اب مجھے دھوبی کا سا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا بنا کر چھوڑ رہی ہو"۔

"مان لی الفت تمہاری بات - میں نے ہی تمہاری محبت کا پیمانہ دیا اور میں نے ہی تمہیں اس پر اکسایا
پھر جب پہلی مرتبہ گھر پہنچ کر جب میری پولی اکھڑی تو میں نے پانچ برس کو ٹالنے والی بات کی آڑ پکڑی مگر
تم کہتے ہو کہ وہ بات نہیں بن سکتی اور کہتی میں بھی ہوں کہ دو بچوں کا کھیل ہے - مگر ہائے الفت میں کیا
کروں میرے ہاتھ یارا نہیں دیتے"۔

"کیوں پولی اکھڑی بھی اور کس لئے ہاتھ یارا نہیں دیتے - اچھا یہ بتاؤ تیری آتما کدھر کھنچتی ہے
تیرے دل کی دنیا کس سے آباد ہے"۔

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی اور الفت نے ذرا تامل کیا۔

"بول؟ —— ذرا دل کو ٹٹول اس میں کون بسا ہے"۔

"وہ سب ٹھیک ہے مگر میرے الفت میں کیا بتاؤں' میرا ہردہ کانپتا ہے' اور ہاتھ مجبور سے ہیں"

"بھئی واہ کیا نیا ہے' اپنی پریم کی پھولوں بھری سیج سے ایک کانٹا نکالنے کے لئے آپکی انگلیاں
سہارا نہیں دیتیں - جانتی ہیں آپ یہ ہماری پریم کی بہتی ندیا میں کوڑا کرکٹ ہے اور میں نے صاف کر دیا
اور پھر ذرا کچھ توقف کیا اور اپنی بیوی کے انجام کو سوچ کر بولا۔

"ہمارا فرض ہے کہ ہم اُسے صاف کر دیں - اچھا سچ بتا تیرا پتی کون ہے وہ کہ میں - اور تو کس کی پتنی
میری یا اُس کی"۔

"تم بالکل صحیح کہتے ہو' پھر میں اپنی ہمت کو کیا کروں' جواب دی گئی"۔

"دیکھو چترا وہی ایک مرغے کی ٹانگ - پنچ پرمیشر سماج کے احمق خوف کی آڑ لے کر دو جیون ا
مت کر' میرے من مندر کی دیوی تو ہے اور آج میں نے پنچ پرمیشر سماج سب کا کرا دھرا اپنے کندھ

سے اتار پھینک دیا۔ وہ میری کوئی نہیں تھی، ہمارا تمہارا قول ہو چکا ہے وہ تمہارا کوئی نہیں ہے۔ میرے راستہ سے اس کو صاف کرو۔ جیسی میں نے ہمت کی ہے ایسی ہی تم بھی کرو۔ اور یہ جو خود کھا لینے کی دھمکی دیتی ہو تو بتاؤ تمہارا جواب تمہارا جیو کب رہا ہے۔ الفت کے من مندر کی بھولی دیوی۔ تیری جان اب میرا مال ہے اور میری جان تیری ملکیت"۔ اور وہ اُس کے برابر پہلو سے پہلو ملا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں الفت، مگر نہ معلوم مجھے یہ پہاڑ لٹنے کے برابر معلوم ہوتا ہے"۔ اُس نے ڈری ڈری آواز میں اس کے قریب کھسکتے ہوئے کہا جیسے اُس کے سہارے کے لئے اس کی جانب کھنچ رہی ہے۔

"اچھا خیر تمہارے ہاتھ یارا نہیں دیتے کوئی بات نہیں (ذرا توقف کر کے) اچھا جاؤ تم رسوئی سے تھال نکال لاؤ (پوٹلی بڑھا کر) اور ایک پلیٹ میں اُسے بھی ایک جانب کو رکھدینا۔ اور ہم تینوں ابھی ساتھ بیٹھ کر بھوجن کریں گے، پھر میں پلیٹ انکی جانب سرکا دوں گا۔ اٹھو جاؤ رسوئی میں، میں ابھی لاتا ہوں اٹھا کر سوتے سے"۔ اور وہ اٹھنے لگا۔ مگر چترا اُس کی آغوش میں اس طرح جا پڑی جیسے شیر خوار بچہ آڑا آڑا ماں کے پیٹ اور سینہ سے چمٹ جاتا ہے۔

"نیں، نیں، نہیں، نا ہیں الفت"۔ اور اُس کو اٹھنے سے باز رکھا۔

"کیوں نہیں؟" وہ پھر سنجیدہ اور تلخ سا ہو گیا۔ "تیرا وہ کون ہے؟"

دفور جوش سے اُس نے الفت کی آغوش میں پڑے ہی پڑے اُس کی گردن میں ہاتھ حمائل کر دیئے اور اُس کے سینہ اور پیٹ سے کھنچ کر چمٹ گئی اور اُس کی گردن جھکائی اور اپنے کانپتے ہونٹ اُس کے ہونٹوں میں پیوست کر دیئے شاید وہ خود بھی اور الفت بھی اس بوس و کنار کے حسیات کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھے جن کے تحت ایسے سنگین سازش کی بحث و مباحثہ کے درمیان یہ ذرا بے محل سانحہ وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ تاہم لمس نو لمس سے ہے اور بوسہ بوسہ سے۔ سرمدی سے ذرا ہوش میں آ کر الفت نے اُس کے چہرہ پر غور کیا اگر سچ مچ چشم آہو کی تشبیہ صحیح ہے تو چترا کی آنکھوں میں جال کے اندر پھنسی ہوئی ہرنی کی کیفیت تھی۔ وہ اُس کی گود میں بھری ہوئی تھی اور تمام بدن پر وہ عالم طاری تھا جیسے کوئی چار پانچ سال کی بچی مسان بھوت کے خوف سے اپنی ماں کی آغوش میں پناہ لئے ہوئے ہو۔ اُس کے رگ رگ پٹھے پٹھے سے ظاہر تھا کہ وہ ہار مان چکی ہے۔ اور اُس کی یہ ہمہ تن سپردگی کا عالم دیکھ کر الفت نے پھر مختلف زاویوں سے اُس کے چہرہ پر بوسوں کی بھرمار کر دی۔ کچھ ہمت بندھاتے ہوئے، کچھ تحسین و آفرین کہتے ہوئے اور

شاید کچھ دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال، میری آتما کی شانتی"۔ اور پھر بھاری اور ہلکے، بھرے اور خالی بھانت بھانت کے بوسے۔ اور وہ بدستور چھپکلی کی طرح چپکی رہی۔ اپنی گداز باہنوں اور رانوں کے شکنجہ میں الفت کے سینہ اور پیٹ کو کسے ہوئے جہاں کی تہاں، تھرتھرائی ہوئی سانسیں لیتی رہی۔

"لو اٹھو! میں جاؤں، تم رسوئی کی طرف جاؤ! یہ لو! اسے سنبھالو"۔ الفت نے انتہائی رازدارانہ سرگوشی میں کہا.....

جیسے شیر کی غوں کوٹی کے دروازے سے گونجی۔

"اے نامردے سنبھل! میں خود ہی آگیا! میں نے تو تیری سن لی اب تو میرا دھما کا سن! اے۔"

جیسے ان کے اندر تار اور رونگٹا رونگٹا جھن جھنا پڑا اور جب انہوں نے اچھل کر دیکھا تو بارہ بور کی بندوق میں نہال رائے دونوں کارتوس ڈال چکا تھا۔ اور جب تک ادھر بندوق کندھے تک پہنچتی یہ دونوں بجلی کی طرح تڑپ کر اسی محراب کے دونوں ستونوں کی آڑ لے گئے جس کے نیچے وہ سوز و ساز کا ڈرامہ کھیل رہے تھے۔

"اے سنبھل کپوت! بڑا چھتری بچہ بنا پھرتا ہے! آج بچ کر نہیں جائے گا!" بپھرے ہوئے شیر کا دوسرا چیلنج گرجا اور یہ دونوں اور بھی سنبھل کر ستونوں سے چپک گئے۔ پہلے تو مجرمانہ ضمیر اور پھر بہتا بجز چھپنے کے صورت بھی کون سی تھی۔ نہال رائے چیل خیر کی طرح غراتا، بندوق کندھے پر تالے کا داسا کاٹے کر ترچھا ترچھا ذرا صحن کی جانب بڑھا، اور غوں، غوں، غاؤں آنکھوں سے چنگاریاں سی پھینکتا ہوا تیندوے کی طرح تاک لگانے لگا اور دونوں میں سے کسی کی اک ذرا سی جھلک دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تقریباً تین چار منٹ جیسے تین چار جگ۔ یہ چوہے بلی کی آنکھ مچولی والا کھیل ہوتا رہا۔ وہ دونوں ستونوں پر نظریں جمائے پینترے سے کاٹ کاٹ کر آہستہ آہستہ غراتا تاکیں لگاتا رہا اور اسی رفتار تیز میں سایہ کی طرح لپک کر چترا اپنے ستون کی آڑ سے نکل کر صحنچی والی کوٹھری میں پناہ لینے کے لئے لپکی، اور کوٹھری کے اندر پہنچتے ہی سامنے طاق میں رام پوری ساخت کی "بیچک ر"۔ (بھر مار پرانی وضع کا خود کار طمنچہ) دیکھا جو راجہ جی کے جد امجد کی نشانی تھا، چترا نے کوٹھری کے کواڑ بند کرتے کرتے اس کو اٹھا کر الفت کی جانب پھینکا اور الفت نے اس کو اس طرح ہاتھ میں دبوچ لیا جیسے اس کی ہتھیلی اور انگلیاں مقناطیس کی تھیں۔ ایسے موقع پر جتنے

حواس مجتمع ہو سکتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ سنبھال کر اُس نے طمنچہ کا جائزہ لیا، پوری کی پوری چرخی بھری ہوئی تھی اور پانچوں ٹوپیاں چڑھی ہوئی تھیں، بالکل تیار تھا۔ معاملہ حق و ناحق کے مرحلہ پر پہنچ گیا اور زندگی قائم رکھنا ہر جاندار کا فطری حق ہے۔ اور بندوق کے مقابلہ میں تو حق دار کے علاوہ مانا ہوا یہ اور بھی رہی ہوا کرتا ہے جس کا ہاتھ پہلے اُٹھ جائے۔

دھماکہ تو تقریباً ایک ہی سنائی پڑا مگر پتہ نہیں کہ پہلے کس کی بندوق نے آگ پکڑی کیونکہ "ہم نہیں یا پھر تم نہیں" کے نقطہ پر پہنچ کر الفت رائے نے اِدھر ستون کی آڑ سے اندھا کر ہاتھ نکال کر فیر کیا اور اُدھر سے پہلی جھلک پر نہال رائے اندھا دھند لبلبی دبائی اور نہ معلوم کیسے گولی کے دروازہ میں سے بڑے راجہ جی "کیا ہے؟ کیا ہے! ہیں! ہیں!" کہتے ہوئے درمیان میں آپڑے ایل جی گرآسیب کر، چھیوں دانے بڑے بیٹے کی بندوق سے اُڑ کر دو ڈرام بارود کے اوپر رکھی ہوئی پون اونس کی ٹھوس گولی چھوٹے بیٹے کے طمنچہ سے نکل کر باپ کے دائیں اور بائیں دونوں پہلو چیر چکی تھی اور دونوں بیٹوں کی ٹوٹی ڈھال کی طرح راجہ سلامت رائے ڈھیر ہو کر رہ گئے تھے۔ لبلبی دباتے دباتے ہی دونوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ الفت رائے کے اوپر سے تو عشق کا بھوت بھاگ گیا اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اور اسی دستخط میں بڑا دیوی اپنی ناک سلامت لئے اور اکبر اور جہانگیری دور کی اونچی ہوئی باپ اور سسرے کی کٹا کر نہ معلوم کدھر فرار گر دو...... اُدھر رقابت کی آگ پر عقل نے چھینٹا مارا، نجیب الطرفین کا بیٹھ بچہ اور پختہ عمر کے تجربہ کار منشی نہال رائے نے کمال چابک دستی کے ساتھ کمان سے نکل جانے کے بعد بھی چلے ہوئے تیر کو پکڑنے کی کوشش کی، باپ کا ڈھیر اور اپنے ہاتھوں کو دیکھ کر کالیتھ کھوپڑی کا ہر پرزہ چلنے لگا۔

بوڑھے باپ نے بھی دو اونس سیسہ پینے کے بعد بھی دم توڑتے توڑتے فرزانگی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا بیٹے نے بڑھ کر سنبھالا جلدی سے چادر پھاڑ کر زخموں کو باندھ دیا اور حواس پر قابو پا کر بجلی کی سرعت سے اپنے خاص خاص جمع کئے ہوائی جہازوں اور موٹر کاروں کی سرعت کے ساتھ سواریاں تیار ہو گئیں پہلے اُدھر ایک ہوشیار برہمن کو ایک تیز گھوڑی پر سوار کر کے ایک مختصر سی تحریر دے کر تھانہ بھیجا اور ہدایت کر دی کہ پولیس میں چوروں ڈکیتوں کے حملہ کی رپورٹ درج کرا دے اُدھر سب سے تیز رفتار بیلوں کا ایک جوڑ گدے وغیرہ بھر کر باپ کے لئے جڑوایا اور خود باپ کو چند جاں نثاروں کی معیت میں لے کر قصبہ سپتال پہنچا۔ صبح تک کنور سلامت رائے آخری سانس تک ناخلف اور نااہل بیٹوں کے لئے لیٹے ہوئے

مجسٹریٹ کے روبرو بحلف بیان نزاعی میں یہ کہہ گئے کہ حویلی کے اندر میں نے کچھ چور گھیر لئے تھے دو چوروں نے بیک وقت متضاد سمتوں سے مجھ پر دو بندوقیں چلائیں ۔ اور نرالی شان کے ساتھ باپ بیٹے کی تاریخ کی کتاب میں بڑی عجیب سی سرخی کے ساتھ ایک رنگین ورق کا اضافہ کرتے ہوئے ہسپتال کے پلنگ پر چپکے سے سرگباش ہو گئے اور جاتے جاتے محبت پدری کے لبالب بھرے خزانہ میں ایک نیا اضافہ کر کے ایک اور دوامی مہر لگا گئے۔

جوں جوں وہ بڑھتا گیا گھر کے اندر سے چیخ پکار کی آواز مدھم ہوتے ہوتے معدوم ہو گئیں مگر طمنچہ کے دھماکے کے بعد باپ کی دلدوز چیخ صریحاً اپنے سینہ سے اٹھ اٹھ کر کانوں میں گونجتی رہی ۔ وہ بستی سے باہر پہنچا تو سیاہ بادلوں کی موٹی چادروں کے اندر چاند بھاگتا نظر آیا - تقریباً نصف میل وہ بھاگتا چلا گیا - اور ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں کئی راستے پھٹتے تھے اور جیسے غیر اختیاری طور پر وہ ایک راستہ پر پڑ لیا اسی طرح آگے آگے بے خودی اور پیچھے پیچھے ہوش دو سو قدم اور بڑھا چلا گیا تو اُسے کچھ کچھ اندازہ ہوا کہ جس راستہ پر اس کے قدم چل رہے ہیں وہ اسٹیشن کو جاتا ہے ۔ اور اُسے عظیم حادثہ کا بھی کچھ کچھ احساس ہوا اور اُس نے داخلی اور خارجی طور پر اپنا جائزہ لیا - اندر سے تو اُس کو باپ کی موت کی چیخ کے سوا کچھ نہ سنائی پڑتا تھا اور اس نے اپنا جائزہ لیا تو سیدھے ہاتھ میں وہ طمنچہ جس کی گولی بھائی کے سینہ کی بجائے باپ کے پہلو میں پڑی تھی ہنوز ہاتھ کی مضبوط گرفت میں تھا - سر سے پاؤں تک مرتعش ہو کر اُس نے جیسے اپنے اوپر سے ایک خول سا اُتارا ۔ جرم و گناہ کی نوعیت کا بڑا احساس شدید تھا - بڑے بھائی کی آبرو ریزی اور اُس کے شاخسانہ میں بوڑھے معصوم باپ کا قتل !! سب کچھ اُس کے ناپختہ ذہن پر اتنے شدید اور کارگر اثرات قائم کئے ہوئے تھا کہ قانون کی گرفت کا احساس اور سزا کا خوف ابھی تک دخل نہ پا سکا تھا - وہ ڈھائی سو قدم اسی والہانہ انداز میں اور بڑھ گیا تب وہ اپنا جائزہ لینے پر قادر ہو سکا - جیسے ہوش اور بے خودی دوش بدوش آ گئے - حواس آہستہ آہستہ بحال ہو رہے تھے ۔ رفتار میں سرعت تھی اور طمنچہ بدستور لٹک رہا تھا مگر آہ گرفت ڈھیلی تھی - چلتے چلتے اک ذرا توقف کیا ، چال کا رُخ ضرور معین تھا لیکن منزل کا شعور نہ تھا چاند ذرا کسی بڑی کالی چادر کی آڑ لے چکا تھا اور جنگل دور دور تک تاریکیوں میں گم تھا - اب کی مرتبہ دور بہت

دور کہیں پر چاندنی کھلی ہوئی تھی کچے راستہ کے ارد گرد جھڑ بیری اور سرکنڈے کی جھاڑیاں اور جھنڈ قطار کے ہوئے اُس کو اپنے دامن میں چھپاتے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور اب اُس نے آنکھیں کھولیں، چند ڈگیں آپوں آپ اور بڑھ گئیں ـــــ اور اس بھیانک منظر اور ماتم سا کرتے ہوئے ماحول میں اس کے دل کے اندر مختلف النوع قسم کے خوف دہشت وار داخل ہو گئے۔ بوڑھے باپ کے قتل کے جرم کی نوعیت کے جمالیاتی پہلو سے ہٹ کر اور رقت سے گلو خلاصی کر کے اُس کے اندر ایک رتی اپنے قاتل ہونے کے احساس کی پیدا ہوئی۔ اور جب اُس نے اک ذرا گردن ایک جانب جھکائی تو طمنچہ مفلوج عضو کی طرح لٹک رہا تھا اور اُس کے اندر چھ میں سے ایک گولی چلنے کے بعد پانچ باقی تھیں اُسے خوب یاد تھا کہ یہ طمنچہ اُس کے دادا کی یادگار ہے اور خلاف قانون طور پر بالیسنس بغیر سرکاری اندراج واجازت اُس کے باپ اُس کو بزرگوں کی نشانی اور اپنی حفاظت کے لئے بعض مخصوص تاریخی روایات کی بنا پر رکھے ہوئے تھے وہ سوچ تو شاید کچھ بھی نہ رہا تھا مگر اُس نے غور کیا کہ اُس سے وہ حرکات آپوں آپ سرزد ہو رہی ہیں جو حفظ ما تقدم اور بچاؤ کے لئے ہوتی ہیں۔ وہ پولیس کی تفتیش اور تحقیقاتِ جرم کے طریقہ کو بھی جانتا تھا اُس نے نہ معلوم کس جذبہ کے تحت وہ طمنچہ راستے کے قریب ایک کنوئیں میں پھینک دیا اور جیسے اپنی صفائی اور بچاؤ کا پہلا اقدام کر کے اُس نے آلۂ قتل سے سبکدوشی حاصل کی جو اُس کے رنگین ہاتھوں کو بالکل ہی سرخ بنائے ہوئے تھا ـــ اور پھینکتے ہی رفتار اور تیز ہو گئی چند ہی قدم بڑھانے کے بعد اُس کے اندر سے کسی نے پکارا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"اسٹیشن!"

"کہاں جاؤ گے؟"

اُس کے سامنے اُس کا دوست شیخ فرید الدین آ کھڑا ہوا۔ یہاں سے پچیس میل دور مراد آباد اور رام پور کی سرحد پر گھنے جنگل میں اس کا قصبہ گڑھی شیخان آباد تھا۔ "آخر اس کے ہی یہاں کیوں جا رہا ہے؟" جیسے اُس کے اندر سوال اُبھرا اور پھر جواب "وہ بڑا صاحب الرائے ہے!" اور شاید یہی چیز تحت الشعور میں لئے ہوئے اُس کے قدم ادھر کو اٹھ رہے تھے۔ تقریباً نصف فاصلے کر لینے کے بعد خاموش اور اندھیرے اجالے میں سوتے جاگتے جنگل کے اندر اُس کے کان میں دور سے پونسے چلتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ وہ چونک پڑا، اور بار بار چونک چونک کر اندازہ لگانے لگا، اور چند ہی منٹ میں آواز

واضح تر ہو گئی — " نہال رائے اُس کا پیچھا کر رہا ہے"۔ جیسے کسی نے اُس کو متنبہ کیا — افسوس کہ وہ طمنچہ بھی ہاتھ سے پھینک دیا، اور گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز کی سمت سے بچ کر دہ راستہ سے کترا کر ایک جانب کھیتوں میں کو پڑ لیا، مگر چند ہی منٹ کے اندر اُسے اندازہ ہو گیا کہ اب سوار کا رُخ بھی اُس کی جانب کو ہو گیا، اُس کے تصور میں بارہ بور کی بندوق تانے خون آشام آنکھوں سے گھورتا نہال رائے گھوڑی پر سوار گھومنے لگا، پہلی جھلک پڑتے ہی گولی مار دے گا۔ جیسے جیسے اُس نے آواز کی سمت بچ نکلنے اور کترانے کی کوشش کی آواز نے اُس کا تعاقب کیا یہاں تک کہ بہت ہی قریب سنائی دینے لگی اُس نے ٹاپوں کی آواز سے یہ اندازہ لگانا چاہا اگر یہ اس کے اپنے اصطبل کا کوئی جانور ہے تو کون سا گھوڑا یا گھوڑی ہے۔ تو آواز بالکل مختلف اور نامانوس پائی پھر تعجب یہ تھا کہ یہ اُس کی سمت بڑھ کیسے رہا ہے۔ یہاں تک کہ آواز بالکل قریب آ گئی اور ایک محبت بھری پراطمینان ہنہناہٹ جو ایسے موقع پر مخصوص ہوا کرتی ہے نکالی۔ اور اُس کی خانہ زاد بجلی جو اُس نے لاڈ اور بڑی محبت کے ساتھ اپنے ہاتھ سے پرورش کی تھی اس کے۔ ایلے کی سواری میں سامنے کھڑی تھی اُس کو چند ماہ سے ٹریننگ کے لئے ایک مشہور چابک سوار کے سپرد کر دی تھی جو مستقل طور پر اسی قصبہ میں رکھتا تھا جہاں اُس کی سسرال تھی، اور یہ وہاں مہمان تھی — وہ جنگل کی کھلی فضا میں اس کی بو پر چلی رہی تھی۔

" جیجا جی — یہاں آپ کہاں؟ میں تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ بجلی مجھے کدھر لئے جا رہی ہے، پھر میں سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ بو پر چل رہی ہے۔ مجھے دیدی نے آپ کے پاس بھیجا ہے، وہ پرشاد سے برت کھولتے ہی بہت بیمار ہو گئیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس پرشاد میں کچھ ملا ہوا تھا، یا کیا بات تھی۔ ویرجی نے کچھ ملا دیا تھا — (اُس کی آواز میں خوف جھلک گیا) برت کھولتے ہی اُن کے پیٹ میں بڑے زور سے لوک دے کے درد اٹھا اور جی بُرا کیا، پھر ایک اور خون ملی تے ہوئی اور اُس کے بعد پھر بڑے زور سے درد اٹھا اور دو دست آئے۔ ماتا جی کہتی ہیں کہ جیتا خون آیا، اور دیدی نے بتایا کہ خون کے ساتھ آنتیں تک کٹ کر نکل گئیں اور درد بہت زور سے ہو رہا ہے، ماتاجی نے گھبرا کے مجھے محی الدین گڑھ کے بڑے حکیم جی کو بلانے کے لئے کہا، مگر دردمیں تڑپتے تڑپتے دیدی نے مجھے اپنے پاس بلا کر کہا کہ حکیم جی کے پاس پیچھے جانا پہلے اپنے جیجا جی کے پاس دوڑ جاؤ اور انہیں وہ پرشاد کھانے سے روک دو جو میں نے ابھی بھجوایا ہے ان کو پکا گمان ہے کہ اس میں کوئی زہر ملا ہوا تھا"—

اُس کی بات الفت رائے کو ایسی معلوم پڑی کہ جیسے رکاب میں سے پاؤں نکال کر اُس نے اپنے جوتے

کی ایڑی اُس کے منہ پر بڑے زور سے ماردی۔ بات کی عظمت کو اُس نے اس طرح جھنجھوڑ دیا جیسے شیر ہرن کے بچہ کو بڑی مشکل سے اتنا کہہ سکا۔

"نہیں اس میں کچھ نہیں۔ اور میں نے تو اسی وقت سب کھا لیا تھا۔ کچھ نہیں ہوا، دیکھ ہٹا کہتا ہوں برسات کا موسم ہے، بدہضمی ہیضہ وغیرہ تو نہیں ہو گیا کچھ؟ تم جلدی حکیم جی کو بلا کر لے جاؤ۔"

"اچھا آپ کہاں جا رہے ہیں بے وقت؟"

"اے۔ اے۔ ایس۔ اسٹیشن۔"

"کیوں؟"

"میرے ایک دوست اس گاڑی سے گذر رہے ہیں، ان کے پاس ٹھہرنے کا وقت نہیں ہے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ رستہ چلتے اسٹیشن پر مل لوں۔"

"ایں اور پیدل! ــــ گھوڑی کیوں نہیں لی؟"

"وُ ــ دُ ــ وہ ایک پھنسی ہے ران پر۔"

"تو پھر رتھ کیوں نہیں جڑوا لیا؟"

"بھئی تم جلدی جاؤ۔ حکیم جی کے لئے اُس وقت تمہارے پاس ایک کوتل ہونا چاہیئے تھا۔ اب تم گھوڑی حکیم جی کو دے دینا اور خود جس طرح ہو سکے گھر پہنچنا سمجھے ورنہ اپنے ان راؤ چچا کے ہاں سے گھوڑی لے لینا۔"

اور لڑکے نے وہیں گھوڑی سرپٹ دوڑا دی۔ الفت ایک محویت کے عالم میں اپنے سالے کو اندھیرے جنگل میں غائب ہوتے دیکھتا رہا، اور جیسے وہ ایک بھیانک خواب سے چونکا، وہی پاؤں جو تیز تیز اُٹھ رہے تھے اب من من بھر کے ہو گئے، گھر سے فرار ہوتے وقت تو باپ کے قتل کی لعنت کا طوق گردن میں کیا کم گراں تھا کہ تک ٹوٹی جا رہی تھی، اور زندگی بھر گردن جھکی رکھنے کے لئے (بشرطیکہ زندگی باقی رہے) اتنا کافی تھا کسی کے سامنے آنکھیں چار نہ ہو سکتی تھیں۔ اور اس وقت اس کے سالے نے جو بات کی تھی گو وہ اُس کو پہلے ہی سے اس سے کہیں زیادہ اچھی طرح معلوم تھی مگر اُس کو اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کو کسی نے مٹی میں آدھا دفن کر دیا ہے۔ اب تک تو بے لوث محبت کرنے والے اور سب کچھ دینے والے شفیق و محسن باپ ہی کے قتل کا سنگین دھبہ اپنے دامن پر نظر آ رہا تھا اور یہ دوسرا گل کھلا۔ پدمنی جیسی پاکباز اور وفاشعار بیوی کے قتل کا

دھبہ دوسرے دامن پر چمک اٹھا، اس کی جوانی اس کی پاکبازی وفاشعاری اس کا خلوص، محبت اور احسان اور
مقدس بڑھاپا دونوں ایک سے ایک بڑھ کر رنگین تھے۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں، اور پہلے دھبہ میں تو
کائنات کی لعنتیں بل کھاتی نظر آ رہی تھیں، ان میں دنیا بھر کی حسرت و یاس بھی تھی۔ اس کی دھرم پتنی جس کو عرش
پر خدا نے اور زمین پر پنچوں نے اس کے دامن سے وابستہ کیا تھا اسی کے ہی ہاتھوں بے بسی اور بیکسی کا مرقع بنی
ہوئی آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی مظلومیت اور معصومیت کی داستان سناتی ہوئی اٹھتی جوانی میں اس پر
بھروسہ کر کے اس کے ہاتھوں اس کے ناپاک عمل کی بھینٹ چڑھی اور بارود کے دھوئیں میں باپ کو تو اچھی طرح
نہ دیکھ سکا تھا البتہ وہ موت کی مظلوم چیخ جو گولی پڑنے کے بعد اس کے بوڑھے پھٹے ہوئے گلے سے بلند ہوئی
تھی اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسہ کی طرح اب بھی رینگ رہی تھی اور اب اس کی نگاہوں کے سامنے
پدمنی کی بھرتی جوانی اور بے پایاں آنند میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس کے اوپر یاس و طنز بھری نگاہ ڈال رہی
تھیں اور بے چارگی کے عالم میں وہ اس سے پوچھ رہی تھی پران ناتھ! میرا کیا قصور تھا جو یہ سزا دی — اور
چلتے چلتے یہ ایک اور ہوئی کہ پہلے جیجاجی کے پاس جا کر پرشاد دکھانے کو منع کرنا اور پھر حکیم جی کے پاس
جانا — اور یہاں پر اسے پدمنی عرشِ اعظم کے کنگرے پر کھڑی نظر آئی۔ وہ سچ مچ عورت کے روپ
میں دیوی ہے۔ وہ سانپ تو نہیں تھا — آدم زاد تھا۔ والہانہ انداز میں اس کے قدم انفعال اور لعنت کا
ازالہ کرنے کے لئے یک دم اپنی سسرال کے راستہ پر اٹھ گئے، اس کے دل کی دنیا زیر و زبر تھی اس نے چاہا
کہ آخری ہچکی لیتے وقت میری آنکھیں اس کے قدموں میں ہوں اور میں پتلیاں رگڑ رگڑ کر اس سے معافی
خواہی کرتا ہوا وہیں پر جان دے دوں، اور اسے پھر افسوس ہوا اور اپنا طمنچہ یاد آیا۔ اس میں تو ابھی چار گولیاں
باقی تھیں، میری کنپٹی پر تو ایک ہی کی ضرورت تھی اور بس ایک گولی باپ اور بیوی دونوں کے خونِ ناحق سے
نجات دلا سکتی تھی — چند قدم چلنے کے بعد اس کو کسی نے پیچھے کھینچا یہ عقل کی باگ ڈور تھی۔ دل آگے بڑھتا
تھا، دماغ پیچھے گھسیٹتا تھا پاؤں عجیب کشمکش تھے۔ عقل و دل کے محاذ میں دل کی شکست کی جھنکار آنکھوں
تک پہنچی، دو بار میں آنسو پلکوں پر سے ٹپک کر رخساروں پر سے ڈھلکتے نہ معلوم کہاں گئے! شاید پاؤں تلے
کی مٹی میں مل گئے! — اور وہ بدستور اسٹیشن کے راستہ پر پڑ لیا اور اپنے دوست شیخ فرید کی ہمیشہ گہرے
غور و فکر میں غلطاں رہنے والی آنکھیں اور عقل و دانش در لیتے ہوئے سے بھرا پرا بشرہ اس کی نگاہوں میں
گھومنے لگا۔ "مگر وہاں تو ریل پر جانا ہے" — اور ریل کے کرایہ کے لئے جب اس نے اپنی جیب ٹٹولی،

تو ہمرے سے لباس میں جیب کا وجود ہی نہ تھا باریک ململ کا کرتہ اور مخملی کناری کی ململ تھی، پاؤں میں ربڑ کے تلے کی چپل ـــــ چند قدم اور بڑھا تو اُسے گاڑیوں کے اوقات یاد آئے۔ اور گاڑی آنے میں تو گھنٹہ بھر باقی تھا۔ اور جب ذرا آنکھیں کھلیں تو نظر آیا کہ کنو جی ایک چھوڑ دو قتل کر کے فرار ہو رہے ہیں اسٹیشن کا پورا اسٹاف اچھی طرح جانتا ہے اور تابعدار ہے اور یہ تابعداری اور شناسائی تو اس کے حق میں زہر قاتل ثابت ہوگی۔ پوائنٹ مین اور قلی سے لے کر اسٹیشن ماسٹر تک ہر ایک فرداً فرداً سلام کر کے خندہ پیشانی سے استقبال کرے گا اور شانِ نزول دریافت کرلے گا اور پھر "منزل!" اور بس سمجھ لو کہ یہیں اسٹیشن پر دھرے رہ جاؤ گے۔ نہ پائے رفتن نہ روئے ماندن، تاہم بلا کچھ سوچے سمجھے وہ بڑھتا ادھر ہی کو رہا۔

اسٹیشن کے قریب پہنچ کر اُس نے ریل کی دھڑ دھڑاہٹ سُنی سمجھ گیا کوئی مال گاڑی شنٹنگ کر رہی ہے۔ پٹری سے بالکل ملحق کھڑی ہوئی جھاڑیوں کی آڑ سے دیکھتا رہا انجن نے آگے بڑھ بڑھ کر اور پیچھے ہٹ ہٹ کر لٹھوں کے خالی ویگن کاٹے اور بھرے ہوئے ویگن جوڑے اور جب جوڑ کر چلنے کے لئے سیٹی دی تو یہ آڑ سے نکل کر ایک بھرے ہوئے کھلے ویگن میں لٹھوں کے درمیان جھپٹ کر لیٹ گیا۔

اپنے خوش باش دوست کو بلا شان گمان منہ اندھیرے اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر شیخ کا ماتھا ٹھنکا، اور سلام دعا کے بعد یقین ہو گیا کہ خیریت نہیں ہے۔ اور الفت رائے نے من وعن حکایتِ غمِ جاناں اور رودادِ غمِ دوراں سنا دی ـــ دیہاتی خلوص و روایت کے تحت شیخ نے گرم جوشی کا مظاہرہ تو کیا، مگر دل میں جز بز ہوا اور بڑی گہری سوچ میں جا پڑا۔ نوجوان ضرور تھا مگر غضب کا دور اندیش اور بلا کا پختہ کار۔ الفت کو اُس نے بہت تسلی دی بڑے اصرار کے ساتھ غسل اور ناشتہ پر آمادہ کیا، دوپہر کو بڑے اہتمام کے ساتھ اُس کے لئے کھانے کا انتظام کرایا اور جب وہ دونوں کھانے سے فارغ ہو کر باتیں کرنے بیٹھے تو شیخ نے بہت ہی شستہ الفاظ میں اس پر یہ اظہار کیا کہ قتل کے ملزم کو پناہ دینی کرنا تعزیرات ہند میں وہ جرم ہے جو ناقابلِ ضمانت ہے اور جس میں سات سال قید با مشقت کی سزا لکھی ہوئی ہے۔ الفت رائے نے اپنی مہمانی اور اپنے دوست کی میزبانی کے اس سنگین پہلو پر غور ہی نہ کیا تھا۔ بغیر کہے خود سمجھ گیا اور اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"تو یعنی میرے ساتھ تم بھی دھر لیے جاؤ گے"۔

اور شیخ نے برجستہ اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"بلکہ شاید تمہیں تو کچھ صفائی کی گنجائش بھی ہو مگر مجھے تو یہ بھی نہیں اگر تمہیں میرے یہاں پکڑا تو میں تو کچھ کہہ بھی نہیں سکوں گا۔ اور دیکھو بھئی الفت زود یا بدیر وہ تمہارا سراغ لگاتے ہوئے ہر اس جگہ پہنچیں گے ضرور جہاں تم گئے ہو، ان کا کام ہی یہ ہے، روٹیاں ہی اس کی کھاتے ہیں۔ کھوج سراغ رسانی تفتیش ان کا پیشہ ہے؟"

"اور پھر اگر یہاں سے پکڑا تو تم تو خیر مصیبت میں پڑو گے ہی پڑو گے۔ میں بھی تمہاری مدد اور تھوڑی بہت پیروکاری سے بھی محروم ہو جاؤں گا۔" الفت نے متردد ہو کر کہا۔

"سمجھ لو پھر میری مدد اور پیروکاری کیا، مجھے خود مدد اور پیروکاری کی ضرورت پڑ جائے گی"۔ شیخ نے کہا اور پھر ایک گھونٹ لے کر بولا۔

"کنور الفت رائے مجھے سو فی صدی یقین ہے کہ اگر تم یہاں سے آج اور ابھی چلے بھی جاؤ تو بھی یہاں ان چند گھنٹے ٹھہرنے تک کا سراغ انہیں مل جائے گا اور مجھ سے سوال ضرور کریں گے۔ سمجھ لو کہ اس چپہ چپہ پہنچ گئے جہاں تم گئے ہو لہٰذا ابھی تم عزیب صبح سے دوپہر تک میرے یہاں قیام کرنے کی پاداش میں بڑی حد تک میری کھلی ہوئی مدد سے بھی محروم ہو گئے۔ اب میں کنوڑا ہو گیا لہٰذا جواب دہی کر لوں گا کہ میں کچھ نہیں جانتا لیکن رہوں گا دور دور، ہاتھ پاؤں بچائے دقیقہ کوئی اٹھا نہ رکھوں گا۔"

"صحیح کہتے ہو، بہر حال جواب دہی اور صفائی کر لو یہ اور بات ہے، مگر مجھے اتنی دیر پناہ دینے کے مجرم تو ہو ہی گئے، اچھا تو اب بتاؤ میں کیا کروں۔" الفت نے کچھ نادم سا ہو کر کہا۔

"وہ تو میں نے بڑی اچھی پناہ گاہ سوچ لی ہے ایسی کہ پولیس کے فرشتے بھی نہ پہنچ سکیں وہاں تک، جب تک مصلحت ہو وہاں رہو اور روزانہ میرے تمہارے درمیان خبر رسانی کا سلسلہ بھی چلتا رہے۔ میں تم کو آج دن منہ سے دریائے کوسی کا گھاٹ پار کرا کر ریاست رام پور کی سرحد میں اتار دوں گا۔" اس نے انگلی سے سمت کا تعین کرتے ہوئے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔ "یہ دریا یہاں پر دھار دھار ہے۔ پہلا کنارہ ریاست میں ہے ادھر کا گورنمنٹ میں، اس کنارے سے زیادہ نہیں مشکل سے آدھے کوس کے فاصلہ پر ایک زیارت ہے کہتے ہیں کہ کسی شہید کا مزار ہے یا کیا ہے اپنے رہیلکھنڈ میں تو حافظ جی کے زمانہ کی ایسی بہت سی متبرک یادگاریں ہیں اس پر دیسوں ہندو سادھو بھی پڑے رہتے ہیں اور مسلمان فقیر بھی۔ تمہارے لئے کچھ چادریں گیروا رنگوائے دیتا ہوں، بس جوگیوں کا بھیس بدل کر وہاں جا پڑو، نوابی کی پولیس کو وہاں پہنچنے کی فرصت کہاں اور پولی

" اچھا یہ آپ کو یہاں ملی ہے ؟ — اس میں کیا ہے ؟"

" کوئی حلوہ قسم کی چیز" دروغہ جی نے پوٹلی کھول کر دکھاتے ہوئے کہا۔ " دیکھئے نا"

" اچھا حلوہ۔ خیر کوئی نوکر نوکرانی چرا کر لائی ہوگی۔ یا کسی نے لے جانے کے لئے باندھ کر رکھا ہوگا بلی اٹھا لائی ہوگی۔ کہاں تھا یہ؟ — آپ کو کہاں ملا۔ یہیں "

سب انسپکٹر خاموش رہا اور اب سوالات کا جدید سلسلہ شروع ہو گیا۔

" آپ کے چھوٹے بھائی کہاں ہیں ؟"

" وہ اسی وقت ڈکیتوں کے تعاقب میں روانہ ہو گیا تھا اور مجھے ابھی یہاں آکر معلوم ہوا کہ ہنوز واپس نہیں آیا ہے میں خود پریشان ہوں، چلئے چل کر سراغ لگائیں بیچارے لڑکے پر کیا گذری"۔ اس نے پریشان تیور بنا کر کہا اور دروغہ جی نے برجستہ سوال کیا۔

" کنور صاحب بندوقیں رائفلیں پستول تو سب یہ رکھے ہیں کیا وہ نہتا تعاقب کرتا چلا گیا ایسا پگلا ہے"۔

" کنور کو کوئی جواب بن نہ پڑا اور جھٹ سے دروغہ جی نے دوسرا سوال دے مارا۔

" اور آپ کی بیوی کہاں ہیں ؟"

اسے یہ بات تو سچ مچ بیچارے نہال رائے کو ہی کیا گھر بستی بھر میں کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ مگر اس نے بہت سنبھل کر کہا۔

" دروغہ جی آپ کے آنے سے ذرا دیر قبل پہنچا ہوں۔ مجھے حواس بھی درست نہیں کرنے ملے ہیں، پتہ نہیں کہ گھر میں ہیں یا نہیں "۔

" ذرا دریافت کر لیجئے ادھر جا کر، مجھے معاف کریں معاملہ حویلی کے اندر کا ہے ایک خاتون کا پس پردہ بیان لینا ضروری ہے اور شاید آپ کی دھرم پتنی تو پردہ بھی نہیں کرتی ہیں "

" جی کرتی بھی ہیں اور نہیں بھی کرتیں، بہر حال وہ اس وقت مل نہیں سکتیں۔ نہ عدالت کچہری میں جا کر ہمارے ہاں کی مستورات بیان دے سکتی ہیں " کنور نے ہونٹ چاٹ کر کہا۔ دروغہ جی تمام حالات کی روشنی میں معائنہ موقع کو خانہ تلاشی قرار دیا اور فرد تلاشی مرتب کی جس کی فہرست میں یہ مشتبہ حلوہ اور چند فرنگی چیزیں تحریریں اور بستی کے چند لوگوں کے بحیثیت گواہ فرد تلاشی دستخط لے لیے پوسٹ مارٹم کی رپوٹ نے معاملہ کو اور بھی زیادہ الجھا دیا، راجہ جی کے جسم سے چھ دانے ایل جی کے ولائتی کارتوس کے مع گتے اور نمدے کی ٹکیوں

کے ایک پہلو سے برآمد ہوئے اور دوسرے پہلو سے ایک بالکل عجیب سے سائز کی گولی جو دیسی ساخت کی بدبودار کالی بارود سے چلی ہوئی تھی برآمد ہوئی اور ڈاٹ کا کاغذ اور چیتھڑا نکلا ایسے کسی قسم کے ہتھیار کا کوئی سراغ سلامت رائے کے مکان میں نہ ملتا تھا ـــــ تیر تو اندھیرے میں چلا تھا مگر بیٹھا نشانہ پر صحیح۔" وہ نوکر چاکر کا چرایا یا بلی کا اٹھا کر لایا ہوا" حلوہ جب کیمیاوی جانچ کے لئے بھیجا تو اس میں نہایت ہی مہلک قسم کے زہر کی آمیزش پائی گئی ـــ یہاں معاملہ پیچیدہ تر ہوا مگر تفتیش کرنے والے کا ذہن ایک مخصوص طرزِ تحقیقات کی جانب گیا کیمیاوی ممتحن نے اس کے اثرات اور علامات ہیضہ سے بالکل ملتی جلتی بتائی تھیں اور اسی رات میں کنور الفت رائے کی بیوی ہیضہ کا شکار ہوئی تھی۔ تفتیش کے سلسلے میں الفت رائے کے خسر کے پاس پہنچے، وہ ٹھاکر بیٹی کی موت اور سمدھیانہ کے رویہ سے اس قدر تلخ ہو رہا تھا کہ ایک دفعہ کو باوجود پولیس آفیسر ہونے کے اللہ سے بہت ہی کینڈے کے ساتھ نرم انداز میں استفسارات کئے۔ اور جب تھوڑے سے اشتراکِ عمل کی درخواست کی تو ٹھاکر نے کہا۔

"درو غہ جی اب میرا وہاں کوئی تعلق باقی نہیں رہا"۔

اور جب ایک مرتبہ بر سبیل گفتگو الفت رائے کو "آپ کا داماد" کہہ کر پکارا تو کہا کہ

"درو غہ جی سرے اتا یاں کوڑے میں جائے یا نالی میں، میری لڑکی مر گئی کوئی جھنڈ میرا داماد اور سمدھی نہیں ہے"۔ یہ بیزاری دیکھ کر درو غہ جی نے کہا کہ آپ کو یقین ہے کہ

"آپ کو یقین ہے کہ آپ کی بیٹی ہیضہ سے مری ہے"۔ تو اس پر انہوں نے جواب دیا۔

"یقیناً۔ اور حکیم جی اس کی تصدیق کریں گے"۔

حکیم جی کا بیان لے کر پھر ٹھاکر کے پاس آئے اور ایک برتن دکھا کر بولے۔

"دیکھئے یہ برتن آپ کے یہاں کا ہے؟"۔

"جی ہاں میرے یہاں کا۔ پھر اُس سے آپ کیا نکالنا چاہتے ہیں"۔ ٹھاکر نے بیزاری سے جواب دیا۔

"مطلب یہ ہے کہ یہ برتن مع حلوے کے آپ کے سمدھیانہ سے تلاشی میں برآمد ہوا ہے اور اس میں جو حلوہ تھا وہ مسموم تھا"۔

"واہ بھئی واہ میرا اُن کے یہاں سمدھیانہ ہے، ہولی دیوالی دسہرہ تیر تہوار پر سینکڑوں چیزیں آتی ہی ہیں، اور ہمارے یہاں برتنوں کی واپسی کا تو کوئی رواج ہی نہیں ہے ممکن ہے کہ آپ صحیح کہتے ہوں سال بھر میں

پولیس گھس نہیں سکتی اگر سراغ لگانے میرے یہاں تک پہنچ گئے بھی تو ایسے رستہ پر ڈالوں گا کہ سیدھے فدا گنج کے بھوانرے جا پہنچیں فکر مت کرو۔ اب رہا وہاں پر تمہارے کھانے کا انتظام کہو تو میں تھوڑی دور پر میرے دوست مردان علی خاں روہیلے کا گاؤں ہے ان کے یہاں سے کرادوں یا روزانہ دونوں وقت گھاٹ سے اتر دو کر کہار کے چھوکرے کے ہاتھ اپنے یہاں سے بھجوا دیا کروں۔ دونوں صورتوں میں زیارت سے ایک گولی کے ٹپّہ پر جو ایک برگد کا درخت ہے کھانا اس کی شاخ میں ٹنگا ملا کرے گا۔ لیکن اگر تم نے وہاں سے کرایا تو راز میں ایک اور کو بھی شامل کرنا پڑے گا۔"

"کس کو؟"

"مردان علی خاں کو۔"

"ان کی فکر مت کرو، ان کا کام ہی یہ ہے اور کھرے پٹھان ہیں نہ نوابی پولیس سے ڈریں نہ یو۔پی پولیس سے مگر خیر جانے دو میں اپنا مہمان ان کو کیوں دے دوں، دونوں وقت کھانا میں تے پہنچا کرے گا میری طبیعت پر ہی گرانی کیا کم ہے کہ میں تم کو اپنے گھر میں نہیں ٹھہرا سکتا۔ اور اگر کوئی خاص خبر ملی تو وہ بھی۔ تم ادھر جاؤ اور کالج میں جا کر خبر لاؤں گا کہ کیا ہو رہا ہے مگر بھی چونکہ تم کو روپوش رکھنے میں میرا ہاتھ ہے لہٰذا کھل کر معاملہ میں پڑ کر کوئی خاص کام نہیں کرسکوں گا۔ ورنہ بھیا تم کو بھی کوئی فائدہ پہنچے گا نہیں اور میں بھی مصیبت میں پڑ جاؤں گا۔

"اجی فائدہ بلکہ جو رہی سہی مدد مل جاتی ہے اس سے بھی جاؤں گا۔" الفت نے کہا۔

"ہاں بھیا الفت تم سمجھدار آدمی ہو اور میں نے خلوص کے ساتھ تمہیں سب اونچ نیچ سمجھا دی اور کوئی ہوتا تو اتنی صاف بات نہ کرسکتا تھا، بات تو جب ہے کہ سانپ مرے لاٹھی نہ ٹوٹے۔"

انگریز کے ہاتھ کی لکھی ہوئی قانون کی کتاب میں میاں بیوی چاہے کتنے ہی راضی کیوں نہ ہوں اگر قاضی [illegible]نی نہیں تو کچھ نہیں ادھر پولیس اسٹیشن میں اندراج کرائی ہوئی رپورٹ اول ادھر ہسپتال میں مجسٹریٹ کے [illegible]روبرو دیئے ہوئے بیان نزاعی کی مطابقت کے باوجود پولیس انہیں لکیروں پر دونڈی بن پر دونڈی چلی آئی تھی [illegible] زندہ بھی جھوٹا!" اصل واقعہ یہ ہے جو فدوی نے اپنے روزنامچہ تفتیش میں تحریر کیا ہے"۔ اور لگے

نندی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے ـــ اور کبھی ایک سچ کو سچ ثابت کرنے کے لئے ایک ہزار ایک سوایک جھوٹ بولنے والے اور کبھی ایک جھوٹ کو سچ میں قلبِ ماہیت کرنے میں ایک گاڑی بھر سچے حلف اٹھانے والے فندی وقوعہ کی اطلاع پاکر معائنہ موقع کے لئے گھر پہنچے۔ کنور پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ وہ نہیں گے کیونکہ ان کا افسر دیرینہ وقوعہ کی اطلاع پاتے ہی ہسپتال پہنچ گیا تھا۔ لہٰذا لاش پوسٹ مارٹم سے واپس بھی نہ ملنے پائی تھی کہ یہ گھر پہنچ گیا تھا، گھر پہنچ کر بیوی غائب پائیں اور ماں قطعاً مخبوط الحواس جنون کے دورے میں مبتلا اسکو پہچان بھی نہ سکیں نہ کچھ حادثہ کا ہی احساس کر رہی تھیں بس بہکی بہکی باتیں کر رہی تھیں۔ داروغہ جی بڑے تجربہ کار پولیس آفیسر تھے اور کانسٹبل ہیڈ کانسٹبل کی سیڑھیاں چڑھتے اترتے ہر دس کی عمر کے آخری سالوں میں سب انسپکٹر کے عہدہ تک پہنچ کر کندن بن گئے تھے سو گئے تو معائنہ موقع کے نام سے تھے مگر وہاں پہنچ کر قانونی ردّیہ کچھ خانہ تلاشی جیسا بنایا تو کنور نہال رائے کا ماتھا ٹھنکا کیونکہ انہوں نے زنانہ مکان میں عین جائے وقوعہ پر جانے سے پیشتر باہر دروازہ پر اپنی اور اپنے کانسٹبلوں کی جامہ تلاشی دی اور باضابطہ اس کی فرد مرتب کی تب اندر قدم رکھا اور اندر پہنچ کر سب سے پہلے اپنی جیب سے ایک فہرست نکال کر نام بہ نام جتنے بندوقوں اور پستولوں کے لائسنس ان تینوں باپ بیٹوں کے نام تھے نکلوا کر جملہ ہتھیار سامنے رکھ لئے اور ہر ایک کا سرسری معائنہ کیا ـــ ادھر باوجود تمام تر بدحواسی کے روایاتی کایستھ کھوپڑی کا پنڈ ورنہ پورے نظم ضبط سے نہایت تیزی اور تناسب کے ساتھ چل رہا تھا گھر کے اندر اپنی گڑی ہوئی کہانی کا چپہ چپہ دکھا کر بڑی خوبصورتی کے ساتھ سچ ثابت کی اور موقع کے ساتھ موقع کے گواہان سے تائید کرا دی۔ بظاہر پولیس کو کوئی گنجائش نہ تھی کچھ سوال تھے جن کا شاید ابھی موقع نہ تھا اور نہ تو نہال رائے کو ہی خیال تھا کہ یہ کیسے سجائیں گے۔ مگر خون ناحق تو سر پر چڑھ کر پکارتا ہے۔ ویسے تو رست خیز کی گھڑی میں بھی یہ دیوانہ اتنا فرزانہ رہا تھا کہ خالی کارتوس تک ضائع کر دیا تھا مگر وہ حلوہ کی پوٹلی نہ اس کے ذہن میں آئی اور نہ اس نے اس کو تلاش کیا حالانکہ کواڑ کی آڑ سے کسی مسموم قسم کے پرشاد کا بار بار حوالہ اس کے کان میں پڑتا رہا تھا۔ چلتے پھرتے یہ بس کی پڑیا کسی کانسٹیبل کو صحن کے کسی گوشے میں پڑی مل گئی اس نے مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر چپکے سے دبالی اور آنکھ بچا کر اپنے افسر کے حوالہ کر دی اور ایسے موقع پر تو بال بال کو پولیس شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس کے متعلق نہال رائے سے سوال کیا اور نہال رائے دیکھتے ہی تاڑ گیا کہ یہ وہی مسموم پرشاد ہے جس کا بات حوالہ بار بار ان دونوں کے درمیان آتا تھا۔ اس نے بات کو ہلکا کرنے کے لئے سادگی کے ساتھ کچھ اجنبیت کا انداز بنایا۔

راجندر سنگھ بیدی

کلیانی

اب اسے ان کالی، بھوری راہوں پہ چلنے سے کوئی ڈر نہ آتا تھا، جہاں بے شمار
گڑھے تھے جن میں کالا پانی، بمبئی کے اس صنعتی شہر کی میل ہمیشہ جمع رہتی تھی اور کبھی تہ پہ نہ
بیٹھتی۔ بے شکل سے پتھر، ادھر اُدھر جیسے شوقیہ پڑے تھے ــــ بیکار، آخری روڑا ہونے کے لئے۔
۔۔۔ ورد ــــ شروع کے دن، جب ٹانگیں کانپتی تھیں اور ٹھنکے بھی روکنے میں کامیاب
۔۔۔ جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گلی کے موڑ پہ دیسی صابن کے بڑے بڑے چاک بنانے
والا اور اس کے پڑوس میں کا حجام دیکھ رہے ہیں اور برابر ہنس رہے ہیں۔ کم سے کم روٹھی نہیں
۔۔۔ رہے ہیں۔ پھر باجو' کا کوئیلے والا، جو آپ تو شاید اس چکلے میں کبھی نہ گیا تھا، اس پہ بھی اس
۔۔۔ کا منہ کالا تھا .....

۔۔۔ لنگل میں پہلے' مالے' پہ کا ب تھی، جہاں چوری کی رم ملتی تھی اور یاری کی رمی ـ
۔۔۔ ن کی کھڑکیاں کسی یوگی آنکھوں کی طرح سے باہر کی بجائے اندر، من کے چکلے میں کھلتی تھیں
اور ان میں سے سگریٹوں کے دھوئیں کی صورت میں آہیں نکلتی تھیں۔ لوگ یوں تو جوئے میں
۔۔۔ سیکڑوں کے ہاتھ دیتے تھے، مگر سگریٹ ہمیشہ گھٹیا پیتے ــــ بلکہ بیڑی، صرف بیڑی،
۔۔۔ ن کا جوئے کے ساتھ وہی تعلق ہوتا ہے جو پنسلین کا آتشک سے ..... یہ کھڑکیاں اندر
کی طرف کیوں کھلتی تھیں؟ نہ معلوم کیوں؟ مگر کوئی خاص فرق نہ پڑتا تھا کیونکہ اندر کے
۔۔۔ ن میں آنے والے مرد کی صرف چھایا ہی نظر آتی جس سے معاملہ پٹاتی ہوئی لڑکی اسے اندر
۔۔۔ جاتی، بٹھاتی اور ایک بار ضرور باہر آتی ــــ نل پہ سے پانی کی بالٹی لینے، جو صحن کے
۔۔۔ ن بیچوں بیچ لگا ہوا تھا اور دونوں طرف کی کھولیوں کی طرح طرح کی ضرورتوں کے لئے

کافی تھا۔ پانی کی بالٹی اٹھانے سے پہلے لڑکی ہمیشہ، ہمیشہ اپنی دھوتی ساری کو کمر میں کستی اور گاہک لگ جانے کی اکثر میں کوئی نہ کوئی بات اپنی ہم پیشہ بہن سے ضرور کہتی ــــ اے گرجا! میرا چاول دیکھ لینا، میرے کو گاہک لگا ہے ..... پھر وہ اندر جاکر دروازہ بند کرلیتی۔ تبھی گرجا سندری سے کہتی ــــ کلیانی میں کیا ہے ری، آج اسے دوسرا کسٹر لگا ہے؟ لیکن سندری کی بجائے جاڑی یا کھرسید، جواب دیتی ــــ اپنی اپنی کسمت ہے نا ..... تبھی کلیانی والے کمرے سے زنجیر لگنے کی آواز آتی اور بس۔ سندری ایک نظر بند دروازے کی طرف دیکھتی اور اپنے سنے ہوئے بالوں کو چھانٹتی، تولئے سے پونچھتی ہوئی گنگنانے لگتی ــــ رات جاگی رے بلم، رات جاگی . . . . . اور پھر ایکا ایکی گرجا سے مخاطب ہو اٹھتی ــــ اے گرجا! کلیانی کے چاول اُبل رہے ہیں۔ دیکھتی نہیں کیسی گڑگڑ کی آواز آرہی ہے اس کے برتن سے؟ اور پھر تینوں چاروں لڑکیاں مل کر ہنستیں اور ایک دوسری کے کولھے میں چپے دینے لگتیں تبھی گرجا بلبلا اٹھتی اور کہتی ــــ انیا جور سے کیوں مارا، رنڈی جانتی ہے، ابھی تک دکھ رہا ہے میرا کھول؟ کان کو ہاتھ لگایا، بابا! میں تو کیا میری آل اولاد بھی کبھی کسی پنجابی کے ساتھ نہ بیٹھے گی۔ پھر گرجا بغل کی کھولی میں کسی چھوکری کو آواز دیتی:

گنگی، ترا پویت کیا بولتا ہے؟

گنگی کی شکل تو نہ دکھائی دیتی، صرف آواز آتی ــــ میرا پویت بولتا، بھج من رام بھج من رام .....

ــــ مطلب گنگی کو یا تو سر میں ہے اور یا پھر کوئی کسٹمر نہیں لگا۔

مہی پت لال اب کے مہینوں کے بعد ادھر آیا تھا۔ بیچ میں منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے وہ یہاں سے کچھ ہی فرلانگ دور ایک نیپالی لڑکی چونی لا کے پاس چلا گیا تھا اور اس کے بعد چھیانوے نمبر کی ایک کرسچین چھوکری میں پھنس گیا جس کا اصلی نام تو کچھ اور تھا لیکن ہال کی دوسری لڑکیاں اور دلال اسے اولگا کے نام سے پکارتے تھے۔ ادھر کلیانی کو کچھ پتہ بھی نہ تھا، کیونکہ اس دھندے میں تو دو چار مکانوں کا فاصلہ بھی سیکڑوں میل کا ہوتا ہے۔ لڑکیاں زیادہ سے زیادہ پکچر دیکھنے کو نکلتی تھیں اور پھر واپس ..... جس منہ کا ذائقہ بدلنے

درجنوں چھوٹے بڑے برتن ان کے یہاں میرے یہاں سے پہنچ جاتے ہیں۔" اور داروغہ جی یہ دیکھ کر کہ ٹھاکر کچھ سوچ میں پڑ گیا ذرا ابھر کر بولے۔

"تو پھر یہ کام آپ کے حجام انجام دیتے ہوں گے؟"

"بالکل"۔

"کون کون حجام ہیں؟"

"ویسے بڑا سامان اور خاص خاص چیزیں اور پیغام تو لیکھ کے حجام جن کی میرے یہاں مجمانی ہے لے جاتے ہیں چھوٹے موٹے پیاموں اور ایسی ویسی چیزیں ایک مستقل حجام کا چھوکرا ملازم ہے ایسے کام وہ انجام دیتا ہے"

"دیکھئے میں ذرا اس حجام کے چھوکرے سے کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں ذرا بلوا دیجئے"!

ٹھاکر کچھ گو مگو میں پڑ گیا اور حجام کا چھوکرا پیش کر دیا، لونڈا ویسے تو بڑا عیار اور حرفوں کا بنا ہوا تھا، مگر برتن اور کپڑا دیکھ کر تھانہ دار کے سوال کا جواب دیا۔

"ہاں بٹیا جی نے اس میں پرشاد کا حلوہ باندھ کر جیجا جی کے لئے کنہیا آٹھیں (جنم اشٹمی) کا برتو کھولنے کو بھیجا تھا، اور میں انہیں وہ بستی سے باہر ہی مل گئے تھے دے آیا تھا"۔

"مگر یہ پرشاد کہاں سے آیا تھا"؟

"آتا کہاں سے گھر میں، رسوئی میں بٹیا جی نے پاکھ بنایا ہو گا"۔

اور اب معاملہ مزید الجھا، وہ چھوکرا بھگت جی کے راز کو گھر تک خفیہ لانے اور ان کے منتر کے زور سے دیر جی کو قابو کر کے ان کی ضد سے باز رکھنے تک محدود سمجھتا تھا۔ یہ پرشاد تو بھگت جی ایک روز صبح تڑکے چپکے سے تاروں کی چھاؤں وہی مویشی خانہ والا دروازہ کھٹکھٹا کر خود ہی دے گئے تھے اور پدمنی اور اس کی ماں کے سوا کسی کو اس کی کانوں کان خبر بھی نہ تھی کہ یہ آنے والا ہے یا آگیا ہے۔ اب داروغہ جی نے ٹھاکر سے کہا کہ۔

"ہم اس چھوکرے کو تھانے تک لے جائیں گے اور وہاں ایک آدمی کی شناخت کرا کر سہ پہر تک واپس کر دیں گے، آپ اطمینان رکھیں کہ کوئی سختی نہ کریں گے"۔

ٹھاکر کا جی تو نہ چاہتا تھا کہ اپنے ملازم کو ان کے ساتھ بھیجیں مگر شاید کچھ دل کی گہرائیوں میں کچھ مصلحت ابھر رہی تھی پھر تھانہ دار کا حکم ہوتے ہوئے خوشامدانہ لہجے کے ساتھ کر دیا۔

عمر میں پہلی مرتبہ پولیس کے پنجہ اور تھانے کی چار دیواری میں پہنچ کر چھوکرا سب ہیکڑی بھول گیا، اور

ساری عیاری و تمانی دھری رہ گئی۔ داروغہ جی نے اُس کو ایک گرگ باراں دیدہ ہیڈ کانسٹیبل کے سپرد کردیا جس نے تھوڑی دیر میں کہیں پر دلیری اور دھمکی اور کہیں پر فریب اور پچکاری کے ذریعہ بھگت جی کے خفیہ طور پر آنے اور منتر وغیرہ کرنے کا حال معلوم کرلیا اور کٹیا کا پتہ بھی معلوم کرلیا اور شام ہوتے ہوتے بھگت جی اور نہال رائے دونوں کو شبہ کی بنا پر حراست میں لے لیا اور چھو کرا بیک بینی و دو گوش مع دعدہ سپتر یک واپس کردیا۔

نہال رائے سے تو بات ہی نہ کی اور سیدھا جیل کی حوالات بھیجدیا اور بھگت جی کو عدالت سے ریمانڈ لے کر بیس روز تھانہ میں رکھا اور ان دس دن میں استفسار کے سلسلے میں زبانی اور عملی کوئی ترکیب باقی نہ رکھی جو کرنہ چھوڑی ہو اخاص ہٹے کٹے تھے مرغا بنانے لٹکانے کے لیے۔ جب بات نہ اگلی تو مار پیٹ کی کوئی حد ہی نہ رہی، جب یہ بے اثر پائی تو کئی راتوں جگایا۔ جب اُس سے بھی مطلب براری نہ ہوئی تو سیروں برف باریک چٹیل کچل کر چڑھادیا، اور جب ٹھنڈے سے کام نہ چلا تو مرچوں کی دھونی دی اور جب سالم مرچوں کی دھونی سے بھی کچھ نہ بتایا تو باریک پسوا کر منہ پر تو بڑا چڑھایا، غرض داروغہ جی اور دیوان جی نے اقرار و اقبال جرم کے جتنے داؤ پیچ اور نرم گرم حکمتیں اپنے اپنے استادوں سے سیکھی تھیں سب ہی ایک ایک کرکے آزما چھوڑیں مگر وہ ایسی پکی گولیاں کے کھیلے کب تھے۔ انہیں خوب احساس تھا کہ اپنے منہ سے ایک لفظ نکالنا موت کی چاپ سننا ہے۔ سب اُٹھ گئے آخر کار جھک مار کر پولیس نے انہیں بھی جیل کی حوالات میں بھیجدیا۔ مسلسل

میڈم کو ایک ٹائیم کے پیسے دینے اور اپنے حصے کے پانچ لے کر رکھنے، اندر کے دروازے کی طرف سے اور بھی اندر چلی گئی۔ مہی پت کو جلدی تھی وہ بے صبری سے درگا میاّ کی تصویر کو دیکھ رہا تھا جو شیر پہ بیٹھی تھی اور جس کے پاؤں میں راکھشس مرا پڑا تھا۔ درگا کی درجنوں بھجائیں تھیں جن میں سے کسی میں تلوار تھی اور کسی میں برچھی اور کسی میں ڈھال۔ ایک ہاتھ میں کٹا ہوا سر تھا، بالوں سے تھاما ہوا۔ اور مہی پت کو معلوم ہو رہا تھا، جیسے وہ اس کا اپنا سر ہے۔ لیکن درگا کی چھاتیاں اس کے کولھے اور رانیں بنانے میں مصور نے بڑے جبر سے کام لیا تھا۔ دیواریں ٹوٹی ہوئی تھیں وہ کوئی بات نہ تھی لیکن ان پہ پکی ہوئی سیل اور اس میں گدمڈ کائی نے عجیب بھیانک سی شکلیں بنا دی تھیں، جن سے طبیعت بیٹھ بیٹھ جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیواریں نہیں، تبن اسکرول ہیں، جن پر نرک اور سورگ کے نقشے بنے ہیں۔ گنہگاروں کو اژدھے ڈس رہے ہیں اور شعلوں کی لپلپاتی ہوئی زبانیں انہیں چاٹ رہی ہیں۔ پورا سنسار کال کے بڑے بڑے دانتوں اور اسکے کھوہ ایسے منہ میں پڑا ہے۔

—— وہ ضرور نرک میں جائے گا —— مہی پت ... . جانے دو!

کلیانی لوٹی اور لوٹتے ہی اسنے اپنے کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔

یہ کھیل، مرد اور عورت کا —— جس میں عورت کو اذیت نہ بھی ہو، تو بھی اس کا ثبوت دینا پڑتا ہے اور اگر ہو تو مرد اسے نہیں مانتا۔

مہی پت پہلے تو ایسے ہی کلیانی کو نوچتا کاٹتا رہا۔ پھر وہ کود کر پلنگ سے نیچے اتر گیا۔ وہ کلیانی کو نہیں کائنات کی عورت کو دیکھنا چاہتا تھا، کیونکہ کلیانیاں تو آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ مہی پت بھی آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، لیکن عورت وہیں رہتی ہے اور مرد بھی۔ کیوں؟ یہ سب کچھ سمجھ میں نہیں آتا، حالانکہ اس میں سمجھ کی کوئی بات ہی نہیں۔

ایک بات ہے۔ ست جگ، دواپر اور ترتیا جگوں میں تو پورا نیائے تھا۔ پھر بھی عورتیں

محبت ہیں کیوں چوری کرجاتی تھیں؟ جب گنگا، ولیشیا کیوں تھیں؟ آج تو اینٹے ہے۔
پگ پگ پہ اپنائے، پھر انہیں کیوں روکا جاتا ہے؟ کیوں ان پہ قانون لگائے جاتے ہیں؟
جو روپیہ ٹکسال سے آتا ہے اس کی قیمت آٹھ آنے رہ جاتی ہے۔ افلاس اور دافریپے
کے میل جول کی جتنی ضرورت آج ہے، تاریخ میں کبھی ہوئی ہے؟ ..... دبالیں اسے تاکہ گھر
کی لکشمی باہر نہ جائے۔ مگر دولت، پیسہ تو BITCH GODDESS ہے' وہ کتیا
جو پہ آئے گی تو جائے گی ہی .....

مہی پت کو الجھاوے کی ضرورت تھی، اسی لئے اسے کائنات کی عورت کے بیچ دھنسم
کھا گئے۔ اسنے ایک بیرؔ کے لئے کہا، لیکن اس سے پہلے کہ کلیانی کا کالا مرد اٹھ کر لڑکے کو
آواز دے' وہ خود ہی بول اُٹھا —— رہنے دو' اور اس نظارے کو دیکھنے لگا جو نشے سے بھی زیادہ
تھا۔ پھر جانے کیا ہوا، مہی پت نے جھپٹ کر اتنے زور سے کلیانی کی ٹانگیں الگ کیں کہ وہ
بلبلا اٹھی۔ اپنی بربریت سے گھبرا کر مہی پت نے خود ہی اپنی گرفت ڈھیلی کردی۔ اب کلیانی
پلنگ پہ پڑی تھی اور مہی پت گھٹنوں کے بل نیچے فرش پہ بیٹھا ہوا تھا اور اپنے منہ میں
زبان کی نوک بنا رہا تھا ..... کلیانی لیٹی ہوئی اوپر چھت کو دیکھ رہی تھی، جہاں پنکھا
جالے میں لپٹا ہوا، ایک آہستہ رفتار سے چل رہا تھا۔ پھر ایکا ایکی کلیانی کو کچھ ہونے لگا۔
اس کے پورے بدن میں مہی پت اور اس کی زبان کے کارن ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔
اور وہ اس چیونٹے کی طرح سے تلملانے لگی' جس کے سامنے بے رحم بچے جلتی ہوئی ماچس
رکھ دیتے ہیں .....

جبھی اپنے آپ سے گھبرا کر مہی پت اوپر چلا آیا۔ اس کے بدن میں بے حد
تناؤ تھا' اور بجلیاں تھیں، جنہیں وہ کیسے بھی جھٹک دینا چاہتا تھا اسکے ہاتھوں کی
پکڑ اس قدر مضبوط تھی کہ جابر سے جابر آدمی اس سے نہ نکل سکتا تھا۔ اسنے ہانپتی
ہوئی کلیانی کی طرف دیکھا۔ اسے یقین ہی نہ آرہا تھا کہ ایک پیشہ ور عورت کی چھاتیوں
کا وزن بھی ایکا ایکی بڑھ سکتا ہے اور ان پہ کے حلقے اور دانے پھیل کر اپنے مرکز' ابھر
ہوئے مرکز کو بھی معدوم کر سکتے ہیں۔ ان کے ارد گرد اور کولھوں اور رانوں پر ستیلا

کے لئے مہی پت دوسری لڑکیوں کے پاس چلا گیا تھا، اسی کے لئے اس اڈے پہ لوٹ آیا لیکن یہ بات طے تھی کہ اتنے مہینوں کے بعد وہ کلیانی کو بھول چکا تھا۔ حالانکہ 'مُکُٹ' جانے کے لئے اس نے کلیانی کو دو سو روپے بھی دیئے تھے۔ تب شاید نشے کا عالم تھا، جیسا کہ اب تھا۔ بیئر کا پورا کیگ پی جانے کے کارن مہی پت لال کے دماغ میں کسی اور ہی عورت کی تصویر تھی اور وہ بھی نامکمل۔ کیونکہ اسے مکمل تو مہی پت ہی کو کرنا تھا۔۔۔ ایک مصور کی طرح سے جو کہ مرد ہوتا ہے اور تصویر جو کہ عورت ہوتی ہے . . . . .

اندر آتے ہی مہی پت نے صحن کے پہلے پیراپٹ کو پھلانگا۔ تین چار سیڑھیاں نیچے اُترا۔۔۔ لوگ سمجھتے ہیں پاتال، نرک کہیں دُور، دھرتی کے اندر ہیں۔ لیکن نہیں جانتے کہ وہ صرف دو تین سیڑھیاں نیچے ہیں۔ وہاں کوئی آگ جل رہی ہے اور نہ اُبلتے، کھولتے ہوئے کنڈ ہیں۔ ہو سکتا ہے سیڑھیاں اترنے کے بعد پھر اسے کسی اوپر کے تھڑے پہ جانا پڑے، جہاں سامنے دوزخ ہے، جس میں ایسی ایسی اذیتیں دی جاتی ہیں کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

سیڑھیاں اترنے کے بعد صحن میں پاؤں رکھنے کی بجائے مہی پت لال کھولیوں کے سامنے والے تھڑے پہ چلا گیا کیونکہ پکا ہونے کے باوجود صحن میں ایک گڑھا تھا، جس میں ہمیشہ، ہمیشہ پانی جمع رہتا تھا۔ برس ڈیڑھ پہلے بھی یہ گڑھا ایسا تھا اور اب بھی ایسا ہی۔ لیکن گڑھے کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ اس کا پتہ ہو۔ اوپر صحن کے کھلے ہونے کی وجہ سے دشمی کا چاند گڑھے کے پانی میں جھلملا رہا تھا، جیسے اُسے میل، سرسبل کے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ نل سے پانی کا چھینٹا اس پہ پڑتا تو چاند کی چھبی کانپنے لگتی۔ پوری کی پوری . . . . .

کچھ گاہک لوگ گرجا، سندری اور جاڑی کو یوں ٹھونک بجا کے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کچے پکے گھڑے ہوں۔ ان میں سے کچھ اپنی جیبیں ٹٹول رہے تھے۔ مستری جاڑی کے ساتھ جانا چاہتا تھا کیونکہ وہ گرجا، سندری، گھرسینے سے زیادہ بدصورت تھی مگر تھی آدھا اینٹ کی دیوار۔ حیرانی تو یہ تھی کہ لڑکیوں میں سے کسی کو حیرانی نہ ہو رہی تھی۔ وہ مرد ذات کے پاگل پن کو اچھی طرح سے جانتی تھیں۔ مہی پت نے سندری کو دیکھا جو دیسے تو کالی تھی، مگر عالم کو نکی عورتوں

کی طرح تیکھے نقش نینوں والی۔ پھر کمر سے نیچے اس کا جسم 'باپ رے' ہو جاتا تھا تبھی مہی پت کے کرتے کو کھینچ پڑی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو سامنے کلیانی کھڑی تھی اور ہنستے ہوئے اپنے دانتوں کے موتی رول رہی تھی۔ مگر ـــ وہ دبلی ہو گئی تھی۔ کیوں؟ نہ معلوم کیوں؟ چہرہ یوں لگ رہا تھا جیسے دو آنکھوں کے لئے جگہ چھوڑ کر کسی نے ڈھولک پہ چمڑہ مڑھ دیا۔ چونکہ عورت اور تقدیر ایک ہی بات ہے، اس لئے مہی پت کلیانی کے ساتھ تیسری کھولی میں چلا گیا۔

کلب گھر کی کھڑکی میں سے کسی نے جھانکا اور اوبھ کر لیاطا الٹ دی۔ کلیانی نے باہر آ کر نل پہ بالٹی بھری، دھوتی کو کمر دکسا اور آواز دی ـــ ادگر جا، تھوڑا اسہارا گھڑی سنبھالنا ..... اور پھر وہ پانی لے کر کھولی میں چلی گئی ......

پاس کی کھولی سے میڈم کی آواز آئی ـــ ایک ٹیم کا، دو ٹیم کا ہے۔

اندر، کلیانی نے مہی پت کو آنکھ ماری اور میڈم والی کھولی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی ـــ ایک ٹیم۔ اور پھر اس نے پیسوں کے لئے مہی پت کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا، جسے پکڑ کر مہی پت اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ پھر اٹھ کر اس نے پان سے بٹی، لال لال مہری کلیانی کے ہونٹوں پہ لگا دی جسے دھوتی کے پلو سے پونچھتی ہوئی وہ ہنسی ـــ اتنے بے صبر؟

اور پھر ہاتھ پھیلا کر کہنے لگی ـــ تم ہم کو تیس روپیہ دے گا، پر ہم میڈم کو ایک ہی ٹیم کا بولے گا۔ تم بھی اسکو نہیں بولنے کا ـــ آں؟

مہی پت نے ایسے ہی سر ہلا دیا ـــ آں۔

بدستور ہاتھ پھیلائے ہوئے کلیانی بولی ـــ چلی نکال۔

پیسے؟ ـــ مہی پت بولا۔

کلیانی نے اب کے رسم نہیں ادا کی، وہ سچ مچ ہنس دی۔ نہیں، وہ شرما گئی۔ ہاں، وہ دھندا کرتی تھی۔ اور شرماتی بھی تھی۔ کون کہتا ہے، وہاں عورت عورت نہیں رہتی؟ وہاں بھی حیا اس کا زیور ہوتا ہے اور حربہ جس سے وہ مرتی ہے اور مارتی بھی۔ مہی پت نے تیس روپے نکال کر کلیانی کی ہتھیلی پہ رکھ دیئے۔ کلیانی نے ٹھیک سے انہیں گنا بھی نہیں۔ اس نے تو بس پیسوں کو چوما، سر اور آنکھوں سے لگایا، بھگوان کی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑے اور

نہیں، جانور ہوں، وحشی ہوں ..... مگر، اور بیس روپے؟ پھر رونے کی کیا ضرورت تھی، آنسو بہانے کی؟ ویسے ہی مانگ لیتی تو کیا میں انکار کر دیتا؟ ..... جانتی تھی ہے، میں پیسے سے انکار نہیں کرتا۔ در اصل انکار مجھے آتا ہی نہیں۔ اسی لئے تو بھگوان کا سوشکر کرتا ہوں کہ میں عورت پیدا نہیں ہوا، ورنہ ــــ میں تو یہاں منہ مانگے دام دینے کا قائل ہوں، جس سے پھر گناہ کا احساس نہیں ہوتا۔ ایسے ہی آدمی کا تو انتظار کیا کرتی ہیں یہ ــــ اور جب وہ آتا ہے تو اس سے جھوٹ بولنے اسکے کپڑے اتارنے سے بھی نہیں چوکتیں ..... کہتی ہیں، میں نے سوچا تھا تم منگل کو ضرور آؤ گے ..... منگل کو کیا ہے بھائی؟ ..... منگل کو میں نے بھگوان سے پرارتھنا کی تھی! ..... یہ رونا ..... شاید سچی روئی ہو ــــ میں نے بھی تو ایک اندھے کی طرح سے کہیں بھی چلنے دیا اپنے آپ کو۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ تاؤ کتنا اچھا تھا ..... مگر میں نے جو اذیت دی ہے اسے، اس سے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ ہے ــــ دے دو روپے۔ مگر کیوں؟ پہلے ہی میں نے اسے دو ٹیم کے پیسے دیئے اور ایک ہی ٹائیم بیٹھا .....

مہی پت کے حیص بیص کو دیکھ کر کلیانی نے کہا ــــ کیا سوچنے کو لگ گیا؟ دے دو نا میرا بچہ تم کو دعا دے گا۔ .....

تیرا بچہ؟!

ہاں ــــ تم نہیں دیکھا؟

نہیں ..... کہاں، کس سے لیا؟

کلیانی ہنس دی۔ پھر وہ لجا گئی۔ اسپہ بھی بولی ــــ کیا مالم کس کا؟ میرے کو سکل تھوڑا دھیان میں رہتا؟ کیا کھبر تمہارا ہو ــــ

مہی پت نے گھبرا کر کرتے کی جیب سے بیس روپے نکال کر کلیانی کے ہاتھ پر رکھ دیئے، جو ابھی تک برہنہ کھڑی تھی اور جس کی کمر اور کولھوں پہ پڑا ہوا چاندی کا پٹکا چمک رہا تھا۔ ایک ہلکا سا ہاتھ کلیانی کے پیچھے تھپتھپاتے ہوئے مہی پت نے کچھ اور سوچ لیا۔ کلیانی نے ساری پکڑ کر لپیٹی ہی تھی کہ وہ بولا ــــ اگر ایک ٹائیم اور بیٹھ جاؤں تو؟ (پیسے دے دیئے ہیں)

بیٹھو ــــ کلیانی نے بنا کسی جھجک کے کہا اور اپنی ساری اتار کر پلنگ پہ پھینک دی۔

چلّوں چلُوں کرتا ہوا اس کا گوشت سب مار بھول چکا تھا عقل حیوانی سے بھی تجاوز کر چکا تھا...
لیکن مہی پت نے سر ہلا دیا ـــ اب دم نہیں رہا!
ہوں ـــ کلیانی نے کہا ـــ بہت جن آنا میرے ادھر، پر تم سا کڑک ہم نہیں دیکھا سچی ـــ تم جاتا تو بہت دن یہ (ناف) ٹھکانے پہ نہیں آتا۔
..... چاند گڑھے پر سے سرک گیا تھا۔ کوئی بالکل ہی لیٹ جائے تو اسے دیکھ پائے۔ تبھی کلیانی مہی پت کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس کمرے میں لے آئی، جہاں گرجا، سندری، جاڑی وغیرہ تھیں۔ جاڑی مستری اور اس کے بعد ایک بوہرے کو بھی بھگتا چکی تھی۔ ایک سردار سے جھگڑا کر چکی تھی۔ جب مہی پت آیا تو اس نے 'گھر سید' کے کہنی ماری اور بولی ـــ آیا' کلیانی کا مَرد.....
ـــ اس لئے کہ پہلے جب مہی پت ادھر آیا تھا تو ہمیشہ کلیانی ہی کے پاس۔
کلیانی کے ساتھ کھولی میں آتے ہوئے، مہی پت نے باتھ روم کے پاس پڑی ہوئی گھٹری کو دیکھا جس کے پاس بیٹھی ہوئی گرجا اپنے پلو سے اسے ہوا کر رہی تھی۔ کلیانی نے گھٹری کو اٹھا لیا اور مہی کے پاس لاتے ہوئے بولی ـــ
دیکھو، دیکھو، میرا بچہ.....
مہی پت نے اس لجلجے، چار پانچ مہینے کے بچے کی طرف دیکھا، جسے گود میں اٹھائے کلیانی کہہ رہی تھی ـــ اِسی ملکٹ کو پیدا کرنے، دودھ پلانے سے ہم یہ ہو گیا۔ کھانے کو کچھ ملتا نہیں نا، ـــ اس پہ تم آتا تو ـــ
پھر ایکا ایکی مہی پت کے کان کے پاس منہ لاتے ہوئے کلیانی بولی ـــ سندری کو دیکھتا؟
تم بولے گا تو اگلے ٹیم ہم سندری کو لا دے گا..... نہیں نہیں، پرسوں ہم آپی اچھا ہو جائے گا۔ یہ سب جگہ بھر جائے گا نا..... اور کلیانی نے اپنی چھاتی اور اپنے کولھوں کو چھوتے ہوئے کہا ـــ یہ سب، جن سے تم اپنا ہاتھ بھرتا، اپنا باجو بھرتا۔ ٹھیک ہے۔ کچھ ہاتھ میں بھی تو آنا مانگتا۔ سندری کو لینا ہوئیں گا، تو میرے کو بولنا۔ ہم سب ٹھیک کر دے گا۔ پر تم کو آنے کا میرے پاس۔ گرجا کے پاس نہیں آنے کا۔ او چھنار اُدوں آں بوت کرتا، بوت نخرا اس کا..... اور پھر بچے کو اپنے بازوؤں میں جھلاتے ہوئے کلیانی بولی ـــ ہم اس کا نام اُچھی رکھا۔

ے داغ اُبھر سکتے ہیں۔ اپنی وحشت میں وہ اس وقت کائنات کی عورت کو بھی بھول
یا۔ اور مرد کو بھی۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہ رہا کہ وہ خود کہاں ہے اور کلیانی کہاں؟
کہاں ختم ہوتا ہے اور کلیانی کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ وہ اس قاتل کی طرح سے تھا جو
ہت پر سے کسی کو دھکیل دیتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے تاکہ اتنی بلندی سے گر کر وہ بیان
ینے کے لئے بھی زندہ نہ رہے گا اور وہ اس پہ خودکشی کا الزام لگا کر خود بچ نکلے گا۔ ایک وحشت
ے ساتھ اسنے اپنے پورے بدن کلیانی پہ پھینکنا شروع کر دیا۔

ایک دلدوز سی چیخ نکلی اور بلبلاہٹ سنائی دی۔ پیپل اور کائی سے پٹی دیواروں
پیڑوں کے پر اپنی بڑی بڑی پرچھائیں ڈال رہے تھے۔ جانے کس نے پنکھے کو تیز کر دیا تھا؟
ی پت پسینے سے شرابور تھا اور شرمندہ بھی، کیونکہ کلیانی رو رہی تھی، کراہ رہی تھی، یا وہ
یک عام کسبی کی طرح سے گاہک کو لات مارنا نہ جانتی تھی اور یا پھر وہ اتنے اچھے گاہک کو
کھو دینے کے لئے تیار نہ تھی۔

سرہانے میں منہ چھپائے، کلیانی الٹی لیٹی ہوئی تھی اور اسکے شانے پھڑکتے ہوئے
دکھائی دے رہے تھے۔ تبھی مہی پت ایک پل کے لئے ٹھٹک گیا۔ پھر آگے بڑھ کر اسنے کلیانی
کے چہرے کو ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی، مگر کلیانی نے اسے جھٹک دیا۔ وہ سچ مچ رو رہی
تھی۔ اسکے چہرے کو تھامنے میں مہی پت کے اپنے ہاتھ بھی گیلے ہو گئے تھے۔ آنسو تو اپنے آپ
نہیں نکل آتے۔ جب جبر اور بے بسی خون کی ہولی کھیلتے ہیں، تبھی آنکھیں چھان پھٹک کر
اس لہو کو صاف کرتی ہوئی چہرے پہ لے آتی ہیں۔ اگر اسے اپنے ہی رنگ میں لے آئیں تو
ایسا میں مرد دکھائی دے نہ عورت۔

کلیانی نے پھر اپنا چہرہ چھڑا لیا۔

مہی پت پہلے صرف شرمندہ تھا، پھر سچ مچ شرمندہ تھا۔ اسنے کلیانی سے معافی
نگی، پھر مانگی اور مانگتا ہی چلا گیا۔ کلیانی نے پلنگ کی چادر سے آنکھیں پونچھیں اور بے بسی
سے مہی پت کی طرف دیکھا۔ پھر وہ اٹھ کر دونوں بازو پھیلاتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ اس
کی چوڑی چکلی چھاتی پر اپنے گھنگھریالے بالوں والا کونگی سر رکھ دیا۔ پھر اس کی گھگھی بندھ

گئی جس سے نکالنے میں مہی پت کو اور بھی تلذذ کا احساس ہوا ___ اور کلیانی کو بھی۔ اسنے اپنے گھاتک ہی کی پناہ ڈھونڈلی۔ مرد تو مرد ہوگا ہی، باپ بھی تو ہے، بھائی بھی تو ہے..... عورت عورت ہی سہی مگر وہ بیٹی بھی تو ہے، بہن بھی تو ہے .....

___ اور ہاں .....

مہی پت کی آنکھوں میں بیچ بیچ کے پچھتاوے کو دیکھتے ہی تصویر الٹ گئی۔ اب اس کا سر کلیانی کی چھاتی پر تھا اور وہ اسے پیار کر رہی تھی۔ مہی پت چاہتا تھا کہ وہ اس عمل کو انجام پہ پہنچائے بغیر ہی وہاں سے چلا جائے لیکن کلیانی اس توہین کو برداشت نہ کرسکتی تھی کلیانی نے پھر اپنے آپ کو اذیت ہونے دی۔ بیچ میں ایک دو بار وہ درد سے کراہی بھی اور بولی ___ ہائے میرا پھول ..... بھگوان کے لئے ..... میرے کو سوئی لگوانا پڑتا.....

پھر آہستہ آہستہ آہستہ اسنے دکھ اور سکھ سہتے ہوئے کائنات کے مرد کو ختم کر دیا اور اسے بچہ بنا کر گود میں لے لیا۔ مہی پت کے ہر الٹے سانس کے ساتھ کلیانی بڑی نرمی، بڑی ملائمت اور بڑی ہی ممتا کے ساتھ اس کا منہ چوم لیتی تھی، جس سے سگریٹ اور شراب کا تعفن لپک رہا تھا۔

دھونے دھلانے کے بعد مہی پت نے اپنا ہاتھ کپڑوں کی طرف بڑھایا، مگر کلیانی نے تھام لیا اور بولی ___ میرے کو بیس روپیہ جیاستی دو۔

بیس روپیہ ؟!

ہاں ___ کلیانی نے کہا ___ ہم تمہارا گن گائے گا۔ ہم بھولا نہیں او دن جب ہم مُنا کو گیا تھا، تو تم ہم کو دو سو روپیہ روکڑا دیا۔ ہم کار وار کا بڑا مندر میں ایک ٹانگ سے کھڑا ہو کر تمہارے واسطے پرارتھنا کیا اور بولا ___ میرا مہی کا رکھشا کرنا بھگوان ___ اسکو لمبا جندگی دینا، پیسہ دینا ___

اور کلیانی امید بھری نظروں سے پہلی اور اکی پرارتھنا کا اثر دیکھنے لگی۔

مہی پت کے نتھنے نفرت سے پھولنے لگے ... پیشہ ور عورت ! پچھلی بار دو سو لینے سے پہلے بھی ایسے ہی ٹسوے بہائے تھے اسنے۔ یوں روئی چلائی تھی جیسے میں کوئی ا

اچھی ــــ اچھی کیا؟

یہ تو ہم کو نہیں مالم ــــ کلیانی نے جواب دیا۔ اور پھر تھوڑا ہنسی .... کوئی آیا تھا کسٹمر،
بولا ــــ میرا تیرے کو ٹھہر گیا، تو اس کا نام اچھی رکھنے کا۔ یہ تو ہم نہیں بولنے سکتا، اسی کا ٹھہرا
کہ کس کا، پر نام یاد رہ گیا میرے کو۔ او تو پھر آیا چ نہیں اور تم بھی کوچھ نہیں بولا .... اور
پھر اور ہنستے ہوئے بولی ــــ اچھا، اگلے ٹیم دیکھیں گا .....

مہی پت نے ایک نظر اچھی کی طرف دیکھا اور پھر ارد گرد کے ماحول کی طرف۔ یہاں پلے گا
یہ بچہ؟ بچہ ...... میں تو سمجھتا تھا، ان لڑکیوں کے پاس آتا ہوں تو میں کوئی پاپ نہیں کرتا۔
یہ دس کی آشا رکھتی ہیں تو میں بیس دیتا ہوں ــــ یہ بچہ؟!

ــــ یہاں تو دم گھٹتا ہے ..... جاتے سمے تو گھٹتا ہی ہے۔

مہی پت نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکالا اور اسے بچے پہ رکھ دیا ــــ یہ اس دنیا میں
آیا ہے، اس لئے یہ اس کی دکشنا ہے۔

نہیں نہیں ــــ یہ ہم نہیں لے گا۔

لینا پڑے گا، تم انکار نہیں کر سکتیں۔

پھر واقعی کلیانی انکار نہیں کر سکی۔ بچے کی خاطر؟ مہی پت نے کلیانی کے کندھے پہ ہاتھ
رکھتے ہوئے کہا ــــ مجھے معاف کر دو کلیانی۔ میں نے سچ مچ آج تم سے جانوروں کا سا سلوک
کیا ہے۔ لیکن مہی پت کی بات سے یہ بالکل پتہ نہ چلتا تھا کہ اب وہ ایسا نہ کرے گا۔ ضرور کرے
گا وہ۔ اسی بات کا تو نشہ تھا اسے، بیئر تو فالتو سی بات تھی۔

کلیانی نے جواب دیا ــــ کوئی بات نہیں۔ پر تم آج کھلاص کر دیا، مار دیا میرے کو۔
وہ یہ شکایت کچھ اس ڈھب سے کر رہی تھی، جیسے مرنا ہی تو چاہتی تھی وہ۔ کیا اس لئے کہ پیسے
نہیں، پیٹ پلنا ہے؟ ..... نہیں ..... ہاں، جب بھوک سے پیٹ دکھتا ہے، تو معلوم
ہوتا ہے، دنیا میں سارے مرد ختم ہو گئے، عورتیں مر گئیں .....

مہی پت نے پوچھا ــــ یہ اچھی لڑکا ہے یا لڑکی؟

ایک عجیب سی کرن نے کلیانی کے پٹے، مار کھائے ہوئے چہرے کو منور کر دیا اور وہ چہرے

کی بنچھڑیاں کھولتے ہوئے بولی ــــ چھوکرا!

پھر کلیانی نے جلدی جلدی اچی کا لنگوٹ کھولا اور دونوں ہاتھوں سے اسے اٹھا کر اچی کے لڑکے پن کو مہی پت کے سامنے کرتی، اتراتی ہوئی بولی ــــ دیکھو، دیکھو......

مہی پت کے منہ موڑتے ہی کلیانی نے پوچھا ــــ اب کبھی آئیں گا؟

جلدی..... مہی پت نے گھبرا کر جواب دیا اور پھر وہ باہر کہیں روشنیوں میں منہ چھپانے کے لئے نکل گیا.....

قرۃ العین حیدر

سنگھار دان

لکھنؤ میں ہمارے ایک دور کے عزیز نواب آغن کہلاتے تھے۔ آج سے کوئی اسی پچاسی برس پہلے کا واقعہ ہے جب نواب آغن کے دادا جائداد یا شاید وثیقے کے مقدمے کی پریوی کونسل میں اپیل کے سلسلے میں انگلستان گئے تھے اور وہاں سے میم بیاہ لائے تھے۔ اُن بی بی نے لکھنؤ آکر بڑی آن بان کی پردہ دار بیگم کی حیثیت سے زندگی گزاری۔ محرم میں باقاعدہ عزاداری کرتی تھیں اور سُنا ہے کچھ عرصہ بعد انگریزی بولنا بھی بھول گئی تھیں۔ پتہ نہیں اس میں زیبِ داستاں کو کہاں تک دخل ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کی بیٹیاں، پوتیاں جن سے میں بھی ملی ہوں خالص دقیانوسی لکھنوی بیگمات تھیں جو انگریزی کا ایک لفظ نہ جانتی تھیں۔ اُن سب کی کنجی آنکھیں اور بھورے بال تھے، اس کے سوا ان میں اور دوسری پردہ دار بیگمات میں کوئی فرق نہ تھا۔ یہ خاندان "گوری دادی کا گھرانا" کہلاتا تھا اور ان کا مکان جو سبزی منڈی میں تھا "گوری بی بی کی حویلی" کے نام سے مشہور تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے، گلابی جاڑوں کے دن تھے اور ہم فیض آباد روڈ سے کسی خاندانی تقریب میں شرکت کے لئے گوری بی بی کی حویلی گئے ہوئے تھے اور گوری دادی کی پڑپوتی اُمّ لیلیٰ جو میری ہم عمر تھی، کھیلتی ہوئی دوسری منزل کے عقبی چھجے پر جا نکلیں جس کے مقابل گلی کی دوسری جانب ایک سبز رنگ کی دو منزلہ عمارت استادہ تھی اور اس کی دوسری منزل کے رنگ برنگے شیشوں والے دروازوں اور کھڑکیوں پر موتیوں کے پردے پڑے تھے۔ نچلی منزل میں شاید دوکانیں تھیں۔ مکان کے صدر دروازے کی پیشانی پر جلی حروف میں "پرستان منزل" نقش تھا۔ ہمارے طویل چھجے کے ایک کونے سے 'پرستان منزل' کا عقبی صحن صاف نظر آرہا تھا،

ں میں ایک گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ اور دو مہریاں آپس میں زور زور سے لڑ رہی تھیں۔
ں اور اُمِّ لیلےٰ چھجے کی ریلنگ پر جھک کر مہریوں کی لڑائی کا دلچسپ تماشا دیکھنے لگیں۔ اتنے
ں ایک سانولی سی بی بی کمر تک سیاہ، گھنے بال بکھرائے، صرف پیٹی کوٹ اور بلاؤز میں
بوس پرستان منزل کی اُس بالکنی میں نمودار ہوئیں جس کا رُخ اُس صحن کی طرف تھا انہوں
نے کمر پر ہاتھ رکھ کر مہریوں کو ڈانٹا اور اُن کی ناک کی ہیرے کی لونگ دُھوپ میں زور
سے چمکی۔

انہیں دیکھتے ہی اُمِّ لیلےٰ نے مجھ سے کہا" چلو واپس چلیں۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ جو عورت ہے اس کا نام حُسن پری ہے۔ اس پر نظر پڑ جائے تو گناہ ہوتا ہے۔"

"کیوں؟"

"یہ ہمارے یہاں آٹھویں تاریخ کو مردانی مجلس میں آکر نوحہ بھی پڑھتی ہے۔"

"اس کا نوحہ سُننے سے گناہ نہیں ہوتا؟"

لیکن اُمِّ لیلےٰ نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے جلدی سے سرگوشی میں کہا" آؤ
تمہیں زمرد پری بھی دکھا دیں۔"

میں چھجے سے گزر کر اُمِّ لیلےٰ کے پیچھے پیچھے ایک زینے میں پہنچی، جس کے موکھے میں سے
پرستان منزل کا بڑا کمرہ بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ کیونکہ اُس کے گلی کے رُخ کے دروازے
اور کھڑکیاں پوری طرح کُھلی ہوئی تھیں اور دھوپ کے لئے موتیوں کے پردے ایک طرف کو
سرکا دیئے گئے تھے۔ کمرے میں شفاف سفید براق چاندنی کا فرش تھا۔ ایک طرف قالین کی مسند
پر ہارمونیم، طبلہ، سارنگی اور ستار اوندھے ترچھے پڑے تھے۔ چھت پر بڑا سا جھاڑ آویزاں تھا
اور آتشدان کے اوپر ربڑ کے "بودُں" کے علاوہ ایک پُرانی وضع کا سبز رنگ کا سنگھار دان
رکھا تھا۔

اتنے میں حُسن پری کی پاٹ دار آواز بلند ہوئی "حُسین علی ـــــ مجن ـــــ چلو
مہاراج آگئے ـــــ"

میں اور اُمّ لیلےٰ موکھے میں سر دیئے اس طرح مبہوت ہو کر یہ نظارہ دیکھ رہے تھے جس طرح بچوں کی سیر بین میں ایک کے بعد دوسری رنگ برنگی تصویریں نظر آتی ہیں۔

اب انگلیوں میں بیڑی تھامے ایک بے حد فربہ "مہاراج" کمرے میں داخل ہوئے دوسرے دروازے سے حسین علی اندر آئے جو ململ کے سے کپڑے پہنے، بجھی بجھی آنکھوں اور بے حد مسکین چہرے والے ایک منحنی سے صاحب تھے۔ وہ فرش پر بیٹھ کر سارنگی کے سُر ملانے لگے۔ مہاراج بیڑی گلی میں پھینک کر ہتھوڑی سے بائیں کی ٹھونک پیٹ میں جُٹ گئے۔ ایک سترہ اٹھارہ سالہ چھریرا اور خوش شکل سا لڑکا اندر آیا اور ہارمونیم کے سامنے بھسکڑا مار کے بیٹھ گیا۔ پھر حُسن پری اُسی طرح بیٹی کوٹ اور بلاؤز پہنے اندر آئیں اور بڑے تحکمانہ انداز سے کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"یہ ساڑی کیوں نہیں پہنتی ہیں؟" میں نے اُمّ لیلےٰ سے پوچھا لیکن اُسی وقت ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی اندر آئی اور اُمّ لیلےٰ نے مجھے ٹہوکا دیا" یہ رہی زمرد پری!" اس لڑکی نے معمولی سا ریشمی فراک پہن رکھا تھا۔ بال کٹے ہوئے تھے اور اسکول کی عام سی طالبہ معلوم ہوتی تھی۔

"یہ حُسن پری کی بھتیجی زمرد پری ہے۔ کشمیری محلہ ہائی اسکول میں پڑھتی ہے۔" اُمّ لیلےٰ نے مجھے بتایا۔ اُمّ لیلےٰ کو اسکول میں پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ کیونکہ اسکول میں پڑھنے والی لڑکیاں عیسائی اور آوارہ ہو جاتی تھیں۔

میں اندر سبھا کی نوٹنکی دیکھنے کے علاوہ ریڈیو پر اتنی بار اندر سبھا سُن چکی تھی کہ مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ لڑکی نے جھک کر پاؤں میں گھنگھرو باندھے اور جوں ہی اُس کے پاؤں سے چھن کی آواز نکلی، اُمّ لیلےٰ نے چونک کر میرا ہاتھ کھینچا" چلو اب واپس چلیں۔ گھنگھروؤں کی آواز کان میں پڑی تو قیامت کے روز فرشتے پگھلا ہوا سیسہ کانوں میں انڈیلیں گے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ لیکن حویلی میں شاید ہماری ڈھنڈیا پچ چکی تھی۔ اُسی لمحے دو ہریاں ہمارے سر پر آ پہنچیں اور بھیگی بلی بنی اُمّ لیلےٰ اور اُس کے ساتھ ساتھ میں زینے سے نیچے اُتر گئی۔

مارچ سنہ ۶۱ء کا ذکر ہے، لندن میں مکان کی تلاش کے سلسلے میں گریک اسٹریٹ کی اسٹیٹ ایجنسیوں سے بے نیل و مرام واپس آ کر میں اور فیروز سوہو کے ایک چائے خانے میں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ چائے خانہ تقریباً سنسان تھا۔ قریب کی ایک میز پر کھچڑی بالوں والی ایک ہندوستانی خاتون ایک چھ سات سالہ انگریز بچی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ بچی آئس کریم کھا رہی تھی اور وہ خاتون "ڈیلی ورکر" پڑھنے میں مشغول تھیں۔ شاید وہ میری اور فیروز کی گفتگو دھیان سے سن رہی تھیں کیونکہ چند منٹ بعد اخبار میز پر رکھ کر نہایت شستہ اور کھنک دار لکھنوی لہجے میں انہوں نے ہمیں مخاطب کیا۔

"آپ لوگ ــــ معاف کیجیے گا ــــ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں؟"

"جی ہاں۔" فیروز نے جواب دیا۔

وہ بہت نرمی سے مسکرائیں۔ "لکھنؤ والوں کا ایک دوسرے کو نہ پہچان سکنا ناممکن ہے۔ میرے پاس ایک کمرہ اور غسلخانہ خالی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو کل صبح آ کر دیکھ لیجیے۔ جی ہاں میرا اپنا بورڈنگ ہاؤس ہے۔" انہوں نے مجھ سے کہا۔

ہم لوگوں نے اپنا تعارف کرایا اور انہوں نے اپنا کارڈ ہمیں دیا۔ "مس زیڈ۔ ایچ علی۔" نیچے مکان کا پتہ اور فون نمبر درج تھا۔ مکان بہت دور ٹوٹنگ میں تھا اور مجھے شہر کے اندر فلیٹ درکار تھا لیکن میں نے سوچا، جا کر دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ خاتون اتنی شائستگی اور خلوص سے باتیں کر رہی تھیں کہ انکار بھی عین بداخلاقی تھی۔ اس لئے میں نے وعدہ کر لیا کہ دوسرے دن صبح آؤں گی۔

جب ہم چلنے لگے تو انہوں نے انگریز بچی سے اردو میں کہا۔

"زہرا! آداب کرو ــــ" بچی نے جھک کر آداب کیا۔

"یہ میری بھتیجی ہے۔" انہوں نے بتایا۔ خدا حافظ کہہ کر میں اور فیروز باہر آ گئے۔ مس علی اسی طرح "ڈیلی ورکر" پڑھنے میں مصروف ہو گئیں۔

اتفاق سے اسی شام مجھے ہیمپسٹیڈ میں فلیٹ مل گیا اور میں نے مس علی کو فون پر اطلاع دے دی۔

میری بات سنکر وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگئیں اور پھر بولیں: "آپ سے کسی نے میرے متعلق کچھ ذکر کیا ہے؟"

"آپ کے متعلق ــــ ؟ کیسا ذکر ــــ ؟ نہیں تو ــــ" میں نے تعجب سے کہا۔

"اوہ اچھا۔ خیر! کوئی بات نہیں۔" انہوں نے اس انداز سے کہا، جیسے انہیں میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں کسی روز آکر ان کے ہاں کھانا کھاؤں۔ مجھے چند روز تک بالکل فرصت نہ تھی لیکن میں نے سوچا، ہو سکتا ہے ان کا کمرہ نہ لینے کی وجہ سے وہ برا مان گئی ہوں، اس لئے ان کے ہاں جانا ضروری ہے۔

اتوار کو تیسرے پہر کے قریب میں اُن کے یہاں پہنچی۔ فیروزہ نہ جا سکی۔ اس کے بچے کی طبیعت خراب تھی۔ مسز علی اپنے دو منزلہ کاٹج کے پھاٹک ہی پر میری منتظر تھیں۔ بہت تپاک سے اندر لے گئیں۔ سارے کرائے دار اتوار منانے کے لئے لندن جا چکے تھے۔ اس لئے کاٹج بالکل خاموش تھا۔ ڈرائنگ روم میں ٹیلی ویژن کے سامنے بڑا سا چاندی کا پاندان رکھا تھا۔ آتشدان پر چاندی کے فریم میں ایک بانکے چھبیلے ایکٹر نما شخص کی تصویر لگی تھی، جو پھولدار اس کارف گلے میں لگائے اور چمڑے کی جیکٹ میں ملبوس؛ بے حد باریک مونچھیں رکھائے اور ہاتھ میں پائپ سنبھالے بہت ادا سے کیمرے کو گھور رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں تان پورہ رکھا تھا۔ مس علی گلوریاں بناتے ہوئے اپنے کرائے داروں کے متعلق بتاتی رہیں، جو ہندوستانی اور پاکستانی طلبار تھے۔

"زہرا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ سچ یہ ہے کہ مجھے مس علی کا پاندان، تان پورہ، گلوری بنانے کا انداز اور ایکٹر نما شخص کی تصویر، یہ سب کچھ عجیب سا معلوم ہوا اور سمجھ میں یہی آیا کہ یہ بی بی معمولی لینڈ لیڈی نہیں ہیں۔

"اپنی ایک دوست کے یہاں کھیلنے گئی ہوئی ہے رات کو لے آؤں گی۔"

اسکے بعد انہوں نے ایک بے حد حیرت انگیز بات کی۔ پاندان بند کر کے صوفے پر آرام سے بیٹھتے ہوئے انہوں نے کہا: "آپ نواب اغن کی کچھ رشتہ دار ہیں نا ــــ ؟ وہی گوری بی بی کی حویلی والے ــــ"

میں بہت حیران ہوئی۔ نواب اغن ___ گوری دادی ___ سبزی منڈی کی حویلی ___ اُمّ لیلیٰ ___ یہ سب عرصہ ہوا میرے ذہن سے محو ہو چکے تھے۔

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "مگر آپ کو کیسے معلوم ؟"

"کیوں آخر میں بھی تو لکھنؤ ہی کی رہنے والی ہوں۔ ہمارا مکان نواب اغنؔ کے پڑوس میں تھا ___ اُن کے پچھواڑے ___"

"پرستان منزل ___ ؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"جی ہاں اور میں زمرد پری ہوں !"

"یا اللہ !!"

"شاید آپ نے مجھے کبھی دیکھا ہو۔ نواب اغنؔ کی حویلی کی صاحبزادیاں ہمیں اکثر موکھوں میں سے جھانکا کرتی تھیں۔ کل شام جب آپ نے مجھے فون کیا کہ آپ کو میرے کمرے کی ضرورت نہیں ہے تو مجھے یقین ہو گیا کہ یا تو آپ مجھے پہچان گئی ہیں یا یہاں کسی لکھنؤ والے نے آپ کو میرا کچا چٹھا بتا دیا ہے۔"

"زمرّد پری ___ ! یا اللہ ___ !!" میں نے دریائے حیرت میں غوطہ زن ہو کر دُہرایا۔

"زمرّد پری ! جی ہاں۔ مرزا رسوا نے لکھنؤ کی طوائف کا رومینٹک مرقّع کھینچ کر آپ لوگوں کی کئی نسلوں کو عجیب و غریب خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا رکھا ہے۔"

"ایسا تو نہیں ہے۔" میں نے ذرا جوش سے جواب دیا۔ "مرزا رسوا کی "امراؤ جان" تو ایک زوال پذیر، کھوکھلے معاشرے کی بڑی ریلسٹک REALISTIC نمائندہ ہے۔"

میرے ذہن میں خورشید الاسلام کا مقدمہ گھوم گیا اور ساتھ ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ واقعی یہ تو حد ہو گئی۔

ع "کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی"

مس علی، یعنی زمرّد پری، صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر دُہرا رہی تھیں ___ یا اللہ۔

یا اللہ۔ یعنی حد ہو گئی۔

"آپ کو بھلا یاد ہے آپ نے مجھے کب دیکھا تھا؟" انہوں نے دریافت کیا۔

یہ تو اچھی طرح یاد نہیں۔ میں شاید دس گیارہ سال کی تھی اور میں اور کزن اُمّ لیلےٰ ایک دن جھروکے میں سے جھانک رہے تھے ــــ تو آپ ــــ" میں نے ذرا ہچکچا کر وہ سارا منظر دُہرایا جو اب مجھے پوری طرح یاد آ چکا تھا۔

"ــــ حُسن پری میری پھوپھی تھیں۔ حسین علی سارنگی نواز میرے والد اور ہمارے منیم والا محسن میرا اکلوتا بھائی ماجد علی تھا۔ حُسن پری کو میں آپا کہتی تھی۔ وہ لاولد تھیں اور انہوں نے مجھے بیٹی بنا لیا تھا ــــ آیئے کچن میں چلیں۔ آپ کے لئے میں خالص لکھنوی کھانا تیار کرتی جاؤں گی۔ اور آپ کو اپنی داستان بھی سُناؤں گی۔"

اور اُس روز، لندن کے اُس دُور افتادہ محلے کے ایک خاموش کاٹج کے باورچی خانے میں زمرد پری نے اپنی کہانی سنائی۔

"ہمارا گھرانہ ڈیرہ دار طوائفوں کا گھرانہ تھا جو شاید نواب آصف الدولہ کے زمانے میں فیض آباد سے لکھنؤ آ گیا تھا۔ میری نانیاں، پر نانیاں بڑی معرکے کی طوائفیں تھیں۔ میری پردادی صاحبِ دیوان شاعرہ تھیں۔ اکثر تذکروں میں ان کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ ہمارے خاندان کی شاہی دربار تک رسائی تھی۔ میری دادی خدا بخشے، اُس گھرانے کی آخری نامی مغنیہ تھیں۔ بولتے سینما اور ریڈیو کے دَور میں ہمارے گھرانے کا وہ شہرہ نہیں رہا لیکن اللہ بخشے دادی کی گائی ہوئی ٹھمریوں کے ریکارڈ آج بھی خاصے کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ حُسن پری اور حسین علی اُن کی اولاد تھے۔ حُسن پری بھی ماہر گائیکہ تھیں لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا۔ جدید فیشن کے رُوسا پرستان منزل آتے ہوئے جھینپتے تھے اور یوں بھی طوائف کی جگہ ــــ معاف کیجیے گا ــــ نئے سماج میں سوسائٹی لیڈیز لے چکی ہیں۔

"حسین علی کی دستور کے مطابق برادری میں شادی کر دی گئی اور محسن اور میں پیدا ہوئے۔ دستور کے مطابق ہی اماں شدید پردے میں رہیں۔ میں ذرا بڑی ہوئی تو آپا یعنی حُسن پری نے یہ سوچ کر کہ آج کل گِٹ پٹ کرنے والیوں کی قدر ہے، مجھے اسکول میں داخل کر دیا۔ محسن مجھ سے

چار سال بڑا تھا۔ ابا نے اُسے بہت ریاض کرایا لیکن وہ ماہرِ فن "خاں صاحب" بننے کی بجائے شُہدوں کی صحبت میں پڑ گیا کس بہن بھائی میں محبت نہیں ہوتی۔ میں بھی اپنے بھیا کو بہت چاہتی تھی اور کوشاں تھی کہ وہ بھی چار حروف پڑھ لے تاکہ اِس زندگی سے چھٹکارا حاصل ہو۔ کیونکہ مجھے ہوش سنبھالتے ہی اُس ماحول سے کراہت آنے لگی تھی۔

" اس احساس کے ذمے دار اتفاق سے آپ کی "گوری بی بی کی حویلی" والے تھے۔ عشرہ محرم میں ایک دن میں اپنے چھجے پر کھڑی تھی، کیا سنتی ہوں کہ نیچے نواب اعنّ کی ڈیوڑھی میں کواڑ کے پیچھے سے کوئی لڑکی اپنی مہری کے بچے سے کہہ رہی ہے "کنچنی کے گھر کا حصّہ لے آئے۔ چھی چھی —— آخ تھو —— جاؤ ہاتھ دھوؤ۔ توبہ کرو۔ چھی چھی —— گناہ ہوگا ——"

(یہ ضرور اُمّ لیلیٰ رہی ہوگی۔ میں نے دل میں کہا۔)

زمرد پری نے کہانی جاری رکھی۔ "یہ سنکر مجھے دھکا سا لگا۔ میں نے اندر آکر آپا سے کہا۔

"آپا ہمارے یہاں کا تبرک لے جانے سے گناہ ہوتا ہے؟ ہم لوگ اتنے بُرے ہیں؟"

آپا اُس وقت مسند پر بیٹھی امبا پرشاد جوہری کو میرے لئے جڑاؤ کڑوں کا آرڈر دے رہی تھیں۔ میری بات سنکر انہوں نے ابا کو دیکھا۔ وہ مسند کے کنارے اکڑوں بیٹھے تھے اور مجھے حکم دیا کہ میں کبھی حویلی کی طرف والے چھجے پر نہ جایا کروں۔ لیکن مجھے کرید لگ گئی۔ میں نے اندر جاکر اماں سے یہی سوال کیا۔ وہ میلے کچیلے کپڑے پہنے حسبِ معمول چولھے کے پاس بیٹھی تھیں۔ لے لو وہ تو رونے لگیں۔ میں نے ضد کی۔ بتاؤ اماں! ہم لوگوں میں کیا بُرائی ہے؟ بتاؤ —— بتاؤ ——؟ اماں نے جواب دیا کہ آئندہ میں آپا کے سامنے ایسی بات نہ کروں ورنہ وہ مار ڈالیں گی۔ میں چپکی ہو رہی۔ ذرا سیانی ہونے پر مجھے معلوم ہوا کہ "طبقۂ اربابِ نشاط" کے کیا معنی ہیں لیکن یہ طبقہ کس سماجی اور معاشی نظام کا مرہونِ منّت ہے، یہ سمجھانے والا مجھے کوئی نہ تھا۔

" اب مجھے ناچ گانے کی تعلیم دی جارہی تھی۔ آپا چاہتی تھیں، میں ایسی پُرفن مغنّیہ اور رقاصہ بنوں کہ "پرستان منزل" اپنی کھوئی ہوئی شہرت دوبارہ حاصل کرلے۔ اب شہر میں ریڈیو اسٹیشن بھی کھل چکا تھا اور لکھنؤ کی کئی گانے والیوں نے کلکتہ اور بمبئی جاکر سینما میں بھی نام کما لیا تھا۔ راجہ نواب اور تعلقہ دار ابھی سلامت تھے اور آپا میرے لئے طرح طرح کے

ند منصوبے بنا رہی تھیں لیکن جب میں نے میٹرک پاس کیا تو شور مچا ڈالا، کالج میں
گی!، آپا نے مجھے بھیگی ہوئی بید سے پیٹا اور ایک کوٹھری میں قید کر دیا۔ اماں دُکھیا
ں کی بلی کی طرح سارے گھر میں گھومی گھومی پھریں لیکن ابا اور اماں دونوں آپا سے تھرتھر
تھے۔

اب اس داستان کو کہاں تک طول دوں بٹیا۔ میں نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ اب
رہ سال کی ہو چکی تھی۔ اور آپا کے پاس میرے لئے موٹی، اسامیوں کی فرمائشیں آنی
ہو گئی تھیں لیکن میرے مولا نے ایک معجزہ کر دکھایا۔

غم کھاتے کھاتے اور کلپتے کلپتے مجھے حرارت ٹھہر گئی۔ آپا نے ہڑ بڑا کر ڈاکٹروں کو دکھایا تو
نے تپ دق بتائی۔ آپا کے ہوش اڑ گئے۔ مجھے فوراً بھوالی لے گئیں۔ بھوالی کا بڑا ڈاکٹر ایک
نگالی تھا۔ میرے لئے تو وہ فرشتۂ رحمت ثابت ہوا۔ میں نے اُسے اپنی بپتا سنائی اور اُس
ں کیا کہ صحت ہو جانے کے بعد بھی زیادہ سے زیادہ مدت تک وہ مجھے سینی ٹوریم میں رکھے
۔ تو اس طرح بٹیا چار برس تک بھوالی میں رہی۔

" وہاں مریضوں میں چند بہت پڑھے لکھے مرد اور عورتیں بھی تھیں۔ اُن مہربان لوگوں
کتابیں پڑھنے کے لئے دیں۔ اُن کی صحبت میں میرے دل و دماغ کی دنیا ہی بدل
ں اب یہی دعا مانگا کرتی کہ ساری عمر یہیں پڑی رہوں تاکہ پرستان منزل واپس نہ جانا

" مگر کب تک؟ میں نہ صرف پوری طرح تندرست ہو چکی تھی بلکہ اتنے عرصے پہاڑ پر
ں کی زندگی گزارنے سے رنگ روپ اور زیادہ نکھر گیا تھا۔

" ایک دن آپا مجھے گھر لے جانے کے لئے آ پہنچیں۔ مجھے دیکھ کر چٹ چٹ بلائیں لیں،
ی، مٹھائی بانٹی۔ بس کھِلی جا رہی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ شدید مسرت کس وجہ سے ہے
ب میرے اندر خود اعتمادی آ چکی تھی اور میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر آپا مجھ سے اپنے نقشِ
چلنے کے لئے کہیں گی تو صاف انکار کر دوں گی۔ اب وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اب
تیرہ سال کی بلبلی چھوکری تھوڑا ہی تھی۔

"میں لکھنو واپس آ گئی۔ پرستان منزل چار سال میں بالکل نہیں بدلی تھی۔ اسی طرح دن کے وقت آپا کے حوالی موالی تاش اور چوسر کی محفلیں جماتے۔ بزاز کے پھیرے ہوتے۔ برادری کی طوائفیں اور نوچیاں آ کر آپا کی دربار داری کرتیں۔ چراغ جلے تو بہار آ جاتی۔ کھجوری چوٹی میں چنبیلی کا گجرا لپیٹے، سولہ سنگھار کئے آپا تمکنت سے مسند پر بیٹھتیں، ملاقاتیوں کی آمد و رفت شروع ہوتی۔ ابا سارنگی سنبھالے سر جھکائے گانا شروع ہونے کے انتظار میں مسند بیٹھے رہتے۔ جب مجھے ابا کی وہ مسکین صورت یاد آتی ہے تو میرا دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ابا کو صرف اسی ایک انداز میں دیکھا۔ بہن کے پیچھے سر جھکائے بیٹھے تندہی سے سارنگی بجا رہے ہیں۔ چپ چاپ، صابر، قانع۔ ان کے مقدر میں شاید یہی لکھا تھا۔ انہیں تو شاید اس کا احساس بھی نہ ہوتا ہوگا۔ میں ہی یہ سب سوچ سوچ کر پاگل ہوا کرتی تھی۔

"مجن اب کنکوے بازی کی اسٹیج سے نکل کر جوے اور گھوڑ دوڑ کے میدان میں پہنچ چکا تھا۔ سوٹ بوٹ ڈاٹ کر آپا کے ایک ملاقاتی کی موٹر میں اڑا اڑا پھرتا تھا۔

"محرم بھی اسی دھوم سے منایا جاتا۔ آٹھویں تاریخ کو آپا نواب اعظم کی مجلس میں نوحہ اور سوز پڑھتیں۔ عشرے کے روز ہمارا اپنا بے حد شاندار تعزیہ نکلتا تھا اور آپا اپنا کہا ہوا نوحہ پڑھتی، سر کے بال کھولے، ننگے پاؤں ماتم کرتی تعزیے کے ساتھ کربلا جاتی تھیں اور انہیں دیکھ کر اس وقت واقعی یہ احساس ہوتا تھا کہ پرانے مٹتے ہوئے لکھنؤ کی تہذیب کی آخری نشانیوں میں سے ہیں۔

"ایک دن شام کو آپا کے ایک پرانے ملاقاتی کے ساتھ بمبئی کے ایک فلم ڈائریکٹر بھی آئے۔ اور انہوں نے مجھے ہیروئن کے رول کی پیش کش کی۔ میں نے مختصر سا جواب دیا کہ میں فلم اسٹار بننا نہیں چاہتی۔

"آپا کے ملاقاتی نے بگڑ کر پوچھا۔ تو پھر کیا بننا چاہتی ہو؟ مت بھولو کہ تم کتنا ہی پڑھ لکھ جاؤ، دنیا کی نظروں میں حسن پری کی لڑکی ذمرّدی رہو گی۔ یہ سن کر غم و غصہ سے میرا رنگ سرخ ہو گیا۔ ڈائرکٹر صاحب بے چارے بھی جھینپ گئے۔ ابا اسی طرح سر جھکائے بیٹھے سارنگی کے سُر ملاتے رہے۔ لیکن مجھے بے حد تعجب ہوا کہ آپا نے اپنے دوست ڈائریکٹر صاحب کی ہاں میں ہاں نہیں

اس کی بجائے وہ جھک کر بولیں: "اے ایڑی چوٹی پہ واروں نگوڑے فلموں کو۔ کیوں لڑکی کو
کر رہے ہو ـــــ خواہی نخواہی ـــــ اُس کا جی اچھا نہیں ہے۔" اور مجھے ابرو کی جنبش سے
رہ کیا کہ وہاں سے اُٹھ جاؤں۔

"آپا کے رویئے میں واقعی بڑی انوکھی تبدیلی آگئی تھی۔ یہ بھی اصرار نہیں کیا کہ ناچ گانا شروع
ں۔ ابا نے البتہ کہا کہ ریاض کرتی رہو۔ اس لئے میں نے گانا شروع کر دیا اور ریڈیو اسٹیشن
پروگرام بھی دینے لگی۔

"۴۶ء کے آخر کا ذکر ہے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی ریڈیو پر خبریں سن رہی تھی کہ آپا اندر
اور بڑی محبت سے میرے پاس بیٹھ گئیں۔ آپا پچھلے دو تین ماہ سے بالکل بدل چکی تھیں، اس
ب مجھے اُن سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ پھر آخر میرے باپ کی بہن تھیں۔ شہزادیوں کی طرح
پالا تھا۔ مجھے بھی ان سے فطری محبت تو تھی ہی۔ خون کا رشتہ تھا لیکن میں ہی ایسی ناشکری
اُن کی ایک ایک ادا سے خار کھاتی تھی۔

"اس وقت انہوں نے بہت پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا کہ وہ مجھے اعلیٰ تعلیم
ے ولایت بھیج رہی ہیں۔

"یقین فرمایئے، مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ کالج میں پڑھنے کی درخواست پر انہوں
ے کھو کا پیاسا کال کوٹھری میں بند کر دیا تھا اور اب ولایت بھیجے دے رہی ہیں یا مظہر العجائب۔

"دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ انہیں بہت ندامت ہے کہ
ں نے میری مرضی کے خلاف مجھے اس راستے پر چلانا چاہا تھا۔ اب وہ خود تائب ہو رہی ہیں۔
جھے اور محسن کو ولایت بھیج کر خود بھائی بھاوج کے ساتھ کربلائے معلیٰ چلی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ
بول کرلے پھر انہوں نے کہا۔ میں سفر کی تیاریاں شروع کر دوں اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"میں تو خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ میں اور محسن ولایت جا رہے ہیں!! محسن پڑھ لکھ کر آدمی بنے
یں پڑھ لکھ کر شریفانہ زندگی بسر کر سکوں گی۔ یا اللہ تو نے آپا کی یہ کایا پلٹ کس طرح کر دی۔
ر آپا کو اس نیکی کا اجر دے۔ اُن کی توبہ قبول فرما میرے مالک!

"میں بٹیا! جھٹ پٹ تیاری میں جُٹ گئی۔ لیکن مجھے رختِ سفر باندھنے کی ضرورت ہی

نہیں تھی۔ کیا دیکھتی ہوں جیسے گھر میں بارات آنے والی ہے۔ جوہری اور سنار زیوروں کے ڈبے کھول رہے ہیں۔ غراروں پہ کارچوب ہو رہا ہے۔ بنارسی ساڑیاں خریدی جا رہی ہیں۔ میں نے آپا سے کہا۔ اللہ، آپا ولایت جانے کے لئے اس تام جھام کی کیا ضرورت ہے؟ بولیں، لے بس اب چُپ رہ لڑکی! پردیس میں کیا چیتھڑے لگا کر گھومے گی۔ لوگ میرے جنم میں تھوکیں گے، کو کنگلے اماں باوا ہیں جنہوں نے کپڑے لتے کا بھی بندوبست نہ کیا۔ میں مسکرا کر چپ ہو گئی۔ اس اسٹیج پر اختلافِ رائے مناسب نہ تھا۔ نہ اُن بے چاری کو یہ سمجھایا جا سکتا تھا کہ ولایت میں یہ تلواں جوڑے اور کندن کے جھالے کون پہنے گا۔

"اب رہا محسن، تو وہ یوں ہی برف خانے کے چمار کی طرح اکڑا اکڑا پھرتا تھا اب تو بالکل ہی بوکھلا گیا تھا۔ ہونٹ ٹیڑھے کرکے غلط سلط انگریزی بولتا۔ دن بھر اپنے چرکٹوں پر رعب گانٹھا پھرتا۔

"ابا اور اماں کی رنجیدہ صورتیں دیکھ کر میرا دل بیٹھا جاتا۔ ولایت جانے کی ساری خوشی کافور ہو جاتی۔ جانے ان سے کتنے دنوں بعد ملاقات ہو گی! اللہ ساتھ خیریت کے سب سے پھر ملائے۔

"اے لو بٹیا! پلک جھپکتے میں وہ دن بھی آ گیا، جب آپا نے امام ضامن کی ضامنی میں ہم دونوں بہن بھائی کو پردیس رخصت کیا۔

"سویرے سویرے ہم لوگ اسٹیشن روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر ایک جودھ پوری برجس اور پگڑی والا مونچھیل بھی برابر کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ جب بمبئی پہنچ کر میں اور محسن سرکیشیا جہاز پر چڑھے تو وہ مونچھیل پہلے سے جہاز پر موجود تھا۔ میں نے ایک آدھ بار محسن سے پوچھا، بھیا یہ کون چڑی مار ہمارے ساتھ ساتھ لگا ہوا ہے۔ محسن نے بے پروائی سے جواب دیا، ہو گا کوئی ہمیں کیا۔

"جہاز پہ ایک نئی دنیا اور نئی زندگی کی جھلک دیکھ کر میں تو عالمِ حیرت میں تھی۔ کیسی آزاد، بشاش اور مصروف دنیا تھی! برآمدے میں سفید ساڑیوں میں ملبوس چند لڑکیاں ایک طرف کھڑی تھیں۔ میں بڑی خود اعتمادی سے ان کے پاس پہنچی اور پوچھا کہ کیا ولایت پڑھنے جا رہی ہیں؟ بولیں ہاں ڈاکٹری پڑھنے جاتے ہیں۔ میں نے خوشی سے کہا، میں بھی پڑھنے جا رہی ہوں۔ اُن میں

ایک لڑکی نے ذرا معنی خیز انداز سے اپنی ساتھی لڑکیوں کو دیکھا۔ پھر وہ سب آگے بڑھ گئیں۔ میں اس وقت اتنی مسرور تھی کہ اُن کے اس رویئے کا احساس بھی نہ ہوا۔

" جب جہاز نے سائرن بجایا تو ابا مجھ سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگے۔ میں بھی خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ محبّن نے ابا کو دلاسا دے کر زینے تک پہنچایا۔ جہاز نے لنگر اٹھایا اور میں سارے میں سیر کرتی پھری۔ بار پر ایک توندل راجہ صاحب بھی اپنے مصاحبوں کے ساتھ ڈٹے بیٹھے تھے۔ وہ موچھوں والا موا بھی ان کے برابر میں براجمان تھا۔ پتہ نہیں کیوں اتنی بار اُس کمبخت کو دیکھ کر مجھے ہول سا آیا۔ ڈنر کے بعد میں اپنے کیبن میں آ گئی۔ محبّن دوسری برتھ پر لیٹا سیٹی بجا رہا تھا۔

" اپنی برتھ پر لیٹ کر دفعتاً ایک خیال آیا۔ میں نے کہا، محبّن! ہمارا ولایت میں کونسے کالج میں داخلہ ہوا ہے؟ لندن پہنچ کر ہم کہاں اتریں گے؟ مجھ نگوڑی کو تو یہی خیال تھا کہ میٹرک پاس تو ہوں ہی۔ وہاں جا کر ایف اے میں داخلہ ہو جائے گا۔ سب ہو جائے گا ابھی سے کاہے کی فکر کرتی ہو۔ اتنا کہہ کر وہ تو کروٹ بدل کر سو گیا۔ پر مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔

" دوسرا دن بھی میں نے جہاز کی زندگی اور سمندر کا نظارہ کرنے میں گزارا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد جب میں اپنے کیبن میں گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ محبّن کے علاوہ وہ توندل مہاراجہ صاحب بھی موجود ہیں۔ شراب اُڑ رہی ہے۔ محبّن نے اطمینان سے کہا۔ آؤ۔ آؤ۔ بیٹھو۔ یہ ہز ہائی نس جگ نگ پور ہیں۔ ہمارے ساتھ ہی لندن جا رہے ہیں۔

" میں نے متانت سے ہز ہائی نس کو آداب کیا۔ انہوں نے مجھے اس طرح گھور کر دیکھا کہ بس ــــ کیا بتاؤں۔ میں لرز کر رہ گئی۔ میں نے الٹے پاؤں واپس جانا چاہا لیکن وہ مونچھیل دروازے میں راستہ روکے کھڑا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ بدذات مہاراجہ کا اے ڈی سی ہے۔ میں نے محبّن کو ملتجیانہ نظروں سے دیکھا لیکن وہ برتھ پر سے کودا اور جست بھر کے کیبن سے باہر نکل گیا۔

" اس لمحے میری روح کی گہرائیوں سے ایک ایسی گالی نکلی جو اس کے آبائی پیشے کے متعلق تھی۔ کمبخت اصل پر گیا نا آخر۔ میرا لاڈلا، چہیتا ماں جایا محبّن ــــ میرا رنگ فق ہو چکا تھا

اندر میں تھرتھر کانپ رہی تھی۔ اُس عظیم الشان، تیرتے ہوئے روشنیوں کے شہر میں، اتھاہ سمندر اور رات کی تنہائی کے بھنور میں اُس خوفناک راجہ کے سامنے بےبس کھڑی تھی اور اُس وقت اپنی حرّافہ پھوپھی کی ساری چال بازی میری آنکھوں کے سامنے عیاں ہوگئی۔

"ہز ہائی نس وہسکی کا گلاس تھامے بہت اشتیاق سے مجھے گھورے جا رہے تھے۔ پھر انہوں نے نرمی سے کہا: دیکھو پری جان! ابلہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے تمہاری پھوپھی کو پندرہ ہزار نقد اور بیس ہزار کے زیور دے کر تمہیں حاصل کیا ہے۔ میں ہر تیسرے سال کسی پری زاد کو لے کر یورپ کی سیر کے لئے جاتا ہوں۔ اب جنگ کی وجہ سے کئی سال سے نہ جا سکا تھا۔ نواب صاحب محمود پور کے ہاں مجرے میں تمہیں دیکھ کر تم پر زہر کھایا اور تمہاری انوکھی ہٹ کی داستانیں سن کر طے کر لیا کہ اب کے تمہیں ساتھ نہ لے گیا تو اپنا نام بدل دوں گا! اور تم ہو سیج پر کھولی۔ اپنی پھوپھی کے بھتّے میں آگئیں۔ ارے ـــ ارے۔ روؤ نہیں۔ میں تمہیں اپنی آنکھوں کی پتلی بنا کر رکھوں گا۔ چار مہینے تک یورپ میں رانی بنا کر رکھوں گا۔ ارے تم نے ابھی دنیا دیکھی ہی کیا ہے۔ پاگل چھوکری نہیں تو ـــ"

"تین دن تک میں اپنے کیبن سے باہر نہ نکلی۔ ریلنگ پر سے سمندر میں کود جانا بہت آسان تھا لیکن یا تو مہاراجہ ہر وقت میرے ساتھ لگا رہتا یا وہ موا اے ڈی سی پہرے پر چوکس رہتا۔ رہا محبّن، تو وہ مزے سے بار پر بیٹھا شراب پینے میں جُٹا رہتا۔

"آخر ایک دن جب میں عرشے پر گئی تو وہ طالب علم لڑکیاں مجھے دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں ہز ہائی نس کی محبوبہ ہوں۔ چند روز بعد میں نے اپنی اس بےبسی سے سمجھوتہ کر لیا۔ انسان جب وقت پڑتا ہے تو ہر طرح کے ظلم و ستم، ہر طرح کی مصیبت اور بےعزّتی کو برداشت کر لیتا ہے۔

"یورپ پہنچ کر ہم لوگوں نے کئی ماہ سوئٹزرلینڈ اور فرانس میں گزارے۔ محبّن میری خوشامد میں لگا رہتا۔ آخر کو ماں جایا تھا۔ میرا بھی دل پسیج گیا اور اُس سے بول چال شروع

کر دی۔

"اس دوران میں ہز ہائی نس نت نئی یورپین چھوکریوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے رہے۔ لیکن ہر نئے شوق کے بعد واپس میرے پاس ہی تشریف لاتے۔ دراصل وہ بے چارے سچ مچ اپنی "جونیئر رانی" کی طرح مجھ سے برتاؤ کرتے تھے اور میں نے بھی "جونیئر رانی" کی حیثیت سے سوشل فرائض انجام دیئے۔ اس طرح مجھے اس مشہور و معروف انٹرنیشنل کیفے سوسائٹی کی غلاظت کا بھی بخوبی اندازہ ہو گیا۔ اس سوسائٹی میں ہالی ووڈ کے فلم اسٹار بڑے بڑے ڈیوک اور ڈچز، سابق تاجدار، ملک التجار سبھی شامل تھے اور مجھے معلوم ہوا کہ پرستان منزل، مختلف صورتوں سے ساری دنیا میں موجود ہے۔ بڑی بڑی شریف زادیوں کے طور طریق دیکھنے کے بعد مجھے اپنے پسِ منظر سے اب اتنی شرم بھی نہ آتی تھی۔ میں نے خود پر ترس کھانا، اپنے آپ سے نفرت کرنا بھی ترک کر دیا۔ بات یہ ہے کہ اب میں ذہنی اور جذباتی طور پر بڑی ہو چکی تھی۔

"اس دوران میں محسن مہاراجہ کے مشیرِ خاص کی حیثیت سے بڑا طرحدار پلے بوائے PLAY BOY بن چکا تھا۔ ہم لوگ لندن کے سوائے میں مقیم تھے کہ ایک شام ہز ہائی نس عواس باختہ کمرے میں آئے اور مجھے اطلاع دی کہ فوراً ہندوستان واپس جا رہے ہیں۔ ہندوستان آزاد ہو چکا تھا اور سردار پٹیل نے سارے رجواڑوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ریاست جگ مگ پورٹھی اوراقِ ماضی میں شامل ہونے والی تھی۔ ہز ہائی نس نے اپنے دیوان کا کیبل میز پر رکھتے ہوئے مجھ سے کہا کہ اب ان کے پاس عیش و عشرت کے لئے فاضل دولت نہیں ہے لیکن وہ مجھے میری پھوپھی کے پاس بحفاظت لکھنؤ واپس پہنچا دیں گے۔ سامان پیک کرتے ہوئے میں نے ان کے زیورات انہیں واپس کرنے چاہے لیکن انہوں نے غم و غصہ سے گرج کر کہا۔ میں دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتا۔ ریاست ختم ہو گئی لیکن ابھی میری شرافت باقی ہے، مجھے بے چارے پر ترس بھی آیا۔ وہ برا آدمی نہیں تھا۔ محض اپنے طبقے کا نمائندہ تھا۔ میں نے ہز ہائی نس سے کہا کہ لکھنؤ واپس جانے کی بجائے یہیں لندن میں رہ کر کچھ پڑھنے کی کوشش کروں گی۔ انہوں نے جواب دیا: پاگل ہو۔ خیر۔ جو تمہاری مرضی۔

"مسز ہائی نس ہندوستان واپس چلے گئے۔ محسن نے بھی طے کیا تھا کہ وہ لندن ہی میں رہ کر بزنس کرے گا۔ اس لئے ہم دونوں نے مزویل ہل پہ ایک سستا سا کمرہ لے لیا۔ ان دنوں کرائے بہت سستے تھے۔

"بیٹا! یہ بہت لمبی داستان ہے۔ پھوپھی نے پہلے تو اَن گنت عتاب نامے بھیجے۔ پھر میری طرف سے صبر کر کے بیٹھ رہیں۔ محسن نے بزنس کرنے کے لئے سارے زیور مجھ سے لے لئے۔ بزنس فیل ہو گئی۔ باقی زیور وہ جوئے میں ہار گیا۔ اب میں بالکل قلاش تھی۔ میں نے نائٹ اسکول میں پڑھا۔ دن کو فیکٹری میں کام کرتی رہی۔ برتن دھونے کی نوکری کی۔ سبھی طرح کے پاپڑ بیلے۔ محسن نے بار بار سمجھایا کہ میں پھر اپنی پہلی زندگی اپنا لوں۔ کیا کیا بتاؤں ـــــ آیئے کھانا تیار ہے۔"

زمرد پری نے کھانا نکال کر میز پہ چنتے ہوئے پیشانی پر سے بال ہٹا کر بات جاری رکھی۔ "پھر یہاں ہندوستانی اور پاکستانی آنے لگے۔ کچھ لکھنؤ والے بھی آئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے پہچان لیا اور مشہور کر دیا کہ میں لندن میں پیشہ کر رہی ہوں۔ میں پانچ پانچ پونڈ ہفتہ کی نوکری کر کے برتن مانجھ کر اور فرش دھو کے اپنا پیٹ پال رہی تھی اور مونٹیسری کی ٹریننگ ختم کر چکی تھی۔

"ایک دن میں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی ایک محفل میں مدعو تھی۔ وہاں جب خواتین نے مجھے دیکھ کر آپس میں کھسر پھسر شروع کی اور جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

"مجھے بڑا دھکا لگا۔ اس رات گھر واپس آ کر میں نے سوچا ـــــ اس شرافت، اس پارسائی، اس محنت کشی سے مجھے کیا فائدہ ہوا؟ یہ معاشرہ مجھے کبھی عزت نہ دے گا۔ میں یہاں سات سمندر پار بھی، اپنے ہم وطنوں کی نظروں میں مہاراجہ جگ مگ پور کی سابق داشتہ زمرد بائی آف لکھنؤ ہی رہوں گی۔ میں اس طرح خون پسینہ ایک کر کے اپنی جان کیوں ہلکان کر رہی ہوں؟ کیا جب میں وطن جاؤں گی تو مجھے کسی اسکول میں نوکری مل جائے گی؟ زمرد پری کو اسکول ٹیچر بننے کی اجازت ملے گی؟ شاید آپا ہی ٹھیک کہتی تھیں۔ محسن ہی ٹھیک

کہتا تھا۔ کوئی شریف آدمی مجھ سے نکاح کرنے کو تیار نہیں۔ کہاں جاؤں ـــــ؟ کیا کروں؟ بیٹیا ایک رات میں دیر تک ٹیمز کے کنارے بھی ٹہلا کی۔ پھر سوچا خودکشی مہمل بات ہے۔ جد وجہد نہ چھوڑنی چاہیے۔ کیمونسٹ پارٹی کے جلسوں میں بھی شرکت کی۔ دن کی محنت مزدوری کے بعد رات کو تھکی ہاری اپنے کمرے میں واپس آتی تو اچانک 'پرستان منزل' کی شاندار خواب گاہ یاد آجاتی جس کا چھپرکھٹ اب بھی میرا منتظر ہوگا۔ سوچا، واپس چلی جاؤں۔ میں تنِ تنہا تو انقلاب لانے سے رہی اور انقلاب کی ہمت ہے کس میں؟ معاف کرنا بیٹیا، میں نے آپ کے ہاں کے یہ بہت سے مشہور انٹلکچوئیل اور انقلابی دیکھے ہیں جو لندن آ آکر رہا کرتے ہیں۔ مس زمرّد علی سے اب بہت سے معقول لوگ واقف ہو چکے ہیں ـــــ یہ رائتہ لیجیے۔ پراٹھے کیسے ہیں؟"

"بے حد نفیس!" میں نے جواب دیا اور مجھے یاد آیا کہ دس سال پہلے واقعی میں نے یہاں چند حضرات سے لکھنؤ کی ایک پراسرار سی خاتون کا ذکر سنا تھا جو مزدیل ہل پر رہتی تھیں اور سنا تھا کہ کبھی کبھی حلقۂ اربابِ ذوق کے جلسوں میں بھی آتی تھیں۔

"تو میں نے سوچا، واپس چلی جاؤں۔" مس زمرّد علی نے قہوے کے لیے کیتلی چولھے پر رکھتے ہوئے کہا "مگر ابّا اور اماں کربلا جا چکے تھے اور وہیں ان کی مٹی عزیز ہوگئی تھی۔ آپا، سنا ہے میرے "فرار" کی وجہ سے بالکل بجھ کر رہ گئیں۔ شراب کی لت تھی۔ مگر کربلائے معلّٰی سے واپس آنے کے بعد توبہ کرلی۔ ایک دم شراب چھوڑنے سے صحت بگڑ گئی۔ استاد جی نے مجھے خط لکھا تھا کہ 'پرستان منزل' کے زوال کا آخری دور بہت جانکاہ تھا۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ گھوڑا گاڑی بک گئی۔ مہریاں اور سائیس برطرف ہوئے۔ راگ رنگ کی محفلیں اٹھ گئیں۔ آپا نے برادری کی دو چھوکریوں کو پال کر ٹریننگ دینی چاہی کہ میری جگہ سنبھال لیں لیکن وہ دونوں ناکارہ نکل گئیں۔ ان میں خاندانی طوائفوں والا وقار اور ٹھسہ ہی نہ تھا اور آپا چھچھورا پن برداشت نہیں کرسکتی تھیں۔ میرے چلے جانے سے ان کا دل ٹوٹ گیا تھا اور اتنی ہمت نہ رہی تھی کہ از سرِ نو بالاخانہ آراستہ کریں۔ ان نوچیوں میں سے ایک مرلقا نامی تھی۔ اس موئی مرلقا کے ایک آشنا نے آپا پر ایسا جادو کیا کہ وہ اسی کا کلمہ بھرنے لگیں اور وہ غارت گر

ایسا حرفوں کا بنا نکلا کہ آستے رفتہ رفتہ آپا کی ساری جائیداد ٹھکانے لگادی اور خود مہ لقا کو لے کر کبھی چلتا بنا۔ آپا کو آخر دنوں میں حلق کا سرطان ہو گیا۔ اُس کے علاج کے لئے ' پرستان منزل ' گِروی رکھی۔ خدا امبا پرشاد جوہری کا بھلا کرے۔ استاد جی نے لکھا تھا بے چارے نے آخر وقت میں بڑی وضعداری سے دیکھ بھال کی لیکن وہ بھی کیا کرتا سرطان جان لیوا مرض ہے۔ دُکھیا بلرام پور ہسپتال میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مریں۔

" تو اب میں لکھنؤ جا کر کیا کرتی ؟ یا کہیں بھی جا کر کیا کرتی ؟

" جب لاحاصل ' بے مقصد محنت کرتے کرتے میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تو میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ایک گجراتی تاجر کے ساتھ رہنے لگی۔ وہ چلا گیا تو اس کی جگہ کوئی اور آ گیا۔ چند سال اس طرح کٹے تھے کہ کچہری۔ بی کا مرض عود کر آیا۔ ان چند برسوں میں کچھ روپیہ جمع کر لیا تھا اُس سے یہ مکان قسطوں پر خریدا۔ اب بورڈنگ ہاؤس چلاتی ہوں "

" محسن کا کیا ہوا ۔۔۔؟ " میں نے دریافت کیا۔

" محسن ۔۔۔ " انہوں نے چھنگلیا سے آنسو پونچھے " وہ مدتوں سے لندن کی انڈر ورلڈ میں رس بس چکا تھا اور اب برمنگھم میں کسی غیر قانونی بزنس میں مصروف تھا۔ وہاں ایک شراب خانے میں چند ویسٹ انڈین غنڈوں سے فوجداری ہوئی اور اسی میں محسن کو بھی کسی غنڈے نے چھرا مار کر ختم کر دیا۔ یہ ڈرائنگ روم کے آتش دان پر اسی جوانا مرگ کی تصویر ہے جو راجہ صاحب جگ مگ پور کی مصاحبت کے زمانے میں اُس نے پیرس میں کھنچوائی تھی۔ میرا بے چارہ بدنصیب بھیّا!

" میں یہ کاٹج خرید چکی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب اُسے بُلا کر اپنے پاس رکھوں گی۔ اُسے سُدھارنے کی کوشش کروں گی۔ طوائف کے ہاں لڑکے کی پیدائش بدنصیبی کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ اُس غریب کی زندگی کا مقصد ہی کیا تھا۔ جب پیدا ہوا تو سب کے چہرے اتر گئے۔ ذرا بڑا ہوا تو بھوکھی کے لئے ہارمونیم بجانے لگا اور بڑا ہوا تو بہن کی دلالی پر لگ گیا۔ محسن بہت ذہین اور پیارا لڑکا تھا بٹیا! یقین کیجئے، اگر اُسے اچھا ماحول میسر ہوا ہو...

۔۔۔ " اُن کے منہ سے ایک سرد آہ نکل گئی۔

"اُس کے مرنے کے بعد میں دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی۔

"محسن مرحوم کی سناونی آئے ہوئے کوئی چھ سات مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک رات دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے ہال میں جاکر کواڑ کھولا تو دہلیز پر سُرخ اوور کوٹ پہنے بھورے بالوں والی ایک آوارہ سی انگریز چھوکری گود میں ایک بنڈل سا لئے کھڑی تھی۔ میری اجازت کے بغیر اندر آگئی۔ بنڈل میز پہ رکھ دیا اور بولی "یہ تمہارے بھائی کی اولاد ہے، اِسے سنبھالو۔ برمنگھم میں تمہارے بھائی نے مرنے سے دو مہینے پہلے مجھ سے شادی کر لی تھی۔ اب میں دوسری شادی کرنے والی ہوں۔ میرا منگیتر انگریز ہے اور اس نے انکار کر دیا ہے کہ نگّر کی اولاد کو نہیں پالے گا۔ میں اِس پہ کبھی اپنا حق نہیں جتاؤں گی اطمینان رکھو۔" اتنا کہہ کر وہ لڑکی تو یہ جا وہ جا۔ میں نے بنڈل کھول کر دیکھا پیاری سی دو ماہ کی بچی پڑی بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے اُسے کلیجے سے لگا کر مولا کا شکر ادا کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے مولا نے میری دعائیں سن کر زندگی کے گھُپ اندھیرے میں میرے لئے ایک چراغ جلا دیا۔

"پھر بھی میں نے اُسکی انگریز ماں کی بات پہ پورا بھروسہ نہ کرتے ہوئے قانونی لکھا پڑھی کروا کے بچی کو متبنّٰی کر لیا۔ اُس کا نام زہرہ رکھا۔ اب ماشاء اللہ سات برس کی ہے اور بے حد ذہین!

"جس طرح میری پھوپھی نے اللہ آمین کر کے مجھے بڑے ارمانوں سے پالا تھا، میں اپنی بھتیجی کی بڑے ارمانوں سے پرورش کر رہی ہوں۔ اُس کی زندگی کس انداز کی ہوگی؟ یہ کس طرح کی دنیا میں بڑی ہوگی؟ دنیا اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟ میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔ شاید آپ ہی کچھ بتا سکیں۔ آپ رائٹر ہیں میں آپ کی کتابیں پڑھتی رہی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ زندگی کے "کیوں" اور "کیا" کی آپ کو بڑی جستجو ہے آپ ہی بتایئے۔

"پچھلے سال مجھے بیٹھے بیٹھے لکھنو یاد آیا۔ ایک ہوک سی اٹھی اور میں نے طے کیا کہ مرنے سے پہلے ایک بار وطن کی خاک آنکھوں سے لگا آؤں۔ زہرہ کو بورڈنگ اسکول میں چھوڑا اور ہوائی جہاز سے پہنچی ہندوستان۔ لکھنو جاکر ایک شناسا کے یہاں ٹھہری تو باؤلی باؤلی

سی بھری۔ ہر چیز نئی، ہر صورت اجنبی۔ سائیکل رکشا کرکے 'پرستان منزل' پہنچی۔ ایک چپڑغانے زینے کا دروازہ کھولا۔ میں نے اندر جھانکا۔ آپا کے شاندار کمرے میں عجیب چھچھوراپن دکھائی دے رہا تھا۔ ایک بازاری چھوکری کھڑی فلمی ناچ ناچ رہی تھی۔ کچھ دوکاندار اور طالبعلم قسم کے لوگ ہوحق مچا رہے تھے۔ میں نے اندر جاکر نئی بائی جی سے کہا کہ میں حسن پری مرحومہ کی لڑکی ہوں۔ ذرا ایسے ہی مکان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے آگئی تھی۔ اُن بے چاری نے بڑی آؤ بھگت کی۔ میں نے سارے کمروں کا چکر لگایا۔ جھاڑ فانوس، دیوارگیریاں، تخت پوش، ہر چیز وہی تھی لیکن ہر طرف خاک سی اڑ رہی تھی۔ پھر میں نے بالکنی میں جاکر گوری بی بی کی حویلی پر نظر ڈالی جو جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں سنسان کھنڈر سی کھڑی تھی۔ نہ جانے سب لوگ کیا ہوئے —— ؟ پھر میں اپنے کمرے میں گئی۔ چھپر کھٹ اُسی طرح رکھا تھا۔ ایک طاقچے میں میری رنگین تصویر اُسی طرح موجود تھی۔ آپا اماں کے کمرے میں گئی تو ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ مجن کی کوٹھری دیکھی تو منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ برآمدے میں وہ چولہا ٹھنڈا پڑا تھا جہاں اماں نے جب سے بیاہ کر آئی تھیں ساری عمر کھانا پکاتے گزار دی تھی۔

" تب میری نظر ایک سنگھار دان پر پڑی جو ٹوٹا پھوٹا جالوں سے اٹا برآمدے کے ایک کونے میں تخت کے نیچے پڑا تھا۔ میں نے اُسے کھینچ کر نکالا اور تخت کے کنارے پر بیٹھ کر اُس کا پٹ کھولا اور اس کے اندر لگا ہوا آئینہ دیکھنے لگی —— اور دنیا کے عروج و زوال کی ساری تصویر میرے سامنے پھر گئی۔ یہ سنگھار دان، خدا بخشے آپا بتایا کرتی تھیں کہ اُن کی سگڑنانی کو نواب علی نقی خاں بہادر نے سچے موتیوں سے بھر کر دیا تھا اور میں نے سوچا، اس آئینے میں گزرے ہوئے وقت میں کتنی حسیناؤں نے کیسے کیسے غرور اور ناز کے ساتھ اپنا عکس دیکھا ہوگا۔ ایک حسن فروش عورت کے حسن کی عمر حد سے حد پندرہ برس رکھ لیجئے اور یہ آئینہ ڈیڑھ سو سال پرانا ہے۔ فانی حسن کے کتنے عکس اس کی سطح پر جھلملا کر ہمیشہ کے لئے غائب ہوگئے۔ وہ آئینہ دیکھ کر میں جانے کیا کیا سوچا کی۔ میرے سامنے صرف میری صورت تھی —— کھچڑی بال، جلی ہوئی رنگت، ویران ہولناک چہرہ، سونی آنکھیں۔ یہ میرا چہرہ اس آئینے کی طویل زندگی کا گویا آخری باب تھا۔ سدا رہے نام اللہ کا!

"میں نے سنگھار دان کا پٹ بند کر دیا اور اندر جا کر بائی جی سے کہا کہ اگر وہ اجازت دیں تو میں اسے نشانی کے طور پر اپنے ساتھ لے جاؤں۔ اُن غریب کی سمجھ میں نہ آیا کہ قیمتی سامان چھوڑ کر میں یہ شکستہ سنگھار دان کیلے جانے پر کیوں مصر ہوں۔ خیر تو میں نے سنگھار دان اٹھا کر 'پرستان منزل' کو آخری بار خدا حافظ کہا اور نیچے اُتر آئی۔

"چند روز بعد میں لکھنو سے بمبئی آئی، جہاں سے سمندری جہاز کے ذریعے میں واپس لندن جانے والی تھی۔ بمبئی میں ایک معمولی سے ہوٹل میں ٹھہری۔ صبح کو کچھ خریداری کرنے کے لئے بازار گئی۔ جب لوٹی تو دیکھا سنگھار دان غائب ہے۔ اُسے ہوٹل کا کوئی ملازم چرا کر لے گیا۔ سوچا ہو گا چور بازار میں بیچ کر دس پندرہ روپے کھرے کرے گا۔

"قصہ مختصر، میں لندن واپس آگئی اور یہاں جیسا کہ آپ نے دیکھا آرام سے کٹ رہی ہے۔ زہرہ کو اردو، قرآن شریف اور نماز سکھا رہی ہوں۔ کرائے دار میری عزت کرتے ہیں۔ ہر طرح سے اللہ کا شکر ہے۔ رہا آبائی پیشہ ــــ جی ہاں ــــ آپ کی شکل سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ یہ سوال کرنے والی ہیں لیکن مارے اخلاق کے کرنا نہیں چاہتیں، تو بیٹا اُس پیشے سے مجھے ہمیشہ سے دلی نفرت تھی لیکن آپ نے دیکھا کہ مجبوری نے سب کچھ کرایا۔ نہیں۔ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ مولا کی دین ہے۔ عزت سے دو وقت کی روٹی مل رہی ہے۔"

ہم کھانا ختم کر چکے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ مس زمرد علی نے کہا، "چلئے آپ کو بس اسٹاپ تک پہنچا آؤں۔ آپ نے اتنی دیر میرے پاس بیٹھ کر میری داستان سنی اس کے لئے میں ہمیشہ آپ کی ممنون رہوں گی۔ آپ کا گوری بی بی کی حویلی سے تعلق ہے۔ اس طرح ایک لحاظ سے آپ کا میرے ماضی سے تعلق ہے اس لئے میں آپ کو یہ سب بتانا چاہتی تھی۔"

ہم لوگ کالج سے نکلے۔ سڑک کے موڑ پر بس آکر رکی۔ میں بس میں سوار ہوئی اور مس زمرد حسین علی، سیاہ اوور کوٹ اور سیاہ دستانے پہنے، لیمپ کی دھندلی روشنی کے نیچے ماپچ کی رات کے کہرے میں کھڑی رہ گئیں۔

اتفاقات کا یہ عجیب وغریب سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ بمبئی کی ایک جہازی عمارت میں جس کے ہر فلیٹ کا کرایہ دو ہزار روپے ماہوار ہے، زیادہ تر غیرملکی، جرمن، روسی، امریکن اور انگریز رہتے ہیں۔ اُن میں سے ایک امریکن خاندان سے میری واقفیت ہے۔ اُن لوگوں کے یہاں جن کا نام مسٹر اور مسز جان ڈریک ہے۔ جب میں پہلی بار گئی تو مسز ڈریک نے بڑے اشتیاق سے مجھے وہ نوادر دکھائے جو ہر تازہ وارد امریکن بھاری قیمتوں پر ہندوستان میں خریدتا ہے۔ جنوبی ہند کی مورتیاں، راجستھانی تصویریں، نیپالی مجسمے اور ایسی ہی بہت سی چیزیں۔ مسز ڈریک کے ایک کمرے کے کونے کی میز پر ایک سبز رنگ کا سنگھار دان رکھا دیکھ کر میں ٹھٹک گئی۔ اُسی وضع کا پرانے ہندوستانی فیشن کا ایک آئینہ ہمارے یہاں بھی تھا اور گودام میں پڑا رہتا تھا کیونکہ انگریزی ڈریسنگ ٹیبل کے دَور میں اُس قدیم طرز کے آرٹسٹک آئینہ کی جگہ کباڑ خانہ ہی مناسب سمجھی گئی تھی۔ لیکن مسز جان ڈریک کے سنگھار دان کو دیکھ کر مجھے اپنے اُس آئینے کے علاوہ کوئی اور پرانی بات بھی یاد آئی۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا بات ہے۔ میں نے مسز ڈریک سے پوچھا کہ یہ سنگھار دان انہیں کہاں سے ہاتھ لگا؟

"چور بازار سے۔" انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "بمبئی کے چور بازار میں بڑے بڑے نوادر مل جاتے ہیں۔۔۔ یہ دیکھئے یہ روز ووڈ کی فرنچ اسٹائل الماری ٹیپو سلطان کے لئے میسور میں بنائی گئی تھی اور یہ گوا کا مخصوص صوفہ ـــــ سابق ہندوستانی رجواڑوں اور پرانے پارسیوں کے گھروں سے نکلا ہوا پیریڈ فرنیچر چور بازار میں بے حد سستا مل جاتا ہے۔ یہ کرسی دیکھئے ـــــ"

"مگر یہ سنگار دان ـــــ" میں نے دُہرایا۔

"اس کا تو کمال ہو گیا۔ یہ سوچئے ہوئے کہ یہ پہلے دہلی کے ریڈ فورٹ میں تھا اور شاید اسے مغل کوئن نور جہاں نے بھی استعمال کیا ہے ـــــ"

"یا اللہ ـــــ" مسز جان ڈریک کافی بے وقوف خاتون معلوم ہوتی تھیں۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ سنگھار دان مغل کوئن نور جہاں تو خیر ہرگز استعمال نہیں کرتی تھی۔ لیکن یہ ہندوستان کی تاریخ کے ایک خوبصورت، اندوہناک اور ٹریجک باب میں ضرور

شامل رہ چکا ہے۔ میں نے اس کا پٹ کھول کر آئینے پر نظر ڈالی، اسکے خانوں کو دیکھا اور نجانے کیوں مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سنگھار دان سلطنتِ اودھ کے وزیرِاعظم علی نقی خاں بہادر نے سچے موتیوں سے بھر کر دمڑدیری کی سگڑنانی کو تحفے میں دیا تھا۔

"آیئے کافی پیئیں۔ پھر میں آپ کو بتاؤں گی کہ میں نے یہ راجستھانی تصویر کس طرح خریدی جسے رانی جودھا بائی کے ذاتی مصور نے بنایا تھا۔ آپ کو انڈین ہسٹری سے بہت دلچسپی ہے۔ بتایئے یہ لارڈ بدّھا کی مورتی ــــ"

میں نے مسز ڈریک کو بے حد کوفت کے ساتھ دیکھا۔ میں مسز جان ڈریک کو "انڈین ہسٹری" کے متعلق آخر کیا بتا سکتی تھی؟

قرۃ العین حیدر

ایک پرانی کہانی

یہ جوان گنت اندھے فقیر ہمیں سڑکوں کے کنارے کنارے چلتے، درختوں اور شکستہ دیواروں کے سائے میں بیٹھے، المونیم کا میلا کٹورہ ہاتھ میں لئے بھیک مانگتے نظر آتے ہیں، کبھی ہم نے اپنا روشن راستہ طے کرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک کر سوچا ہے کہ انکی زندگیوں کی کہانی کیا ہوگی؟ یہ کہاں پیدا ہوئے۔ ان کے ماں باپ کون تھے، گھر بار کیسا تھا، انہوں نے کب اور کس طرح آنکھیں کھوئیں۔ کب سے اس طرح ٹٹول ٹٹول کر چلتے ہوئے، گھگھیا گھگھیا کر خیرات مانگ رہے ہیں اور ایک دن اسی طرح مر جائیں گے۔ یعنی ایک گمنام اندھیرے سے نکل کر دوسرے گمنام اندھیرے میں داخل ہو جائیں گے۔ اور ان کی زندگی اور موت سے کسی کے لئے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جوان اندھی بھکارنیں جنکے متعلق آج سے تیس چالیس برس قبل بڑے رومینٹک افسانے لکھے جاتے تھے، ہاتھ میں لمبی تسبیح لئے سفید کرتا پہنے نابینا حافظ، اگربتیوں کے پیکیٹ یا مدینہ منورہ کی چھوٹی چھوٹی تصویریں سنبھالے اندھے، تلسی مالائیں پہنے رام نام کا واسطہ دیتے سورداس، پھٹا پرانا کوٹ پتلون پہنے وائلن بجاتے عیسائی بھکاری، چلتی ٹرین میں چڑھ کر دلدوز آواز میں نعتیں پڑھتے یا دوتارہ بجا کر بھیک مانگتے اندھے، بش شرٹ اور پتلون میں ملبوس بے بس، مسکین چہروں والے نوجوان اندھے، سفید رنگ کی چھڑی سنبھالے خاموشی سے ادھر ادھر چہرہ گھما کر سڑک کے خطرناک ٹریفک میں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے اندھے، پلیا کے نیچے، یا عالیشان کوٹھیوں کے پھاٹک پر صبر کے ساتھ سامنے پھیلی چادر پر سکوں کے گرنے کی آواز سننے کے منتظر اندھے، مندروں اور درگاہوں کے احاطوں پر نعرے لگاتے اندھے، ــــ

مشرقی ممالک کے ان لاکھوں اندھوں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ نہ کسی کو انکے متعلق سوچنے کی فرصت ہے۔ اندھے ہمارے سماجی پس منظر کا اتنا ہی لازمی حصہ ہیں جتنے کوڑھی، فٹ پاتھ پر سونے والے مرد اور عورتیں اور گلیوں اور سڑکوں پر آوارہ پھرنے والے فاقہ کش بچے ہمارے معاشرے کا جزو ہیں۔ ہم ان کی طرف دھیان بھی نہیں دیتے۔

اتفاق سے ایک اندھے فقیر کی کہانی میں جانتی ہوں۔ اور آپ کو سنانا چاہتی ہوں۔ یہ اندھا فقیر جو برسوں دہرہ دون کی ایک بے حد پُر فضا سڑک کے کنارے جس کے ایک طرف خوبصورت کوٹھیاں تھیں اور دوسری طرف شفاف پانی کی شور مچاتی پہاڑی نہر بہتی تھی، بیٹھا بھیک مانگا کرتا تھا۔ جب پالا گرتا تھا تب بھی اور جب تیز دھوپ میں کول تار کی سڑک پر دھواں سا اٹھتا تھا، تب بھی، وہ ایک نیلے پتھر پر کشمیری نمدے کا ایک غلیظ اور کرم خوردہ ٹکڑا بچھائے ساکت بیٹھا رہتا تھا۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہاتھ پھیلا کر اللہ — اللہ — کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی جگہ جو سرخ دھنسے ہوئے ڈیلے سے تھے، وہ دائیں بائیں گھومتے رہتے تھے۔ اور اس کی بکرے کی سی داڑھی ہلتی رہتی تھی۔ وہ ہر بوڑھے اندھے بھکاری کی طرح بہت ہی غلیظ۔ گھناؤنا اور بدہئیت بوڑھا اندھا بھکاری تھا۔

"کھدمت گار — خانساماں جی آئے ہیں"۔ روز صبح نو بجے پچھلے برآمدے میں ایک ڈپٹ دار آواز سنائی دیتی۔ اس کے بعد خانساماں جی بُوٹ سیڑھیوں پر اتارتے مودبانہ انداز سے چق اٹھا کر سفید موزوں میں دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوتے اور تقریباً فرشی سلام کرنے کے بعد بغل سے رجسٹر نکال کر سودے کا حساب پیش کرتے۔ یہ رجسٹر خانساماں جی کی ہستی کی طرح انوکھا تھا۔ اور میں اکثر خانساماں جی سے فرمائش کرتی تھی کہ وہ مجھے اس کے مطالعے سے بہرہ ور ہونے کی اجازت دیں۔ خانساماں ایسے رسم الخط میں حساب لکھتے تھے جو قدیم مصری رسم الخط کا ہم پلہ تھا اور انہوں نے خود ایجاد کیا تھا۔ مثلاً گوشت کے لئے بکرے کی تصویر، مرغی انڈے گاجر چقندر آلو وغیرہ کے لئے ان کی تصاویر۔ روپے آنے پائی اور سیر یا چھٹانک کے لئے بہت پُراسرار نشانات انہوں نے خود مقرر

کئے تھے۔ حساب میں اگر کسی شخص کا نام لکھنا ہوتا تو اس کی جگہ اس کی شکل بنا دی جاتی۔ اپنی تصویر وہ بڑی تفصیل سے بناتے تھے۔

خانساماں جی کے اصل نام سے کوئی واقف نہ تھا۔ ان کا اور ان کی بیوی اللہ دی کا ہم لوگوں سے تعارف بُدھن کے ذریعے ہوا تھا جو خورجے کی ایک خاتون تھیں اور کبھی کبھار دوپہر کے وقت ہماری طرف آنکلتی تھیں اور برآمدے کے فرش پر دھوپ میں لیٹ کر "رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد" الاپا کرتی تھیں۔ بُدھن جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں سلائی کر کے اپنا پیٹ پالتی تھیں۔ ایک روز ان کے ساتھ ایک بوڑھی خاتون بھی آئیں جنہوں نے سرخ "ریشم" کا دوپٹہ "کیلے" کی قمیص اور گلابی رنگ کا تنگ پائجامہ پہن رکھا تھا اور کلائیوں میں ہری ہری فیروز آبادی چوڑیاں کھنکھنا رہی تھیں۔ بُدھن نے تعارف کرایا کہ یہ اللہ دی ہیں اور ان کے میاں خانساماں جی صاحب لوگ کے یہاں بڑے معرکے کا کھانا پکاتے ہیں۔ مگر آج کل روزگار سے نہیں ہیں۔

اس کے چند روز بعد خانساماں جی ہمارے یہاں کام کرنے کے لئے آگئے۔

خانساماں جی ایک بہت بڑا چوبی صندوق بھی اپنے ساتھ لائے تھے جو انہوں نے اپنی کوٹھری میں بڑے قرینے سے ایک طرف رکھ کر اس پر کڑھا ہوا میز پوش بچھا دیا۔ دیواروں پر انگریز بچوں کی تصویریں لگائیں اور کاغذی پھولوں والا ایک گلدان بھی طاق میں سجا دیا۔ اللہ دی ایک بے حد سلیقہ مند خاتون تھیں اور اپنی کوٹھری کو آئینے کی طرح صاف رکھتی تھیں۔ میاں بیوی لاولد تھے اور ایک دوسرے کے لئے وقف۔ شوہر کی خدمت اور پرستش تو خیر اللہ دی کا فرض تھا مگر خانساماں جی بھی بیوی کو بہت چاہتے تھے۔ وہ خود جتنے ذہین تھے اللہ دی اتنی ہی بے وقوف تھیں اور خانساماں جی بڑے پیار سے ان کی مختلف حماقتوں کا ذکر کرتے تھے۔

خانساماں جی پیٹ بھر کے بدقطع تھے۔ چپٹی ناک۔ بے حد کالا رنگ۔ بہت بڑی توند۔ کبڑی ٹانگیں۔ چگی داڑھی ہنستے تو باچھیں کانوں تک پھیل جاتیں۔ بے حد خوش مزاج تھے۔ کسی زمانے میں پیری مریدی بھی کر چکے تھے۔ گنڈے تعویذ کے استاد تھے اور

صاحب لوگ کے ساتھ انگلستان تک ہو آئے تھے۔ رنگون اور مانڈلے اور مدراس اور پونا تو ان کے لئے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ لنڈھور کی داستان ان کی پسندیدہ داستان تھی۔ خالق باری زبانی یاد تھی۔ جب ان سے کہا جاتا۔ خانساماں جی خالق باری ہو جائے۔ تو وہ فوراً صافہ اتار کر سر پر ہاتھ پھیرتے۔ دوبارہ صافہ پہنتے اور کھنکار کر شروع کرتے ــــ

کھالک باری سرجن ہار واحد ایک بڑا کرتار

اسم اللہ خدا کا ناؤں گرما دھوپ یا یہ چھاؤں

رسول پیغمبر جان بسیت یار دوست بولے جو میت

خانساماں جی کے سرٹیفکٹوں پر ۱۸۹۹ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک کی تاریخیں پڑی تھیں اور انگریز فوجی اور سویلین افسروں کی ان "چھٹیوں" سے، (جن میں سے اکثر کے کاغذ پیلے اور شکستہ اور روشنائی مدھم ہو چکی تھی) ہندوستان کی کولونیل سماجی تاریخ کے ایک معنی خیز باب پر روشنی پڑتی تھی۔

ایک روز مجھے کسی شرارت پر بہت زبردست ڈانٹ پڑی تھی اور میں پہلو کے سنسان برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی چپ چاپ زار و قطار رونے میں مصروف تھی۔ اتنے میں خانساماں جی ادھر سے گذرے ٹھٹھک کر مجھے دیکھا اور آگے چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد آنسوؤں کی جھلملاہٹ میں سے مجھے سبزے پر گلابی دوپٹہ لہراتا نظر آیا۔ اور اللہ دی قریب آ گئیں۔ اور مجھے بڑی ملائمیت سے اپنی کوٹھری میں مدعو کیا۔ میں آنسو پونچھ کر خاموشی سے ان کے ساتھ ہو لی۔

کوٹھری میں خانساماں جی اپنا سیاہ چوبی صندوق کھولے میرے منتظر بیٹھے تھے مجھے دیکھ کر انہوں نے صندوق کا سامان نکال کر فرش پر پھیلا دیا اور بڑی تندہی سے کچھ تلاش کرنے لگے۔

صندوق میں سے جو تام جھام نکلا وہ میرے لئے بے حد پراسرار ثابت ہوا۔ پرانے فیشن کے جھالر دار فراک۔ سمور کے شکستہ کوٹ اور پشمین سلوکے۔ طرح طرح کی ٹوپیاں۔ چینی کے برتن۔ ٹوٹی موئی گھڑیاں اور ٹائم پیس۔ جاپانی پنکھیاں۔ مالائیں۔ بروچ۔ باتصویر

انگریزی کتابیں۔ آرائش کا دقیانوسی سامان۔ اور سرخ ریشمین رومال میں لپٹا سرٹیفکیٹوں کا پلندہ۔ خانساماں جی نے بتایا کہ یہ ساری چیزیں ان کو ان کے مختلف صاحب میم لوگ نے ولایت جاتے وقت اپنی نشانی کے طور پر دی تھیں۔ اور ان کا سرمایۂ حیات تھیں۔ "پہلے وقتوں کا صاحب لوگ بہت نیک ہوتا تھا بیٹیا" انہوں نے کہا۔ مگر جب سے یہ کانگریس نے دُندنچایا ہے صاحب لوگ بھی بدل گیا ہے۔" ڈھونڈ ڈھانڈ کے انہوں نے ایک بڑی سی سوتی جاگتی انگریزی گڑیا نکالی۔ اسے بڑی احتیاط سے جھاڑا پونچھا اور ادب سے میرے سامنے رکھ دیا۔ میرا جی چاہا کہ لپک کر گڑیا اٹھاؤں مگر خیال آیا کہ ڈانٹ پڑے گی۔ خانساماں جی اور اللہ دی مجھے بڑی پُر امید نظروں سے دیکھتے رہے۔ آخر ہچکچاہٹ کے ساتھ میں نے گڑیا اٹھائی اور خوشی اور گھبراہٹ کے مارے شکریہ ادا کئے بغیر جلدی سے باہر بھاگ آئی۔

اس کے بعد جب بھی خانساماں جی اس عمر عیار کی زنبیل کو اپنے برآمدے میں دھوپ دیتے تو میں جاکر وہاں بیٹھ جاتی اور وہ اِن پرانی دھرانی چیزوں سے وابستہ اپنی کہانیاں سنایا کرتے۔ یہ الم غلم ان کے لئے بالکل بیکار تھا مگر وہ اسے حرزِ جاں بنائے ہوئے تھے۔

ہم لوگ دہرہ دون سے لکھنؤ آنے والے تھے۔ مگر خانساماں جی ساتھ چلنے پر راضی نہ ہوئے۔ کیونکہ اللہ دی بیمار رہنے لگی تھیں۔ اور پردیس جانے پر آمادہ نہ تھیں۔ خانساماں جی کو ہم لوگوں سے جدا ہوتے کا بڑا قلق تھا۔ مگر انہوں نے کہا "اس نیک بخت نے ساری عمر ہرج مرج میں میرا ساتھ دیا ہے۔ جوانی میں میں نے اس کے دل کو بہت بھاری دکھ بھی پہنچائے ہیں۔ اب آخر وقت میں اس ستونتی کی بات کیسے ٹال دوں۔" اس کے بعد آنکھیں پونچھتے کشمیری نمدہ اٹھائے (جو انہوں نے نشانی کے طور پر مانگا تھا) وہ شاگرد پیشے کی طرف چلے گئے۔

جس روز ہم دہرہ دون سے روانہ ہونے والے تھے اور سارا سامان مال گاڑی پر لادنے کے لئے اسٹیشن بھیجا جا چکا تھا خانساماں جی کہیں سے ایک چھوٹا سا ٹھیلہ لے آئے۔ چوبی صندوقچی تو اسے ایک تپائی پر اس پر چڑھایا اور بڑی احتیاط سے نمدہ اس کے اوپر بچھا دیا۔

اللہ دی صندوق کا کنڈا پکڑ کر ٹھیلے پر چڑھیں اور اپنے گلابی دوپٹے کا گھونگھٹ کاڑھ کر بندریا کی طرح صندوق پر پیچھے منہ کر کے بیٹھ گئیں۔ خانساماں جی نے "یاغوث العظم" کا ہلکا سا نعرہ لگایا اور سر جھکائے ٹھیلہ دھکیلتے پھاٹک سے باہر نکل گئے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے دوڑی۔ مگر وہ سر جھکائے ٹھیلہ دھکیلتے کرزن روڈ پر بہت دور نکل چکے تھے۔

تین سال نکل گئے۔ ہم لوگ کچھ عرصے کے لئے دہرہ دون گئے ہوئے تھے۔ ایک روز میں کرن پور کے محلے میں اپنے چند عزیزوں کے یہاں اتوار منا رہی تھی۔ ان کا مکان بڑا پراسرار سا تھا۔ برابر برابر میں دو آنگن سا کے ساتھ مسجد اور امام باڑہ۔ لمبے لمبے کمرے جن کے اونچے روشندان پیچھے صاف ستھری گلی میں کھلتے تھے۔ روشندانوں کے شیشے نیلے اور نارنجی اور سبز تھے۔ دوپہر کو جب ان میں سے ایک طویل کمرے میں دھوپ آتی تو لگتا جیسے یہ کمرہ سمندر کی تہہ میں ہو پانی کی لہریں دیوار پر جھلملاتی ہوں۔ اس کمرے میں ایک قطار میں پلنگ بچھے تھے اور میں ہم سن ساتھیوں کے ساتھ پلنگوں اور الماریوں پر کود کود کر اودھم مچانے میں مشغول تھی۔ کہ دفعتاً گلی میں سے آواز آئی ـــ "تحفہ کباب ـــ تحفہ کباب لے لو ـــ تحفہ کباب ـــ" پھر وہ آواز دور چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک بچہ تام چینی کی میلی سی رکابی میں سیخ کے کباب لئے اندر آیا۔ "باجی ـــ لیجیے کباب ـــ" اس نے ایک الماری پر چڑھ کر رکابی میری جانب بڑھائی۔ میں نے دوسری الماری کی چھت پر سے ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی تو پلیٹ نیچے گر گئی۔

برابر کے کمرے سے کسی آپا نے ڈانٹا ـــ

"یہ کیا ہلّڑ ہو رہا ہے ـــ"

"کبڑا کبابی باجی کے لئے کباب لایا ہے۔" بچے نے جواب دیا۔

"تو لے لو اور اسے پیسے دے آؤ ـــ" آپا نے آواز دی۔

"وہ پیسے نہیں لیتا۔"

اتنی دیر میں الماری سے کود کر امرود کے درخت پر چڑھنے کے ارادے سے باہر نکلی تو

برابر کے کمرے سے انہی آپا نے مجھ سے کہا "لفاتن بوا سے کہو کبابیے کو پیسے دے دیں۔" چنانچہ میں لفاتن بوا کو پکارتی پچھلی ڈیوڑھی کی طرف گئی جو گلی میں کھلتی تھی۔

ڈیوڑھی میں کیا دیکھتی ہوں کہ خانساماں جی میلے چکٹ کپڑے پہنے لپا جھپ چھوٹی سی انگیٹھی دہکاتے ہوئے آواز لگا رہے ہیں ـــــ "ارے میری بٹیا کے لئے کباب لے جاؤ گرما گرم ـــــ"

"خانساماں جی ـــــ" میرے منہ سے نکلا۔

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ باچھیں کانوں تک پہنچ گئیں۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور جلدی سے ہاتھ جوڑ کر بولے۔

"آج ہی میں نے لفاتن بوا کے لونڈے سے سنا کہ بٹیا لکھنؤ سے آئی ہیں سو میں کباب لے کر حاضر ہو گیا۔" اتنا کہہ کر وہ تندہی سے سیخ الٹنے پلٹنے میں مصروف ہو گئے۔ میں متعجب اور اداس ان کو دیکھتی رہی اور سوچنے لگی کہ اتنے ٹھاٹ باٹ اور آن بان کے خانساماں جی کو بازاری کبابیہ بنتے ہوئے کس قدر تکلیف ہوئی ہو گی۔

"مگر آپ نوکری کیوں نہیں کرتے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ لوگوں کے جانے کے بعد کولا گڈھ میں ایک صاحب کے یہاں کام ملا تھا مگر انہیں معلوم ہوا کہ گھر والی کو بڑی بیماری ہے اسنے چھٹی دے دی۔"

"اللہ دی کہیں ہیں اب؟"

"گذر گئی۔" انہوں نے دھوئیں سے سیاہ ٹوٹے ہوئے پنکھے سے انگیٹھی دہکاتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر ایک اور میم کے یہاں کام ملا۔ مگر وہ جھک جھک بہت کرتی تھی۔ اسنے گالی دی۔ ـــــ ڈیم بلاڈی باسٹرڈ ـــــ نگر ـــــ بلیک مین ـــــ میں نے کہا ـــــ سلام ـــــ اور چلا آیا۔ بٹیا اب اس سفید داڑھی کے ساتھ انگریز کی گالی نہیں سہی جاتی" ـــــ

"مگر اللہ دی ـــــ" میں نے پھر کہا۔

"مر گئی نیک بخت۔ خیراتی ہسپتال میں ڈالا۔ مر گئی تو توپ دیا۔ اب اکیلی جان کے لئے

کیا غلامی کروں۔ اتنا بوڑھا ہو گیا ہوں بیٹیا ــــ سجھائی بھی کم دیتا ہے اب مجھے کون نوکر رکھے گا۔"
" اور آپ کا وہ صندوق ــــ" وہ الف لیلوی صندوق ــــ میں نے دل میں اضافہ کیا۔

" اللہ دی کی بیماری کا خرچہ بہت تھا۔ بٹیا۔ جب کہیں سے پیسے اُدھار نہیں ملے تو ساری پیٹی کباڑیے کے ہاتھ اونے پونے بیچ دی۔ یہ لیجئے گرما گرم ــــ تحفہ کباب ــــ

ستمبر ۱۹۴۷ء میں چند روز قبل مسوری سے واپس آئی تھی اور ایسٹرن کنال روڈ پر خوبصورت بیلی لاج کے برآمدے میں اخبار میں تقسیم کی تفصیلات، اور ہندو پاکستان کا نیا نقشہ دیکھنے میں مصروف تھی۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور ریڈیو پر مسوری کے فسادات کی خبریں آ رہی تھیں۔ اتنے میں دور پھاٹک پر ایک ہیولے سا ڈولتا نظر آیا۔
" جاؤ اسے اکنی دے آؤ ــ" میری میزبان بیگم مسعود نے ملازم سے کہا۔ ملازم نے چند منٹ بعد واپس آ کر کہا کہ وہ اندھا فقیر مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔
" مجھ سے ــــ ؟" میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں جلدی سے باہر نکلی۔ نابینا بھکاری آنکھوں کے سرخ ڈیلے دائیں بائیں گھماتا پھاٹک پر چپ چاپ کھڑا تھا۔
"خانساماں جی ــــ" میں نے بھاگتے ہوئے قریب جا کر کہا۔ وہ لاٹھی سے ٹٹولتا ٹٹولتا آگے بڑھا۔ بجری پر بیٹھ کر میرے پاؤں پکڑ لئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے اور بڑبڑانے لگا۔
" مر گیا مرنے والا ــــ جنتی تھا ــــ جنت کو گیا ــــ"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ میرے والد کے انتقال کی خبر سابقہ خانساماں جی اور موجودہ اندھے بھکاری نے بیگم مسعود کے کسی ملازم سے شاید حال ہی میں سنی تھی اور جب ہی یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ میں وہاں آئی ہوئی ہوں۔ میں ان سے یہ بھی پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی کہ انہوں نے آنکھیں کب کھوئیں اور کب سے بھیک مانگ رہے ہیں۔ ان سوالوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں گم سم کھڑی ان کو دیکھتی رہی۔
" اتنی عمر میں آپ نے بہت بھاری دکھ دیکھ لئے بیٹیا ــــ" انہوں نے اپنی بے نور

آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

اور ابھی بہت دکھ باقی ہیں۔ میں نے دل میں کہا۔

"مسلمانانِ دہرہ دون ــــ خبردار ہو جاؤ ــــ" مسلم لیگ کے رضا کار ایک کار میں لگے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کرتے ہوئے دن سے گذر گئے پھر چند سائیکل سوار سڑک پر سے گذرے۔ انہوں نے سائیکلوں پر ترنگے کے بجائے نارنجی اور سفید، صرف دو رنگوں کے جھنڈے لگا رکھے تھے۔

ابھی بہت سے دکھ اٹھانے باقی ہیں۔ میں نے دل میں دہرایا۔

"باجی ــــ شفیع احمد قدوائی مارے گئے۔" میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ برساتی میں نکل کر بیگم مسعود کی لڑکی صوفیہ روتے ہوئے چلا رہی تھی "ابھی ابھی مسوری سے فون آیا ہے۔"

میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"کیا ہوا؟ کیا ہو رہا ہے؟" خاناماں جی نے چہرہ اوپر اٹھا کر سوال کیا۔

"باجی ــــ" صوفیہ نے دہشت زدہ اور سراسیمہ آواز میں پھر پکارا۔

"میں ابھی آتی ہوں خاناماں جی ــــ"

"اچھا میں یہیں بیٹھا ہوں۔" وہ لاٹھی ٹیک کر اٹھے اور کانپتے ٹٹولتے ہاتھوں سے پھاٹک کے کھمبے کا سہارا لے کر پلیا پر بیٹھ گئے۔

میرے اندر واپس جاتے ہی ایک فوجی عزیز کی کار زناٹے سے برساتی میں آن کر رکی۔ اور فوجی عزیز نے مجھ سے کہا کہ میں فوراً ان کے ساتھ گھر چلوں کیونکہ شام کی گاڑی سے ہم لوگ دہرہ دون سے روانہ ہو رہے ہیں۔

لیکن روانگی کے انتظامات میں بہت دیر لگ گئی اور جب ہم لوگ ہلی لاج سے نکلے تو دن ڈھل چکا تھا۔ سڑک پر پہنچ کر میں نے فوجی عزیز سے کہا کہ کار روک لیں۔

"کیوں؟ اب کسی سے ملنے ملانے کا وقت نہیں ہے۔ ٹرین چھوٹ جائے گی۔" انہوں نے گھبرا کر جواب دیا اور تیزی سے میونسپل روڈ کی طرف بڑھ گئے۔ ای۔ سی۔ روڈ پر سے گذرتے ہوئے اچانک میں نے دیکھا کہ دور، نہر کی منڈیر کے نیچے ایک نیلے پتھر پر اس کشمیری نمدے کا ٹکڑا

نے مسس پر اللہ دی کو بٹھال کر دہ ہمارے گھر سے نکلے تھے، خاناماں جی ہاتھ پھیلائے اللہ اللہ ــــ اللہ ــــ کر رہے ہیں۔ ان کے سامنے تام چینی کی میلی رکابی خالی پڑی تھی۔

ہم لوگ میونسپل روڈ پر الگزنڈرا پلیس ALEXANDRA PLACE میں مقیم ۔بے حد وسیع وعریض اور سخت رومانٹک الگزنڈرا پلیس کسی زمانے میں انگریزوں کا رہائشی تھا اور اسے ہمارے ان عزیزوں نے اپنی رہائش کے لئے خرید لیا تھا۔ اسکے جالی دار دریچوں ب کی بیلیں چڑھی تھیں اور کمروں میں انگریزوں کے وقت کی تصاویر اب تک آویزاں جس وقت میں واپس پہنچی تو سامان باندھا جا چکا تھا اور چمکیلے چوبی فرش اور شاہ بلوط یواروں والا عمین بال روم ڈھنڈار سا پڑا تھا۔ صرف ملک معظم شاہ برطانیہ اور لارڈ لارڈ ارون اور دوسرے والسرائے گان ہند کی تصاویر وسیع آتشدان کے اوپر ہمول سکون اور تمکنت کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔

اس شام ہم کسی وجہ سے روانہ نہ ہو سکے۔ رات کو گھر والے کوٹھی کی اونچی نیچی سرخ ں پر بندوقیں لیئے ٹہلتے رہے۔ چاروں طرف اندھیرے باغ میں اونچے اونچے درخت یا کئے اور سامنے مسوری کی روشنیاں جھلملاتی رہیں۔ پچھلے پہر ٹوٹ کر مینہ برسا۔ صبح آسمان صاف تھا اور فضا میں پھلوں اور پھولوں کی مہک امنڈ رہی تھی۔ ناشتے کے کچھ ضروری چیزیں لینے کے لئے اپنے گھر "آشیانے" گئی جس میں چند روز قبل ڈسٹرکٹ ٹے نے تین سشرنارتھی خاندانوں کو ٹھہرا دیا تھا۔ ان کنبوں کے بیشتر افراد مارے گئے تھے ۔بھی جوان لڑکی ان کے ساتھ نہیں تھی۔ بیں لیچیوں کے نیچے سے گذرتی گھر ب میں پہنچی اور جلاوطنی، تباہ حالی اور اس بدقسمت ملک کے بھیانک المیے ذیر پہلی مرتبہ اچانک میری آنکھوں کے سامنے آگئی ــــ پچھلے برآمدوں میں پوٹلیاں پڑی تھیں۔ ایک عورت سر پر پٹی باندھے کھاٹ پر لیٹی کراہ رہی تھی۔ کچھ عورتیں ہاں سدگا کر ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ اور مرد گھاس پر کھاٹ بچھائے بالکل اس بیٹھے تھے۔ ایک بوڑھا سردار ایک برآمدے کے در میں نماز کے پرانے تخت پر

بیٹھا جپ جی صاحب کا پاٹھ کر رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ان بوڑھوں میں سے ایک سے کہا کہ میں باکس روم کھولنا چاہتی ہوں۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا "مالک مکان ہو آپ ــــ؟"

"جی ــــ"

"مسلمان ــــ؟"

"جی ــــ"

دفعتاً میں نے نظریں اٹھائیں اور خود کو سات آٹھ جٹادری سرداروں کے گھیرے میں پایا۔ عورتیں بھی اپنے اپنے کام چھوڑ کر میرے گرد جمع ہو گئیں۔ وہ سب بالکل چپ تھے۔ اتنے میں سرداروں میں سے ایک کی گونجتی ہوئی آواز بلند ہوئی ــــ "اگر ہم چاہیں تو تم یہاں سے زندہ واپس نہیں جا سکتیں"۔

یہ اس قدر اچانک تھا کہ ایک لمحے کے لئے میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ میں اپنے گھر کے آنگن میں کھڑی تھی۔ اور یہ جلا وطن پردیسی جن کے گھر آنگن ان سے چھِن گئے تھے، جن کی جوان بیٹیاں اور بہوئیں لاپتہ تھیں، اس پرانے "باوقار" آشیانے" کے زخمی اور آشفتہ حال نئے مکین تھے۔ یکلخت میرے ذہن میں ایک خیال کوندا ــــ ہر لمحہ ساری کائنات کی تاریخ کا نچوڑ ہے ــــ ہر لمحہ ہمارے ملک کی ساری تاریخ کا نچوڑ ہے۔ اور قومی اتہاس کے اس خوفناک موڑ کر پہنچ کر میں اور یہ میرے ہم وطن، اس صورت میں ایک دوسرے کے سامنے موجود ہیں کہ ہمارے درمیان موت اور خون کی تاریک گھاٹیاں سنسنا رہی ہیں، اس وقت مجھ میں نجانے کہاں سے ہمت آگئی۔ میں نے سر اٹھا کر بوڑھے سرداروں کو دیکھا اور کہا ــــ "اگر مجھے مار کر آپ کے دلوں کو شانتی مل جائے تو ضرور مار ڈالیئے ــــ"

چند لمحوں تک مکمل سناٹا طاری رہا جس میں قریب کھڑا چمپا کا درخت سرسرایا کیا اوپر آسمان بے حد شفاف اور نیلا تھا۔

دفعتاً ایک بوڑھا سردار آگے بڑھا۔ اور اس نے میرے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔

اس نفسیاتی لمحے میں یک بیک فضا بدل گئی ــــ "آؤ ـــ بیٹھو ـــ" اسنے
ی سے کہا۔ ایک عورت نے فوراً پلنگ پر کھیس بچھایا۔ دوسری لسّی کا گلاس لے کر آگئی۔
ے بچے نے ذرا شرماتے ہوئے نزدیک آکر لیمن ڈراپ پیش کئے۔ کھاٹ پر بیٹھ کر ایک
ھ میں لیمن ڈراپ اور دوسرے میں لسّی کا گلاس تھامے میں سپوٹ پھوٹ کر رونے
ی۔

جب میں الگزنڈرا پلیس واپس پہنچی تو اسٹیشن جانے کے لئے موٹریں تیار کھڑی تھیں۔
ی عزیز کی بیوی نے مجھے فوراً آواز دی کہ ان کے ساتھ چل کر صوفیہ کو سپلی لاج سے
آؤں۔

راستے میں فوجی عزیز نے تازہ ترین خبریں سنائیں۔ فسادات میں مارے جاتے
وں کی تازہ ترین تعداد۔ نئی سرحدوں کی حد بندی۔ کراچی سے نواب زادہ لیاقت علی
ں کا تازہ بیان۔" مگر شکر ہے ـــ" فوجی عزیز نے کہا۔ "کہ ہم لوگ جلد از جلد
یت کے ساتھ یہاں سے نکل جائیں گے۔"

" ایک بات بتائیے۔" میں نے دفعتاً ان سے پوچھا۔ "آنکھوں والوں کی سیاست
اندھوں کی کوئی جگہ ہے؟"

"کیا مطلب ـــ؟"

"مطلب یہ کہ فوج، تہذیب، زبان، خاندانوں اور دلوں کا بٹوارہ تو ہوگیا لیکن
دستان اور پاکستان کی گلیوں میں بھیک مانگتے اندھوں، اپاہج فقیروں اور
روں کی تقسیم کسی نے نہیں کی ـــ؟ مگر یہ کہ آج ہم سب اپنی بینائی کھو چکے ہیں۔

"تم ہمیشہ بے تکی بات کرتی ہو ـــ"

آج ہم سب اپنی بینائی کھو چکے ہیں۔ میں نے لرز کر دہرایا اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ
ا۔ لیکن یکلخت " فادر ٹائم" کا ہم شکل لہرائی لمبی سفید داڑھی والا بوڑھا سردار میری
ھوں کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"مجھے ذرا آشیانے پر اتار دیجئے گا ـــــ" میں نے کہا۔

"کیوں ـــــ ؟" فوجی عزیز نے کار روک کر پوچھا۔

"کاہے جان کے پیچھے پڑی ہو۔ نابھے کے سکھ حملہ کرنے والے ہیں۔ مارے جائیں گے ہم سب۔" ان کی بیوی نے سراسیمہ ہو کر کہا۔

"بھابھی جان۔ میں ذرا چند بے حد خونخوار سکھوں سے ملاقات کر آؤں۔" میں نے جلدی سے کار سے اتر کر آشیانے کی طرف بھاگتے ہوئے جواب دیا۔ اور تیزی سے باڑ پھلانگ کر اپنے باغ میں داخل ہو گئی۔

اندر پہنچ کر میں نے ان بوڑھے سردار کو ڈھونڈ نکالا جو اسی طرح پچھلے برآمدے میں نماز کے تخت پر بیٹھے چپ چاپ باغ کے درختوں کو تک رہے تھے۔ میں نے جلدی جلدی ان سے کہا ـــــ

"مجھے آپ سے ایک کام ہے۔ یہ ہمارا گھر اب آپ کا ہے اس لئے آپ کی اجازت چاہئے۔"

"یہ گھر ـــــ نہ میرا ہے نہ تیرا ـــــ بیٹی۔ یہ تو رین بسیرا ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"میرے ایک بزرگ ہیں۔ وہ پہلے یہیں رہتے تھے۔" میں نے دور شاگرد پیشے کی سمت اشارہ کیا۔" اب وہ اندھے ہو گئے ہیں اور بھیک مانگتے ہیں۔ اگر وہ اس شاگرد پیشے کے کسی کونے کھدرے میں پڑ رہیں اور آپ کے یہاں سے انہیں دو وقت کی روٹی مل جائے۔"

بوڑھے سردار نے بڑے رومال سے چہرہ صاف کیا اور کہا ـــــ" بے شک۔ بے شک ہمارے پاس جو کچھ کھانے کو ہے حاضر ہے۔"

میں فوراً الگزنڈرا پلیس واپس بھاگی۔ فوجی عزیز اسی وقت لوٹے تھے اور جہاجڑ کی دوسری کھیپ لانے پھر ہلی لاج جا رہے تھے۔ میں جلدی سے کار میں بیٹھ گئی۔ اب ٹرین کا وقت قریب آ چکا تھا۔ بلی لاج سے لوگوں کو لینے کے بعد کرن پور کے سامنے پہنچ کر میں نے فوجی عزیز سے پھر کہا کہ کار روک لیں۔

"اب کس سے ملنا ہے؟" انہوں نے جھنجلا کر پوچھا
"ایک بڑے آدمی سے جو کل سے میرے منتظر ہیں اور مجھے ان کو ایک دوسرے بڑے آدمی کے پاس پہنچانا ہے۔"
"کون بڑا آدمی بھئی ــــ؟ سر رگھوناتھ کو تو ہم کل ہی خدا حافظ کہہ آئے۔ رہے نواب صاحب بہرام پور اور ہز ہائی نس ــــ ڈیم ــــ" انہوں نے زور سے بریک لگائی کیونکہ ایک گائے کار کے سامنے آگئی تھی۔ میں دروازہ کھول کر تیر کی طرح نہر کے کنارے پہنچی۔
لیکن بارش میں بھیگا نیلا پتھر خالی پڑا تھا۔ کشمیری نمدے کا ٹکڑا کیچڑ میں لت پت ایک طرف کو بہہ گیا تھا اور نام چینی کی شکستہ میلی رکابی مٹی پر اوندھی پڑی تھی۔
"کیا ہوا ــــ؟" فوجی عزیز کار قریب لائے۔
"کچھ نہیں ــــ چلئے" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ اور آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ کار فراٹے سے ریلوے اسٹیشن روانہ ہوگئی۔

جمیلہ ہاشمی

رات کی ماں

بڑی نہر کی چوڑی پٹڑی پر کھڑے ہوں تو ٹیلوں کے درمیان پواروں کی بستی یوں دکھائی دیتی ہے جیسے کسی نے چھوٹے چھوٹے گڑیا گھر ادھر ادھر پھیلا کر رکھ چھوڑے ہوں۔ دور تک پھیلے کھیت پیراں کے سروں پر ابھرتے ہوئے یہ مٹی کے پہاڑ آویوں سے اٹھتا دھواں اور ایک گھر سے دوسرے تک آتی جاتی بہو دلہ کے قدموں تلے بچھی یہ پگڈنڈیاں بستی دور سے ایک سپنا سا جان پڑتی ہے۔ پٹڑی پر نہر کے ساتھ ساتھ سیدھے چلتے جاؤ تو راستہ شہر کی طرف اتر جاتا ہے اور اگر بستی کی طرف آنا چاہا ہو تو راجباہ کے لکڑی کے پل پر سے پیچھے کی طرف پلٹ کر ٹیلوں کی اونچی نیچی ڈھلوان پر سائیکل سمیت چلنا بہت مشکل لگتا ہے جتنی یہ بستی ستھری ہے اتنا ہی اس کا راہ اکھڑ بکھڑا اور خراب ہے۔ پر بستی میں داخل ہونے پر ساری تھکن دور ہو جاتی ہے شیشم کے جھنڈ تلے نوردہ کمہار کا جھونپڑا لپا پتا صاف ستھرا جیسے ابھی چاک پر سے اترا ہو جانے اس گھر کے گرد یہ گیلے پن کا احساس کیوں ہوتا ہے گیلا اور ٹھنڈا اور سکون دینے والا سائے میں ایک طرف گائے بندھی رہتی ہے اور کھٹیا کے ساتھ کپڑے کے جھولے میں بچہ سویا رہتا ہے۔ نوردہ کی بہو بجھا بجھری بجاتی ایسے ہولے ہولے قدم دھرتی ہے مانو کچے برتنوں پر چل رہی ہو اور اسے ڈر ہو کہ کوئی ٹوٹ نہ جائے۔ کندن اس بستی کی لڑکی نہیں گل خان اسے بہت دور سے بیاہ کر لایا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب بستی کے دوسرے گھروں میں ساس بہو کی جنگ ہوتی ہے تو بہوئیں آگے سے ہاتھ ہلا ہلا کر لڑتی ہیں اور ہر دوسرے تیسرے مہینے ایک الگ جھونپڑا کسی ٹیلے کی اوٹ میں کھڑا ہو جاتا ہے مگر کندن کسی بات کا جواب کبھی نہیں دیتی۔

پر جو بات میں کرنے جا رہا ہوں وہ ختم ہوتے پھاگن کے ایک سویرے سے شروع ہوتی ہے اس سے پہلے شام گھٹا گھنیرے بالوں کے جال کی طرح بستی پر چھائی ہوئی تھی اور میں ڈاک کا کام نپٹائے بنا ہی اپنی بستی کو لوٹ گیا تھا ساری رات بوندیں پڑتی رہیں اور صبح ہونے کے قریب اولوں کی برکھا ہوئی میں سوچتا رہا تھا کہ اگر آج یہ بارش نہیں رکی تو جانا مشکل پڑ جائے گا مدرسے کا سالانہ معائنہ قریب تھا اور لڑکوں پر جان کھپائی ضروری تھی عزت کا سوال تھا انسپکٹر نیا نیا آیا تھا اور کسی تحفے سے رام نہیں ہوتا تھا لاکھ منت سماجت کی اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہو پاتا کام دیکھ کر خوش ہوتا، یوں آپ لوگوں کو پتہ ہے کہ میں کام چور آدمی نہیں ہوں محنت بھی کرتا ہوں پر لڑکوں اور پھر بستی کے لڑکوں کا کچھ ٹھیک نہیں ہوتا کبھی ہل چلانے کے لئے وافر آدمیوں کی ضرورت ہوئی تو اسکول سے رخصت لے لی کبھی ڈھور ڈنگر بیمار ہوئے تو تلسی سیوا کے لئے باپ بھائیوں نے روک لیا پھر سال کے آخر میں ان کا نئی جماعت میں پڑھنا بھی عزت کا سوال بن جاتا ہے اور تم جانو لحاظ کرنا پڑ ہی جاتا ہے اور اسی لئے میں آنے والے معائنے کے خیال سے فکر مند تھا مگر تیز ہوا گھٹا کو اڑا لے گئی روشن چمکیلے رنگ برنگ کے بادل کوچ کرنے لگے جیسے فوجیں حرکت میں ہوں سورج کبھی اوٹ میں ہو جاتا اور کبھی اس کا ایک کنگرہ اس روشنی اور چمک میں یوں دکھائی دیتا جیسے کسی کنواری نے گندم کے سنہری بالوں کو دونوں ہاتھوں سے ہٹا کر ذرا دیر کے لئے باہر جھانکا ہو۔ میں چلا ہوں تو نئی نئی خوشبوئیں دھرتی کی باس میں ملی میٹھی مدھ سوگند کسی گیت کے بول کی طرح میرے گرد ہو گئیں۔ بھیگی زمین کسی پاگل عورت کی طرح اپنے سارے خزانے سامنے سجا دیتی ہے ذرا ذرا سے پھول گھاس کونپلیں اور لہراتی ہوئی خوشبوئیں کبھی سامنے کی طرف منہ کر کے چل رہے ہو تو گندم کی بالوں کی مہک ہو گی دوسری طرف منہ کرو تو پانی پر سے آتی ہوا کی نمی میں ملی کوئی انوکھی نرالی باس ہو گی جس کو پہچاننا مشکل ہو گا۔ آدمی گیلی بارش سے نہائی دھرتی پر چلتا آپ بھی پاگل ہونے لگتا ہے پھر بھری ہوئی چھلکتی نہر کے کنارے ریشمی بوٹیاں لہرا رہے تھے جیسے کسی راج رانی کا بجرا ان لہروں پر سے بہتا جاتا ہو ڈھلے ہوئے درخت دنیا کا یہ انوکھا نرالا روپ۔

گنگناتے ہوئے میں نے ریشمی ٹیلوں اور ڈھلی ہوئی راہوں پر سائیکل موڑا لوہاروں کی بستی کی طرف اترا ہوں تو مجھے بہت سی آوازیں سنائی دیں جیسے کئی آدمی ایک ساتھ بولنے کی کوشش

کررہے ہوں۔

کندن کی ساس بہت زبان دراز ہے ساری بستی اس سے پناہ مانگتی ہے عورتیں کہتی ہیں بھلا ہے جو اس کا گھر بستی کے ایک سرے پر ہے اگر کہیں محلے کے درمیان ہوتا تو یہ سب کا جینا حرام کر دیتی عجیب طنطنے کی عورت ہے بولنے پر آئے تو بولتی چلی جاتی ہے گالیاں اس کے منہ سے نکلتے ہی ایک الگ زندگی بنا لیتی ہیں اور ساس سویرے کو جس کی بات میں تمہیں سنا رہا ہوں وہ کبھی جھونپڑے کے اندر جاتی اور کبھی باہر آتی پھر کونے میں بیٹھی کندن کے سر پہ ایک دو ہتھڑ مارتی اور پھر اندر چلی جاتی کبھی گائے کو کھولنے لگتی اور پھر اسے باندھ دیتی کندن کی بے بیاہی نند بڑی عمر کی عورتوں کی طرح ہاتھ چلا چلا کر گالیاں بک رہی تھی جو اس کی ماں کی گالیوں کے شور میں مل کر اور جنون پیدا کر رہی تھیں گل خان کھاٹ پہ بیٹھا حقہ پی رہا تھا ماں کبھی اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاتی اور اپنا سر پیٹنے لگتی۔ لڑتے ہوئے گالیاں بکتے آدمی دیکھنے والے کو بالکل پاگل لگتے ہیں ایک دم دیوانے ہیں یہ تماشا سمجھنے کی کوشش کرتا اور راہگیروں کے ساتھ بہت دیر کھڑا نہیں رہ سکا اسکول کا وقت ہو چکا تھا اور پھر ایسے ہنگامے تو بستی میں روز ہوتے ہیں۔

شام آموں کے بور کی باس کی طرح بوجھل بوجھل سی میرے گرد درختوں کے گھرے ہوئے سایوں کی طرح پھیل رہی تھی میرا دل یوں ہی اداس تھا رات سے میرے بچے کی طبیعت اچھی نہیں تھی میں دوا لے کر جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا مگر میرا کام باقی تھا اور حکیم کی دوکان دوسری بستی میں تھی میں خطوں پہ مہریں لگا کر انہیں تھیلے میں ڈالتا جاتا تھا آخری کارڈ پر مہر لگا کر میں نے فلاں سودگی کا سانس لیا اور تھکے کا ایک کش لے کر جو تھیلے کی ڈوری کسنے لگا ہوں تو میں نے باغ کے دوسرے کنارے سے کندن کو اپنی طرف آتے دیکھا وہ شام کے سرخ سایوں اور آم کے پیڑوں کی تاریک چھاؤں میں جیسے مجھے خوشبو کا ہیولے لگی۔

منشی کاکا" ایک کارڈ تو لکھ دو" اس نے میرے پاس آکر کہا۔

"کیوں کیا ماں اور بھیا کو بلوانا ہے" میں نے قلمدان کھول کر دوات میں قلم مارتے ہوئے کہا

"نہیں منشی کاکا اب انھیں کا ہے کو روز روز بلاؤں" اس نے تھوڑا سا مسکرا کر کہا اس کی یہ مسکراہٹ جیسے چاند کی چاندنی گھنیرے بادلوں کی اوٹ سے چھن کر آئے اور پھر اداس کر گئی

پھر کہاں لکھواؤگی ۔ میں نے کارڈ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ۔

ماں کو لکھنا ہے کاکا کہ میں راضی خوشی ہوں اچھی طرح سے ہوں سنی سنائی بات پر اعتبار نہ کریں میں لکھنے لگا ۔ کھیتوں پر کی ہوا بڑی سہانی تھی اور پیڑوں میں سے جھکتی لال روشنی میں ملی کندن کے زرد گالوں ڈھلی ہوئی آنکھوں اور بھنویالوں کو چھو رہی تھی ۔

لکھ کر میں نے پوچھا اور کیا ہو ۔

کہنے لگی " کاکا ماں اور بھیا کو بہت تاکید سے لکھ دو کہ فکر نہ کریں بھاگے نہ آویں فصل پیچھے میں آپ آؤں گی فکر نہ کریں بالکل " وہ سارے لفظ سنبھل کر یوں کہہ رہی تھی جیسے اسے ڈر ہو میں اس کی سب باتیں لکھ نہ پاؤں گا کہہ نہ سکوں گا میرے قلم میں وہ زور نہ ہوگا میرے لکھنے کے باوجود اس کی ماں اور بھیا انتظار کریں گے "

سرسوں کے پھول کی طرح لگتی ہوئی کندن فکرمند اداس مگر مطمئن لگ رہی تھی ۔

کارڈ لکھ کر میں نے اسے سنا دیا ۔

کہنے لگی " کاکا ذرا اچھی طرح لکھئے کہ ماں اور بھیا میں سے کوئی نہیں آئے ۔

میں نے کہا " اب پتہ لکھواؤ میرا بچہ بیمار ہے اور مجھے دوا لیتے ہوئے گھر جانا ہے ۔

شرمندہ سی ہو کر بولی " سویرے بستی میں میرے مائکے کا آدمی اپنے کسی کام سے آیا ہوا تھا روز کی طرح آج بھی ہمارے گھر سویرے سے مصیبت پڑی ہوئی تھی اس نے بھی سنا ضرور ماں سے جا کر کہے گا اور وہ بھاگی ہوئی آئے گی ہو سکتا ہے بھیا کو بھیج اور تم جانو کاکا فصل کے دن ہیں پھر میری ساس کسی کا لحاظ بھی تو نہیں کرتی نا مفت میں بے عزت ہونے کا فائدہ ۔ "

کارڈ پر پتہ لکھ کر تھیلے کی ڈوری کستے ہوئے میں نے کہا " کندن بی بی تم بھی عجیب ہو دنیا کی لڑکیاں کانٹا بھی چبھتا ہے تو ماں باپ کو پکارتی ہیں ایک تم ہو کہ روز ہی بات ہوتی ہے پیتی ہو مگر ماں اور بھیا سے اسے بڑے بھید کی طرح چھپا کر رکھتی ہو ۔

کہنے لگی " کاکا یہ ساری تو بھرم کی بات ہے مجھے اچھا نہیں لگتا کہ یہاں کا مان بیکار

ا بول لگنے لگے اور پھر اچھی بری یہاں بیٹھے گی تو انھیں بلوا کر کیا کروں گی یہ تو ماتھے کا لکھا ہے کبھی
ویرا ہوگا سہی ۔"

حکیم صاحب کے پاس پہنچا ہوں تو بہت بھیڑ تھی ان کی بستی میں کسی گھر میں بہو ساس کا
جھگڑا ہو گیا تھا۔ پھر سمدھی آپس میں جھگڑ پڑے دونوں خاندانوں میں خوب لاٹھی چلی سارا گاؤں
منڈ کر حکیم صاحب کے دروازے پر جمع تھا جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی ہو رہی تھی میں نے حکیم صاحب
کو کندن کی بات بتائی۔ " کہنے لگی اس کل جگ میں بھی کہیں نہ کہیں کو ستونتی ہے مگر میری بات یاد
رکھو وہ ایک نہ ایک دن ہمت ہار بیٹھے گی سہار کی ایک حد ہوتی ہے اگر تم جو کہتے ہو وہ ٹھیک
ہے تو میں اس کی داد دیتا ہوں۔

دوا لے کر اسٹیشن پر ڈاک پہنچاتا ہوا جب بستی میں پہنچا ہوں تو میری شام اندھیری اور
رات پریشان تھی میرا بچہ بہت ہی بیمار تھا میں نے اسے لاکھ بلایا مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں
اور وہ دیئے بجھ گئے وہ دیئے جن کے ہونے سے میری دنیا میں روشنی تھی زندگی میں کڑی محنت
اور سارا سارا دن گھر سے باہر رہتے ہوئے ایک خیال ہوتا تھا کہ گھر جا کر بچے سے دل بہلے گا مگر
دینے والے کو جانے کیا منظور ہوتا ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا یار وہ کہنے والے کہتے ہیں وہ بے
انصاف نہیں ہے لوگ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے اگر وہ بے انصاف نہیں تو بے پروا ضرور
ہے۔ دنوں میرا دل کسی طرح سے نہیں بہل سکا۔

کوئی ایک ہفتہ بعد میں نہر کے ساتھ ساتھ سائیکل چلاتا آ رہا تھا اور معائنے کے متعلق
سوچ رہا تھا جب کنارے کے سرکنڈوں اور بوروں میں حرکت ہوئی ایک عورت نے ہاتھ کے اشارے
سے مجھے روکا میں حیران سا سائیکل سے نیچے اتر آیا۔

بیٹا میں کندن کی ماں ہوں پواروں کی بہو کندن کی ماں گل خاں کو تو تم جانتے ہو گے
وہ میری ہی بیٹی کو بیاہ کر لایا ہے۔

میں چپکا کھڑا رہا۔

بیٹا وہ روز اسے پیٹتے ہیں یہ لحاظ بھی نہیں کرتے کہ وہ پردیسن ہے اس کا یہاں
کون بیٹھا ہے جو اس کی مدد کرے گا۔ کسی نے مجھ سے کہا ہے تم منشی ہو اسکول میں پڑھاتے ہو

اور عرضی پرزہ لکھ لیتے ہو۔ میں سویرے سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔ میں پولاروں پہ مقدمہ کرنا چاہتی ہوں انھوں نے میری سونے جیسی بیٹی کا مار مار کر برا حال کر دیا ہے۔"
میں نے ہنس کر کہا ماں جب تمہاری اپنی بیٹی تمہارا ساتھ نہیں دیتی تو تم مقدمہ کس طرح کر سکتی ہو۔
وہ بولی بیٹا اس میں ہنسنے کی بات نہیں اس پر تو انھوں نے جانے کیا جادو ڈال رکھا ہے کہ ہم اسے پرائے لگتے ہیں۔ سدا سے وہ ان کے جادو میں قید تھی گل خاں کو جس دن گھر میں نوکر رکھا تھا اسی دن سے میرے دل میں چور تھا کہ یہ کچھ ہو کر رہے گا جادوگر میری بچی کو اتنی دور لے آیا حالانکہ جب اس نے منت کر کر کے مجھ سے میری بیٹی مانگی ہے تو کہتا تھا میں یہیں رہوں گا تب تو اس کے منہ میں زبان نہ تھی اور آج اس کے ہاتھ بہت لمبے ہوگئے ہیں
حالانکہ اسکول پہنچنے کی جلدی تھی میں وہیں نہر کے کنارے بیٹھ گیا۔
ماتھے کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا بیٹا۔
اور آج مجھے لگتا ہے کچھ تحریریں ہوتی ہیں جو ہماری تمہاری سب کی پیشانی سے چمٹی رہتی ہیں۔
جب شہر میں مقدمہ چلا ہے تو بستی میں طوفان آگیا۔
ایک دوپہر اسکول بند کر کے آدھے دن کے بعد میں گھر جا رہا تھا کہ کندن مجھے آدیوں کے پاس کھیت سے پرے ملی بڑی اداس اور سہمی ہوئی سی کہنے لگی "منشی کاکا تم نے ماں کو شہر جا کر مقدمہ کرنے کا راہ دکھایا۔ اور لوگ میرا قصور نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے قصوار سمجھتے ہیں بتاؤ میں کیا کروں۔ ماں سے میں نے کہا تھا کہ میں راضی خوشی ہوں پر اللہ جانے کیا ہو گیا اسے۔ تمہارا لکھا خط دیر سے پہنچا ہوگا نہیں تو اس آدمی کے لکھے وہ کبھی نہیں آتی تھی اور اب اس نئی مصیبت کا مقابلہ کون کرے۔"
میں نے اسے تسلی دی۔
مگر وہ کہنے لگی "کاکا میری ساس کی زبان مجھے اس گھر میں ٹکنے نہیں دے گی میں نے گل خان سے کہا تھا کہ ہم الگ رہ لیں گے مگر اسے تو گھر لوٹنے کا جنون تھا میرے بھیا نے اسے الگ سے زمین دی تھی مگر اسے تو مجھ سے بیر تھا میرا سکھ اس سے دیکھا نہ گیا۔

میں نے کہا گل خان برا آدمی نہیں ہے۔

کندن نے کہا میں کب کہتی ہوں کہ برا آدمی ہے پر میری حفاظت نہیں کر سکتا۔ اس کی ماں مجھے جینے نہ دے گی۔ وہ اپنی ماں کے کہنے سے مجھ سے بولتا نہیں اور اب وہ اس کی موسی کی بیٹی سے اس کی دعا خیر کرنے والے ہیں۔

گل خاں میرے اسکول میں چار جماعت تک پڑھا ہوا اور بہت اچھا طالب علم تھا، اس لئے میں نے اس وقت کندن سے وعدہ کیا کہ میں اس سے بات کروں گا اسے سمجھاؤں گا مگر جب ایسی باتیں ایک بار چل نکلتی ہیں تو پھر رواں رہتی ہیں موسی کی بیٹی سے شادی کی نئی بات جب سنی گئی ہے تو سچ ہی ہو گی۔

میں سائیکل تھامے ہوئے ہوئے فصلوں کے اندر بنے موہوم لکیروں کے سے راہوں پر سے گزرتا جاتا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کندن ان عورتوں میں سے تھی جنھیں کتابوں میں ہم نے ستی ستونتی کے نام سے پڑھا ہے اس میں رانیوں کی سی آن بان کے ساتھ ایک خود سپردگی کی ادا تھی جو صرف محسوس کر سکو اور مجھے پورا یقین ہے گل خاں کو اس کی اس ادا کا پتہ تک نہ ہوگا کیونکہ محسوس کرنے کی قوتیں بھی پیدا کی جاتی ہیں ایک سلجھا ہوا ذہن تو یہ سب باتیں سوچ سکتا ہے ایک عام آدمی نہیں۔ کندن عام عورت نہ تھی، اس کے رونے میں بھی ایک رکھ رکھاؤ اور اس کے شکایت کرنے کے انداز میں بھی خودداری تھی۔ جس دن کندن نے عدالت میں جا کر بیان دیا کہ اسے گل خاں سے کوئی شکایت نہیں اس دن اس کی ماں کو میں نے دیکھا۔ وہ اکیلی تھی اور کندن کی طرف دیکھے بنا اندر سے نکل چلی گئی جیسے اس کا کندن سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ گل خاں اور اس کے رشتے دار زور زور سے قہقہے لگاتے ہوئے عدالت کے احاطہ میں گھومنے لگے میں تیز تیز اور جا کر اسے پکارا "موسی"

وہ کھڑی ہو گئی مگر میری طرف یوں دیکھا جیسے میں کوئی دشمن ہوں۔

"موسی"، میں نے کہا تمہیں کندن کے بیان سے رنج تو بہت ہوا ہوگا ساری محنت اور پیسہ برباد گیا مگر میں سمجھتا ہوں وہ ہر قیمت پر اپنا گھر آباد رکھنا چاہتی ہے تم کو تو اپنا فرض پورا کرنا تھا سو تم نے پورا کر دیا۔

وہ ایک گرے ہوئے درخت کے سوکھے تنے پر بیٹھ گئی اور ماتھے پر سے پسینہ پونچھتی ہوئی کہنے لگی "رونا تو یہی ہے کہ وہ جس گھر کو آباد رکھنا چاہتی ہے وہ آباد نہیں رہ سکتا بیٹا جب عورت اور مرد کے درمیان لحاظ کا پردہ نہ رہے تو زندگی حرام ہو جاتی ہے مجھے تو شروع سے گل خاں کی بدلحاظ طبیعت کا پتہ تھا مگر کندن کے دل کا خیال کر کے میں نے اسکی منگنی پہلی جگہ سے چھڑا کر اسے یہاں بیاہ دیا میرے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے اور یہاں یہ نوکرانیوں سے بدتر وقت گزار رہی ہے۔ میں نے ہر شے کو صبر کر لیا تھا مگر اس پر مار پڑے یہ میں کیسے سہہ لوں ارے یہ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا یہی تو مجھے ملے گھر کی خوشی بس انہیں کے دم سے تھی بیٹیا اولاد کا دکھ برا ہوتا ہے۔"

وہ اپنی بھرائی ہوئی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

میں تو انھیں نصیحت دینا چاہتی تھی کہ پھر میری کندن کو تنگ نہ کریں میرا مطلب مقدمہ کرنے سے کوئی اس کا گھرا جاڑنا نہیں تھا جب وہ راضی خوشی ہے تو رہے اب میں بھی جیتے جی اس کا منہ نہ دیکھوں گی، میں نے سوچا وقتی غصہ ہے جاتا رہے گا۔ کہیں مائیں بھی ایسے وعدے نبھا سکی ہیں۔

اس شام مقدمہ جیتنے کی خوشی میں لہاروں کی بستی میں رت جگا ہوا، گل خاں اور اس کی ماں بہت خوش تھے۔ کندن کی نندیں جو پرے کی بستیوں میں بیاہی تھیں آئی ہوئی تھیں اور کھاٹوں پر لدی بیٹھی تھیں اٹھتیں تو اپنے نئے گھرے سنبھالتیں مٹک مٹک کر اٹھتیں اور ناز سے چاروں طرف دیکھتیں ان کی آنکھوں میں غرور کی جوت سی تھی جو ستاروں ٹکے ماتھے پر آئے دوپٹوں کے ساتھ مل کر اور بھی گہری لگتی تھی، ڈھولک بجاتی عورتیں اور راگوں کے تانوں کے پھیرے اڑاتے بولوں سے انھوں نے ایک رنگ پھیلا رکھا تھا یہ جیت کی خوشی کا انوکھا تہوار تھا جس میں کندن یوں چلتی تھی جیسے خواب میں ہو بچے کو لے کر اکیلی اکیلی ویرانوں میں گھومنے والی روح کی سی اداسی اس کے چاروں طرف تھی کبھی ایک جگہ بیٹھتی اور پھر آپ سے آپ اٹھ کر دوسری جگہ جا بیٹھتی کوئی اس سے بات ہی نہیں کر رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی کو دکھائی ہی نہ دیتی ہو اس کا وجود کہیں ہو ہی نہیں گل خان کی ماں اپنی بہن

کی بیٹی پر سے روپے وار کر نقارہ بجانے والے کی بیوی کو پکڑا رہی تھی اور ہنستی جاتی تھی،
پھر لڑکیوں نے سوانگ بھرے ناچنے والیوں کے گرد دائرہ تنگ ہو گیا تانیں لمبی ہو گئیں
اور تالیوں کی آواز ہر شے پر لپسنے لگی۔ جاتے ہوئے میں نے کہا۔

گل خاں تمہاری عورت بہت نیک مزاج ہے اس کی قدر کیا کرو۔

اس نے مجھے کوئی جواب زیادہ صرف مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ جانے کیوں مجھے ایسی لگی
جیسے کسی نے تیز دھار چھری کو اندر چھپا رکھا ہو وہ مسکراہٹ مجھے بڑی بے معنی اور منحوس معلوم
ہوئی جیسے خوشی کے گھر میں اچانک کسی نے چیخ ماری ہو مجھے گھر جاتے تک وہ مسکراہٹ یاد آتی رہی
اس جواب کے بعد وہ بنا سلام کئے پھرا تھا اور اندر چوکھنڈی میں چلا گیا جہاں رشتے کی جوان لڑکیاں
نئی بہوئیں اور ہمسایہ بستیوں کی عورتیں لہک لہک کر گیت گا رہی تھیں اور پاؤں کی جھانجھروں کی صدا
شور میں سے زیادہ پر رونق معلوم دیتی تھی۔

بیساکھ آ گیا تھا گندم کے سنہری کھیت تا حد نظر پھیلے ہوئے تھے کسی کسی بستی میں لوگ فصل
کاٹ کر ڈھیری لگا چکے تھے کہیں تیاریاں ہو رہی تھیں اور دنیا ایک خواب کی سی دنیا لگتی ناقابل
یقین خوبصورتی اور خوشبو سے بھری اور گرم ہوتی ہوئی مانو کسی شعلے کی لپیٹ میں آنے والی ہو ہر
شے پر آگ لپکتی ہوئی لگتی تھی جیسے الاؤ جلنے والا ہو سورج آسمان کے اندر سفید شعلہ تھا دھوپ
گرم ندی سی بہتی ہوئی نہروں میں خاک اڑتی تھی اور کوئلیں آموں کے اندر چھپی کو ہو کو ہو بولتی تھیں۔

مدرسے میں فصل کی چھٹیاں ہو گئیں میں صرف ڈاک کا کام نمٹانے دن چڑھے آتا تو کھیتوں
میں رنگ برنگے آنچلوں کے پھریرے اڑ رہے ہوتے عورتیں ایک دوسری سے بڑھ کر ہاتھ مارنے اور
لائی کے ڈھیر کو اونچا کرنے میں دھوپ کو بھول کر لگی ہوتیں جوان لڑکیاں سر پر روٹیوں اور لسی کے
گھڑے لئے کھیتوں کو جا رہی ہوتیں میراثی گھوڑوں پر چڑھے کھیتوں کے کنارے کنارے گھومتے
اور خیرات مانگتے جوانوں کے سنولائے ہوئے چہروں پر آنے والی خوشیوں کے سائے جیسے اندھیرے
کے دامن پر کرنیں کانپیں کھوئی کھوئی سی سنبھل کر چلتی مٹیاریں شور مچاتے بچے اور ہوا کے ساتھ
اڑتی نقاروں کی آوازیں۔

اس دن جانے میرا دل یونہی پریشان تھا اس سے پہلے دن گل خاں کی ماں نے برادری والوں

و بلوایا تھا اور خط لکھوائے تھے کہ فصل کے بعد آ کر فیصلہ کریں وہ اپنے بیٹے کی شادی کرنا
چاہتی تھی۔

میں ڈاک کا تھیلا سائیکل کے کیریر پر رکھے ہولے ہولے پیڈل مارتا کھیتوں میں سے
پے گاؤں جا رہا تھا اور کندن کے لئے فکر مند تھا میرے جی میں بار بار یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ
وہ پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی۔ وہ پردیس سے آئی ہوئی مٹیار جیسے غیر زمین میں لگایا پودا۔ کہیں دور سے
کھیتوں کے اندھیرے سے کوئل کی کوک سنائی دی بھری دوپہر میں آٹے کی چکی بھک بھک کر کے
چلتی تھی اور اس کی آواز ویرانوں میں اکیلی ہونکتی تنہا روح کی پکار کی طرح میرا جی اداس کر گئی۔
ٹیلے سے مڑ کر جو اپنے راہ پر گھوما ہوں تو میں نے کندن کو دیکھا وہ ایک ہاتھ میں درانتی لئے
اور دوسرے میں گندم کی مٹھ پکڑے کھڑی تھی جیسے کوئی تصویر ہو بالکل خاموش اور بے حس
بے جان جیسے وہ زندہ نہ ہو صرف میرا خیال ہو۔ دوسری لڑکیاں اس سے ذرا پرے گاتی اور بولتی
گندم کاٹنے میں لگی تھیں اور ایک دوسری سے چہلیں کر رہی تھیں ان کی آوازیں درانتیوں کی کرکر
اوپر جیسے ساز کے ساتھ گیت ہو سنائی دیتی تھیں مگر وہ بھری دوپہر میں سورج کی روشنی کے
اکیلی لگ رہی تھی پھر کوئل کی کوہو کوہو کہیں قریب سے آئی کندن کا سارا جسم کان بنا ہوا تھا
نے وہ اس کوہو میں کیا سن رہی تھی کون سے دیس کا گیت کونسا بھولا بسرا نغمہ جیسے کچھ یاد کرنے
کوشش میں ہو اندھیروں میں جھانک رہی ہو اس کے چہرے پر سے سائے گزرنے لگے۔ پہلے
اس سے بات کرنے کو میرا جی چاہا پھر میں نے مناسب نہ سمجھا اور آگے بڑھ گیا۔

فصل کٹ گیا جاٹ شادیوں اور ہنگاموں کے لئے زیور کپڑا خریدنے میں لگ گئے۔
بازاروں میں اپنے گھاگھرے گھماتی مٹاریں پھولوں والے جوتے پہنے اور لمبی چادریں لئے
تیں دکانوں پر بیٹھ کر ریشمی تھانوں کو ہاتھ لگا کر دیکھتیں اور بھاؤ تاؤ کرتیں مٹھائی
تیں اور اپنے جسموں سانسوں کی خوشبو پیچھے چھوڑتی چلی جاتیں بازار رنگ اور نور سے
نے لگتے تھے گرمی اب اپنے شباب پر تھی لو چلتی تھی اور لوگ بادلوں کی راہ دیکھتے تھے
خاک سے بیزار تھے سورج سوا نیزے پر کھڑا رہتا راتیں بستیوں میں چراغوں گیتوں اور

ہنگاموں کی برائیں لے کر اترتیں گلی گلی ایک میلہ سا لگتا۔

گل خاں مجھے ملا تو کہنے لگا " منشی جی آپ کندن کو سمجھائیں ہم اب زبان دے چکے ہیں مگر وہ سمجھتی نہیں فساد کرتی ہے۔"

"کاہے کی زبان،، حالانکہ میں سب سمجھتا تھا مگر میں نے انجان بن کر پوچھا۔

وہی جس کے لئے ماں نے آپ سے خط لکھوائے تھے منشی جی۔ پھر ذرا جھینپ کر بولا وہی "میری شادی کا قصہ،، میں نے کہا کندن کے ہوتے تم ایسا کام کیوں کرتے ہو اس میں کوئی کمی نہیں اس کی صورت ایسی ہے کہ دیکھا کرو ہاتھ لگانے سے میلی ہونے والی رنگت ہے تم کس لئے اس کے ہوتے دوسری لاؤ گے اس سے کیوں بیزار ہو۔

گل خاں ڈھیٹوں کی طرح ہنس کر بولا کاہے اور بولنے کے کام میں جاتی زیادہ جانیں ہوں اچھا ہے یہ انسانی رشتوں کی منطق مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آتی اور پھر ان کا الجھاؤ مجھے اور بھی گھبرا دیتا ہے۔ ماں کا بیٹی سے رشتہ باپ کا بیٹے سے شوہر کا بیوی کا اور پھر ان رشتوں جیسے پھیلاؤ میں دیواریں اور دشواریاں اور سمجھ نہ آنے والی گتھیاں جھگڑے اور بیزاری اور ایسی مسکراہٹ جو ہنسی کے قریب ہونے پر بھی تیز دھار آلے کی طرح لگتی ہے۔

"منشی جی اسے کہیں فساد چھوڑ دے،، اس نے بازار میں ایک کپڑے کی دکان پر بیٹھتے ہوئے کہا میں اسے جواب دئے بنا آگے بڑھ گیا۔

جب بھی اسکول آتے میں ان کے گھر کے سامنے سے گزرتا تو کپڑے کا جھولا نہ ہوتا جانے کہاں چلی گئی تھی کندن کہ دکھائی ہی نہ دیتی تھی البتہ اس کی نندیں تیز آواز میں ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کرتی درختوں تلے گھومتی دکھائی دیتیں میرا دل آنے والے غم کے بوجھ سے بیٹھتا جانے کیوں، میں گل خاں کی شادی کو بہت بڑا سانحہ سمجھنے لگا تھا حالانکہ بہت عورتیں اس غم سے دوچار ہوتی ہیں مگر مجھے لگتا تھا کندن یہ سب دیکھنے کے لئے نہیں بنی ایک شام جب میں حکیم صاحب سے مل کر بستی سے باہر نکلا ہوں کہ وہ مجھے دکھائی دی فاصلہ کی وجہ سے میں دوسری عورت کو پہچان نہ سکا بستی کے باہر ٹوبے کے کنارے دونوں ٹھہر گئیں۔

"میں اب بھی کہتی ہوں بی بی مت جاؤ رات ہی ہو گئی ہے اکیلی کہاں جاؤ گی گیدڑ

نہ گھسیٹ لیں۔ دوسری مٹیار نے چھپتے سورج کی لالی کی طرف منہ کرکے کہا ٹوبے میں دانوں کا عکس تاریک پانی پر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

کندن نے ہنس کر کہا " میں تو رات کی ماں ہوں مجھے کوئی شے نہیں گھسیٹ سکتی۔

بچہ سویا ہوا تھا اور اس کے کندھے سے لگا تھا۔ میں سلام کرکے اس کے پاس سے گزر گیا۔ اپنے راہ پر جاتے ہوئے مڑ کر میں نے دیکھا تو وہ ہرنی کی طرح اکیلی اکیلی خالی کھیتوں کی منڈیروں پر سے پیاروں کی بستی کی طرف جارہی تھی۔ جہاں اس کے لئے نہ سکھ تھا اور نہ محبت

اس شام مجھے اپنا راستہ اور دنوں سے زیادہ لمبا اور تھکا دینے والا لگا۔ میں زندگی اور دکھوں اور آنے والے غموں اور غموں کی سہار اور جانے کیا کیا سوچنے میں لگا تھا اور بہت ہولے ہولے چل رہا تھا۔ کبھی کبھار آدمی کو زندگی پرائے بوجھ کی طرح لگتی ہے اور جی چاہتا ہے اسے اتار پھینکیں۔ چاروں طرف اندھیرا دکھائی دیتا ہے مگر پھر بھی چلتے ہی جانا ہوتا ہے اس اندھیرے میں چاہے کندن کہے کہ وہ رات کی ماں ہے اور چاہے میں کہوں کہ میں چل سکتا ہوں ہمبھی گھبرا جاتے ہیں۔ گل خاں کی شادی اور رت جگے اور خاندانوں کی ناک کا سوال مجھے لگا ایک جھمیلا ہے جس میں پھنسے ہوئے چاروں طرف دیکھتے ہوئے آدمی چلتا ہے۔ کوئی چار دن کی بات ہے میں اسٹیشن سے ڈاک لے کر اسکول آرہا تھا کہ میں نے گل خاں کے گھر کے پاس بہت لوگوں کو اکٹھے دیکھا۔ پاس گیا ہوں تو میں نے کندن کو دیکھا وہ بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی اور رو رہی تھی بچہ سہما ہوا سا کبھی بلک بلک کر رونے لگتا اور کبھی اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اسے چمٹنے لگتا کندن کی آنکھیں بند تھیں اور آنسوؤں کی ندیاں اس کے زرد گالوں پر بہہ رہی تھیں۔

آگے بڑھنے کی بجائے میں پیچھے کھڑا رہا۔ بھلا میں اس کے لئے کیا کر سکتا تھا ؟ .

بیٹی گھر جاؤ یہاں راہ پر سے اٹھو بستی کے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس کی باہنہ پکڑتے ہوئے کہا " چاچا تم لوگ مجھے کیوں پریشان کرتے ہو کہیں نہ کہیں تو جاؤں گی ہی آخر۔ انھوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے تم لوگ راہ پر بھی نہیں بیٹھنے دیتے " اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا پھر میں نے کندن کی ساس کو دیکھا کہ کلیجے کو چیر کر آگے بڑھی اور کہنے لگی " اس بستی میں اب

...را کون یار بیٹھا ہے جس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ جا اٹھ یہاں سے کیا رونا ڈال رکھا ہے۔ ...ے گل خاں کیا ساری عمر تیرے پلو سے بندھا رہتا۔ اگر میں اس کی شادی کر رہی ہوں تو ...ون سی قیامت آ رہی ہے تو نے رو رو کر کیا نحوست پھیلا رکھی ہے ڈائن۔ کیا میکے میں تیرا کوئی ...ہیں جس کے پاس جائے۔"

کندن نے آنکھیں پونچھ لیں بیٹھے سے کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی "میکے والوں کو تو کچھ نہ کہہ ...را تو ایک ہی بھائی ہے اسے میری بھی زندگی لگ جائے اور جگ جگ جیئے میں نے تو ان کے ...اتھ تیرے بدلے بگاڑ لی ہے۔"

بچہ جانے کیوں ماں کو گلے لگا رہا تھا اور کا منہ اپنی طرف کرکے چومنے لگتا اس کی گالو ...ور گردن پر پیار کر رہا تھا۔ "ماں نہ لو۔ ماں بول۔ ماں چل"

میرا دل اچھل کر مانو گلے میں اٹک گیا اور ایک خیال رہ رہ کر ڈسنے لگا کندن کی ...ورت پر ایسی بے چارگی تھی ایسی مایوسی جیسے اسے اب کوئی آس نہ رہی ہو۔

کھڑے ہوئے لوگوں کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اسے کیا کہیں سب چپ تھے گل خاں کی ...اں سے سبھی ڈرتے تھے۔

میرا جی چاہتا تھا اسے دلاسے دوں مگر میں کیا کر سکتا تھا پھر مجھے جلدی بھی تھی اور اس لئے ...وگوں کی بھیڑ میں اسے بیٹھے چھوڑ کر میں آگے بڑھ گیا یہ سوچ کر کہ آج شام یا کل صبح کہیں اسے ...لوں گا تو ضرور سمجھاؤں گا کیوں مفت میں جان ہلکان کر رہی ہے۔

ڈھلے دن میں پکی سڑک کی چمک سے بچنے کے لئے منہ اور سر کو تولیے سے لپیٹے اپنی بستی کی ...طرف جا رہا تھا جب چیخ پکار اور بھاگنے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں پھر دفعہ دار ننگے پاؤں ...تی ہوئی اور ندی کی طرح بہتی سڑک پر سے یوں گزرا جیسے اس نے اپنے پیچھے آفتیں دیکھلی ہوں ...ور بھاگا جاتا ہو پھر دکانیں چھوڑ کر پیسوں کی پرواہ کئے بنا دکاندار مین راں کے کھوہ کی طرف ...ھاگنے لگے ہائے ہائے اور زور زور سے پکارنے کی آوازیں سن کر میں بھی سائیکل پر سے اترا ...ور اسے تھامے ریت کے ٹیلوں پر سے کھوہ کی طرف جانے لگا۔ جانے کیوں میرا دل سینے

میں یوں دھک دھک کر رہا تھا جیسے کوئی گھنٹہ ہو۔

لوگ حواس باختہ پواروں کی بستی کی طرف بھاگ رہے تھے۔ کچھ جوان آدھے آدھے جھکے کھوہ میں جھانک رہے تھے۔ پھر میلہ سا لگنے لگا۔ منڈیر کے ساتھ ایک بچے کا تہہ کیا ہوا جوتا اور کپڑے پڑے تھے پھر ایک عورت کا جوتا تھا جس میں اندر اس کے پاؤں کی جھانجھریں گلے کے تعویز اور ایک انگوٹھی تھی۔

میں یہ سارا عرصہ دعا کرتا رہا میں کندن کا خیال بھی جی میں نہیں لا رہا تھا مگر وہ روتی ہوئی بچے کو اٹھائے ہوئے دھلی دھلی آنکھوں اور پھیکی اداس صورت کے ساتھ ہر گھڑی میرے ساتھ آن کھڑی ہوتی۔

غوطہ خوروں نے کوئی ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد دونوں ماں بیٹوں کی لاشیں نکالی تھیں۔ وہ اس کے سینے پر اس کے دوپٹے سے بندھا تھا دونوں روتے میں تھک کر سوئے ہوئے لگتے تھے بچے کی بانہیں ماں کے گلے میں تھیں جیسے کہہ رہا ہو " ماں نہ لو "

ٹیلوں پر سے پواروں کی روتی ہوئی عورتیں کندن کی سر پیٹتی ساس اور بالوں میں خاک ڈالتا گل خان یوں اترے جیسے فوج کی طرح اسے واپس لانے آئے ہوں۔

مہر خاں نے کہا " ہونی ہو کر رہتی ہے ماسٹر صاحب میں نے دوپہر تک اسے اپنے گھر میں بٹھائے رکھا میری سوانی نے اسے سمجھایا تو کہنے لگی ماسی پواروں کی بستی کے باہر میرے لئے کیا رکھا ہے ماں اور بھائی کو میں نے ان کے بدلے ناراض کیا اب کیا منہ لے کر ان کے پاس جاؤں اور جاؤں بھی کیوں۔ جن راہوں پر میں نے سکھ کے سپنے دیکھے تھے آج ان راہوں سے بے آس کیوں لوٹ جاؤں۔" پھر بچے کو پیار کرتی اور رہ رہ کر سینے سے لگاتی ہوئی کہنے لگی " ہم دونوں یہاں سے لوٹ کر کہاں جائیں گے یہاں رہیں گے۔"

کھانا کھلا کر میری بہو نے کہا " کندن تو اب چار گھڑی آرام کر ہمارے گھر میں تیرے گھر کی سی ٹھنڈک تو نہیں پر ذرا سو جا "

کہنے لگی ذرا باہر کیکر تلے سوؤں گی یہاں گرمی ہے بچہ آرام نہیں کرے گا اور چھوٹی کھاٹ ڈال کر کیکر تلے لیٹ گئی۔

دفعہ دار لگا لگا بہکا ہوا آدمی ہے دونوں وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ کندن کا نام آتے ہی وہ ٹیلوں کی طرف اشارہ کرتا اور کھڑا ہو کر چاروں طرف یوں نگاہ پھیرتا جیسے وہ ان ریت کے پہاڑوں کو اور دور تک پھیلے کھیتوں کو ان پت جھڑ سے تقریباً ننگے درختوں اور اس سے بھی پرے آم کے باغوں کو آخری بار دیکھ رہا ہو پھر ہاتھ ماتھے تک لے جاتا پھر سلام کرتا اور آہ بھرتا اور سر جھکا لیتا۔

پہلے پہل تو مجھے اس کی یہ حرکت سمجھ میں نہیں آئی پھر جیسے کسی کو الہام ہو میں نے جانا کندن نے حسرت سے آخری گھڑی اس رستی بستی سدا سے آباد اور بے پرواہ دنیا کو دیکھا ہوگا ان بستیوں پر نظر کی ہوگی جن راہوں پر وہ بے خطر آزاد پرندے کی طرح گھومی پھری اور یہی راہیں جن پر سے گزرتے وہ اندھیرے میں اپنے آپ کو "رات کی ماں" کہتی۔

یہ پگڈنڈیاں اور کھوہ اور ان کی نالیوں میں چمکتا پانی زندگی بخش ٹھنڈا اور میٹھا یہ جسم کے ساتھ چھو کر اسے سکون دینے والی ہوا جب وہ کھوہ کی منڈیر پر بیٹھی ہوگی تو اس نے یہ سب محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ جانا ہوگا کہ ان چیزوں میں اس کے لئے کوئی آس نہیں رہی اس کے اپنے جینے کا کوئی مطلب ہی نہیں رہا۔ جانے وہ جوان ہوتے ہوئے بھی اتنی مایوس کیوں تھی ؟

اور مجھے آم کے باغ میں بیٹھے جب خوشبو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے کبھی کبھار ایک ہیولیٰ دکھائی دیتا ہے جو میری طرف آتا ہے اور پھر قریب آ کر ہولے ہولے شام کی سرخی شفق کے رنگ اور رات کے اندھیرے میں گھل جاتا ہے۔

انتظار حسین

خانصاحب والوں کی بیٹی

جتنے منہ اتنی باتیں۔ مولوی شریعت اللہ صاحب تو خیر دنیا کے قصوں میں ہی نہیں تھے انھوں نے تو سیدھی سادھی شریعت کی بات کی اور کہا کہ عورت کی آواز نامحرم سنے۔ یہ شرعاً ناجائز ہے۔ پس عورت ریڈیو پر کس طرح بول سکتی ہے۔ ریڈیو کو تو نامحرم سنتے ہیں۔ مگر سکینہ تائی کا استدلال دوسرا تھا۔ انھوں نے حقارت بھرے لہجہ میں کہا کہ" خانصاحب والے ویسے تو بڑے عزت والے بنتے ہیں، اب ان کی عزت کہاں گئی۔ ان کی بیٹی کا نام جھنڈے پر چڑھ رہا ہے اور موئے پنواڑیوں پنساریوں کی زبان پر ہے۔" یہ بات کرتے کرتے وہ ریڈیو پر برس پڑیں" اے بی بی ریڈیو پہلے شریفوں کے گھر میں ہوا کرتا تھا۔ اب تو موئے کی ایسی مٹی خراب ہوئی ہے کہ پنواڑیوں تک کی دکانوں پر دکھا رہتا ہے۔ تو بی بی ریڈیو پہ بولنا پہلے عزت کی بات ہوگی۔ اب اس میں کیا عزت کی بات رہ گئی۔"

آپا شریفن بولیں" اجی ہوگی عزت کی بات۔ ہم نے تو کبھی کسی شریف گھر کی لڑکی کو ریڈیو پہ جاتے دیکھا نہیں تھا۔"

بندو کہنے لگی" اجی کس زمانے کی بات کر رہی ہو۔ اب تو دنیا کی لڑکیاں یہی کر رہی ہیں۔ کون لڑکی ہے جو کالج نہ جاتی ہو۔ اور میں کہوں ہوں کہ جب لڑکوں کے ساتھ پڑھنے پہ اعتراض نہیں ہے تو ریڈیو پہ بولنے میں اعتراض کی کیا بات رہ گئی۔ یہاں تو غیر مرد آواز ہی سنتے ہیں۔ کالج میں طباق سے منہ لڑکوں میں لئے پھرتی ہیں۔"

آپا شریفن نے جواب دیا کہ" اری دنیا کی لڑکیوں کی تو نے کیا بات کی، دنیا کی

لڑکیاں تو اب ناچ گا بھی رہی ہیں۔ دنیا کی دیکھا دیکھی تم اپنی لڑکیوں کو نچانا بھی شروع کردو گی"

اس دلیل کا بندو کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مگر پھر سکینہ تائی نے بات میں سے ایک اور بات نکالی۔ بولیں "اری میاں اس گھرانے کا تو باوا آدم ہی الٹا ہے۔ یہ بیحیائی آج کی بات تھوڑا ہی ہے۔ خانصاحب کی چھوٹی والی بیٹی اللہ اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اس کا نام تو رسالوں میں چھپ گیا تھا۔ اور رسالوں کے دفتروں سے ہم نے اس کے نام خط اپنی آنکھوں سے آتے دیکھے ہیں۔ جو پھوپھی نے کیا تھا وہ اب بھتیجی کر رہی ہے۔ پھوپھی نے خاندان کا نام اخباروں میں نکالا تھا۔ بھتیجی خاندان کا نام ریڈیو پر مشہور کر رہی ہے۔"

آپا شریفن کہنے لگیں "بھئی بڑے تعجب کی بات ہے۔ خانصاحب خود تو اتنے نمازی پرہیزگار ہیں کہ سجدے کرتے کرتے ماتھے میں گٹا پڑ گیا۔ مگر بیٹیوں پوتیوں پہ کبھی روک ٹوک نہیں۔ آخر خدا کو کیا منھ دکھائیں گے۔"

سکینہ تائی تنک کر بولیں "اجی بس رہنے دو پانچ وقت ٹکریں مار لینے سے تو کوئی نیک پاک نہیں بن جاتا۔ نمازیں پڑھ کے لوگ سود لیویں ہیں، رشوتیں کھاویں ہیں ـــ خانصاحب کو تم نہ جانتی ہو کیا چیز ہیں۔ ڈولی نصیبن کو چار پیسے قرض دئے تھے، سود میں پورا گھر قرق کرالیا۔"

خانصاحب والوں نے ایسی باتوں کا مطلق نوٹس نہیں لیا۔ اس آزاد خیال گھرانے نے ہمیشہ وقت کے قدموں سے ملا کر قدم اٹھائے۔ برادری والوں نے ہمیشہ ان پر انگلیاں اٹھائیں۔ اس وقت بھی تو بہت انگلیاں اٹھی تھیں جب خانصاحب نے اپنی بیٹیوں کو لڑکوں کے کالج میں پڑھنے کے لئے داخل کرایا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ مخالفت کی گرد خود ہی بیٹھ گئی اور جب خانصاحب کی دونوں بیٹیاں پڑھ لکھ گئیں یعنی بڑی بیٹی انٹرمیڈیٹ میں فیل ہو کر اب ڈپٹی کلکٹر کی بیوی بن گئی اور چھوٹی بیٹی نے تھرڈ ڈویژن میں بی اے کر لیا تو خانصاحب کا گھرانا برادری بھر میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ گھرانا تسلیم کیا گیا۔

سو جب منیرہ اشرف نے ریڈیو پہ جا کر خواتین کے پروگرام میں اپنا مضمون پڑھا تو یہ اس گھرانے کی تہذیبی روایات کے عین مطابق تھا۔ خانصاحب اشرف علی

نے اس روز اپنی شام کی ساری مصروفیات ملتوی کر دیں اور پروگرام شروع ہونے سے آدھ گھنٹہ پہلے ریڈیو سیٹ اپنے کمرے میں منگوا کر رکھ لیا۔ گھر کے باقی لوگ بھی اسی کمرے میں جمع ہو گئے۔ خانصاحب ریڈیو کا سوئچ مستقل گھماتے رہے اور دور دور کے اسٹیشنوں سے ملا کر وقت گزارتے رہے۔

جب منیرہ اشرف ریڈیو پہ اپنا مضمون پڑھ کر واپس آئی تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا خانصاحب نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور اسے بہت شاباشی دی۔ گلشن نے کہ گھر کی پرانی خادمہ تھی اور اب بہت بوڑھی ہو گئی تھی اس کی بلائیں لیں اور دعا دی کہ چاند سا دولہا ملے۔ پھر وہ سوتی ہوئی سکینہ تائی کے گھر گئی اور اعلان کیا کہ آج ہماری بٹیا ریڈیو پہ بولیں تھیں۔ مگر سکینہ تائی کو یہ خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ اصل میں یہ خبر محلہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ اور بشیر لمبو نے تو اسی شام منیرہ اشرف پہ عاشق ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ یوں اس نے منیرہ اشرف کو اکثر بار موٹر میں گزرتے دیکھا تھا اور کئی بار اس کے پیچھے اسکوٹر بھی لگایا تھا۔ لیکن ریڈیو کے واسطے سے آنے والی آواز نے اس پہ جادو کا اثر کیا۔ خالد نے اس معاملے میں زیادہ سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنی امی جان سے کہہ کر اس کے گھر پیغام بھجوا دئے۔ مگر خالد نے ایم اے کر لیا ہو سو تھا تو وہ ہنوز نکھٹو ہی۔ ادھر کڑوا کریلا نیم چڑھ چکا تھا۔ خانصاحب والے یوں بھی ناک چڑھے تھے۔ اور اب تو ان کی بیٹی ریڈیو پہ بولنے لگی تھی اور اگر اس کی شکل وصورت میں کوئی کمی رہ گئی تھی تو ریڈیو پہ بولنے سے ان کی دانست میں اس کی تلافی ہو گئی تھی۔ سو اب وہ سی ایس پی سے کم کے رشتہ پہ غور کرنے کے لئے تیار نہیں تھے خالد کی امی کو ٹکا سا جواب مل گیا۔

مگر ریڈیو والے بھی عجب تھے۔ ایک پروگرام دے کر سو گئے۔ اور وہ پروگرام بھی عجب بیڈھنگے طریقے سے دیا گیا تھا۔ ایک خاتون نے پروگرام سے ایک دن پہلے اپنے بچے کی بیماری کا عذر کر دیا۔ ہنگامی طور پہ یہ پروگرام منیرہ اشرف کو ملا۔ اسی لئے کسی کو ریڈیو پر اس کے بولنے کی خبر ہوئی کسی کو خبر نہ ہوئی۔ جب خالہ جی کو یہ خبر پہنچی کہ منیرہ ریڈیو پہ بولی ہے تو انھوں نے سخت شکایت کی کہ اب میں اتنی غیر ہو گئی کہ خوشی کی بھی خبر مجھے نہیں دی جاتی۔

خانصاحب نے طے کیا تھا کہ اب جب منیرہ ریڈیو پر بولے گی تو اس کے چچا جان اور خالہ بی دونوں کو بذریعہ خط پہلے سے اطلاع دی جائے گی۔ مگر ایک مہینہ گزر گیا اور ریڈیو والوں نے کروٹ ہی نہ لی۔ منیرہ اشرف کو سخت تشویش ہوئی، اس نے بہت بھاگ دوڑ کی۔ اور آخر اپنی اس سہیلی کے ذریعہ جو ریڈیو میں اثر و رسوخ رکھتی تھیں اور جن کی سفارش پر اسے پہلا پروگرام ملا تھا اس نے دوبارہ پروگرام حاصل کر لیا۔ اس مرتبہ باقاعدہ ریڈیو کنٹریکٹ ایک مہینہ پہلے موصول ہوا تھا۔ خانصاحب نے عینک لگا کر کنٹریکٹ کی پشت پر چھپی ہوئی پوری انگریزی عبارت کو غور سے پڑھا۔ پھر انھوں نے ایک خط چھوٹے بھائی کو لکھا کہ تمہاری بھتیجی فلاں دن فلاں وقت ریڈیو پر بول رہی ہے اور ایک خط خود منیرہ سے خالہ بی کے نام لکھوایا۔ گلشن نے پہلے سکینہ تائی کے گھر جا کر کہا۔ پھر سارے محلے میں ڈھنڈورا پیٹا کہ ہماری بٹیا کو ریڈیو والوں نے خط بھیج کر بلایا ہے۔ ہماری بٹیا ریڈیو پر بولنے جاویں گی۔

جس شام کو پروگرام ہونا تھا اس شام کو خانصاحب نے سب عزیز رشتہ داروں کو گھر ہی بلا لیا تھا۔ ریڈیو ڈرائنگ روم میں لا کر رکھا گیا۔ ساتھ میں چائے کا اہتمام کیا گیا باقی سب رشتہ دار تو شہر ہی سے آئے تھے مگر تائی اماں ریل کا سفر کر کے آئیں انھوں نے خانصاحب کو مبارکباد دی کہ منیرہ ماشاءاللہ بہت ذہین لڑکی ہے۔ اور مشورہ دیا کہ اس کے لئے ایسا ہی لائق لڑکا تلاش کرنا چاہیئے۔ اور اب لڑکی اللہ رکھو سیانی ہو گئی ہے۔ اس کا بیاہ ہو جانا چاہیئے

بشیر لمبو اور خالد دونوں نے ننوا چائے والے کے دکان پر بیٹھ کر ریڈیو سننے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس شام انھوں نے چائے کے ساتھ پیسٹریوں کا آرڈر بھی دیا۔ مگر ان پیسٹریوں کا سب مزا کرکرا ہو گیا۔ ابھی پروگرام کا اعلان ہی ہوا تھا کہ بجلی فیل ہو گئی۔

بشیر لمبو اور خالد نے بہت بے چینی کے ساتھ بجلی واپس آنے کا انتظار کیا۔

بجلی واپس آئی تو سہی مگر اس وقت جب اس پروگرام کا وقت گزر چکا۔

اب درخت کاری کے مسئلہ پر تقریر ہو رہی تھی۔ اور بشیر کو اس سے اتنی کوفت ہوئی جتنی اس روز نہ ہوئی تھی۔ جب فرمائشی پروگرام کے اعلان کے ساتھ لتا منگیشکر کی آواز بلند ہوئی تھی کہ بجلی غائب ہو گئی۔ اور واپس اس وقت آئی جب

فرمائشی پروگرام کا وقت گزر چکا تھا۔ مگر سکینہ تائی نے یہ کہا کہ "اجی چلو بجلی جلنے سے بات رہ گئی۔ ہم نے تو یہ سنا ہے کہ ریڈیو والوں نے منیرہ کے لکھے ہوئے کو پاس ہی نہیں کیا تھا۔"

اور آپا شریفن نے کہا کہ "لے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ وہ تو ریڈیو والی کے بچہ کو نمونیا ہو گیا تھا کہ منیرہ کو انھوں نے بلوا لیا۔ روز تیری میری لونڈیوں کو بلوا لیا کریں تو ریڈیو دو کوڑی کا رہ جائے گا۔"

عبدالرحمٰن صدیقی

تجربہ کی بات

"ابے ذرا بچ کے رہنا ان حضرت سے۔ اپنا کام تو بتانا تھا سو بتا دیا آگے تم جانو تمہارا
کام" سعیدہ نے یوسف کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔

"مگر یار کمال ہے۔ بغل میں چھری منہ میں رام رام۔ اپن کی تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ ابھی
تو حج کر کے آئے ہیں شیخ جی۔ بھلا وہ ایسی بات کیسے کر سکتے ہیں" مجید نے لقمہ دیا۔

"ارے یار بس رہنے بھی دو" سعیدہ ذرا تیز ہو کر بولا۔

"حج وج سے کیا ہوتا ہے۔ ابے تو تفتو کو بھول گیا۔ ابھی صرف سال ہی تو بھر کی بات ہے
اسنے حبیب الٰہی کے پیٹ میں چھرا گھونپا تھا۔ تو اُسے حج سے آئے ہوئے کے روز ہوئے تھے۔
ابے یہ اللہ میاں کی مرضی ہے جسے چاہیں نیک بنائیں جسے چاہیں بُرا بنائیں۔ حج وج میں کیا رکھا
ہے۔ اب اپن ہی کو دیکھ لو کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ محمد عارف کا لڑکا ہے۔ بات بیٹا ہمیشہ خدا
لگتی کہنے ہیں چاہے اپنے ہی پہ کوئی نہ پڑتی ہو"

یوسف بیٹھا اپنا ہونٹ چباتا رہا اور جھینپتا رہا۔ سعیدہ اپنے ہمسنوں میں سب سے
زیادہ تیز اور بڑا چلبلا پرزہ تھا۔ وہ محلے میں کافی بدنام ہو چکا تھا۔ ہر قسم کی بُرائی اور بدمعاشی
اس کے سر تھوپی جا چکی تھی۔ اور غالباً وہ اس کا مستحق بھی تھا۔ کیونکہ اس کی حرکات واقعی قابلِ
اعتراض تھیں۔ اس کا باپ جو بڑا نیک اور خاصا کھاتا پیتا آدمی تھا۔ تنگ آکر بھرے محلے
اسے چار چوٹ کی مار دیتا۔ اور مارتے مارتے تھک جاتا مگر سعیدہ تو جیسے پتھر کی سل تھا کہ اس
پر چاہے جتنا بٹہ کیوں نہ رگڑو وہ یونہی پتھر کی پتھر رہتی ہے۔ وہ سعیدہ ہی کیا ہوا جو ایک با
دو دفعہ کی مار سے ٹھیک ہو جائے۔ ابھی اس کی کمر کی بدیاں اسی طرح ابھری ہوئی اور لال لال

ہوتیں کہ وہ پھر میدان میں دندنانے لگتا۔ اور ہر آتے جاتے لڑکے سے اپنی بادشاہت کا اعتراف کروانے لگتا۔ بھولے بھالے لڑکے دور سے اسے دیکھ کر چلاتے" اے سعیدہ" سعیدہ اگر ان کی اس بات کو سن لیتا تو دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا مگر بظاہر اپنے خوفناک چہرے کو اور بھی خوفناک بنا کر للکارتا "سب سن لیا بیٹا۔ اپنے باپ کو گالیاں دے رہے ہو۔ ابھی لیتا ہوں سالے تمہاری خبر۔ بچ کر کہاں جاؤ گے۔ دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر....."

اور بھولے بھالے لڑکے کا گویا خون خشک ہو جاتا۔ اس طرح کہ بس کاٹو تو بدن میں لہو نہیں وہ یونہی پھٹی پھٹی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا کہ شاید کوئی حمایتی نظر آجائے۔ کبھی اگر کوئی بڑا بوڑھا پاس سے گذر گیا تو جان بچ جاتی اور سعیدہ اسے دیکھ کر خود ہی تڑی ہو جاتا۔ ورنہ تو بس شامت آجاتی۔ سعیدہ اپنی من مانی کرتا، مفت کی چپیوں سے لے کر چانٹوں تک جو اس کا جی چاہتا کرتا اور بھولا بھالا لڑکا کھڑا کانپتا رہتا۔ سعیدہ کا کچھ حلیہ ہی ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر اچھے اچھوں کے اوسان خطا ہو جاتے۔ ناٹا سا قد، چہرے پر چیچک کے داغ ایک آنکھ بھینگی، دانت انتہائی زرد اور میلے۔ جب ہنستا تو ایسے معلوم ہوتا جیسے دانت نہیں تین دن کے سڑے ہوئے خربوزے کے بیج ہیں۔ جسم ایسا مضبوط کہ جیسے فولاد۔

ایک دفعہ محلے کے ایک بزرگ نے اسے پکڑ لیا۔ وہ اس وقت غالباً خود ان کے لڑکے کے ساتھ کچھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ پکڑنے کو تو انہوں نے پکڑ لیا۔ اور دو چار چانٹے بھی جما دیئے۔ مگر بعد میں خود انہوں نے کسی سے اعتراف کیا کہ" اماں پکڑنے کو تو میں نے پکڑ لیا مگر بھئی وہ گوشت پوست کا نہیں۔ سچ مچ لوہے کا بنا ہوا ہے۔ اماں کیسے سخت بازو اور کلائی تھے۔ پتہ نہیں کم بخت میں کہاں سے اتنی جان آگئی ہے۔

مسجد کے امام صاحب جن کے ہاں محلے کے اکثر لڑکے قرآن شریف پڑھنے کے لئے جایا کرتے تھے سعیدہ سے الگ تنگ تھے۔ اول تو سعیدہ جماعت ہی سے بھاگ جاتا اور جو بیٹھتا بھی تو اس طرح کہ ساری جماعت اس سے تنگ رہتی۔ برابر بیٹھنے والوں کی تو بس شامت ہی آجاتی۔ کسی کے انگلی ہو رہی ہے تو کسی کے سوئی چبھوئی جا رہی ہے۔ کسی کو منہ چڑھایا جا رہا ہے تو کسی پر تاک تاک کر چنے اور مونگ پھلی کے چھلکے پھینکے جا رہے ہیں۔ مجال ہے جو کوئی

چوں بھی کرے۔ اگر کوئی ذرا سی ہوں بھی کرتا یا مولوی صاحب سے شکایت کے لئے ہاتھ اٹھاتا تو اسے باہر نکلنے کی دھمکی دیتا۔ خود مولوی صاحب اس سے اکثر بہت تنگ ہو جاتے ایک تو سبق بالکل یاد نہیں کرتا اور دوسرے یہ شہد اپن۔ ان کے ہاتھ میں ایک مضبوط طول دار رسی کوڑے کی طرح رہتی۔ کبھی کبھی جب بہت تاؤ میں آتے تو اسی سے اسکو سوت ڈالتے مگر سعیدہ نے تو اپنے جسم پر جیسے مگر مچھ کی کھال چڑھا لی تھی۔ کہ اس پر کسی چیز کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور اس کی حرکتیں پہلے کی طرح جاری رہتیں۔

ایک دن تنگ آکر مولوی صاحب نے اُسے مسجد کے اندھیرے کوئیں میں الٹے منہ لٹکا دیا۔ اور شاید آدھے گھنٹے تک اسی طرح چھوڑ دیا۔ مگر سعیدہ نے اُف تک نہ کی آخر مولوی صاحب نے ڈر کر خود ہی اسکو آزاد کر دیا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ اگر اس کا دم بھی نکل جائے تو بھی پناہ نہیں مانے گا۔ ڈھٹائی تو گویا اس پر ختم ہو گئی تھی۔ جب کنوئیں سے باہر نکالا تو اسکی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ آنکھیں لال سُرخ اور ان سے برابر پانی نکل رہا تھا منہ پر سردی کے باوجود پسینے کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ مگر تھا بالکل چپ۔ اس کے یار دوست اس کے پاس ہمدردی جتانے کے لئے پہونچے تو ان سے بھی کچھ نہیں بولا اسکے چہرے سے اس وقت عجیب قسم کی دہشت ٹپک رہی تھی۔

کنوئیں میں لٹکائے جانے کے کئی دن بعد تک سعیدہ خلاف معمول مسجد میں باقاعدگی سے آتا رہا۔ مگر وہ کسی سے بولتا چالتا بالکل نہیں تھا۔ جماعت میں بالکل گنگ بنا بیٹھا رہتا۔ اور مولوی صاحب کو گھورے جاتا کہ جیسے سچ مچ انہیں کھا کر ہی چھوڑے گا۔ مولوی صاحب بھی اس سے خوف کھاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے اتنے دنوں میں انہیں اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ وہ سعیدہ کو کم از کم ایک بار اپنے پاس بلا کر اس کا سبق سن لیں۔ یا جماعت میں اس طرح بیکار بیٹھا رہنے پر اس کی سرزنش ہی کر دیں۔ پھر ایک دن لڑکوں کو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب اچانک بیمار پڑ گئے۔ اور اسی دن سعیدہ نے اپنا چپ کا روزہ توڑ کر پہلے کی طرح ہنسنا بولنا شروع کر دیا۔ اسکے دوستوں نے اس سے پوچھا کر کیا اسنے مولوی صاحب پر کوئی جادو کر دیا ہے جو وہ اس طرح ایک دم سے بیمار پڑ گئے۔ مگر سعیدہ باتوں کو ہنس کر ٹال گیا جس سے لڑکوں

کا شوق اور شک اور بھی بڑھ گیا۔ اور پھر کسی نے ایک دم سے اڑا دی کہ اندھیرے کنوئیں میں جو جنات بستے ہیں ان سے سعیدہ کی یاری دوستی ہوگئی ہے اس طرح کہ وہ بالکل اسکے اشارے پر چلتے ہیں اور اسی کے اشارے پر انہوں نے مولوی صاحب پر حملہ کرکے انہیں چارپائی سے لگا دیا ہے۔ سعیدہ تک جب یہ بات پہنچی تو وہ ہنس کر ٹال گیا اسنے نہ 'ہاں' کیا نہ 'نہ'۔ اس خاموشی سے اسے بہت فائدہ پہنچا اس لئے کہ اس کے بعد اس کی شخصیت سب کی نظر میں انتہائی پراسرار ہوگئی اور وہ سب اس کو جنوں کا بادشاہ۔ جادوگر اور نہ جانیں کیا کیا سمجھنے لگ گئے۔ جماعت میں کسی کی مجال نہ تھی۔ جو اس کے سامنے نظر اٹھا سکتا۔ جس کو سزا دینا چاہتا "کھن بن" کہہ کر ایک ٹانگ پر کھڑا کر دیتا اور جب تک چاہتا کھڑا رکھتا "کھن بن" بقول اسکے اندھیرے کنوئیں کے جن کا نام تھا۔ جو اب اس کا غلام تھا اور وہ اس سے ہر ایک کام لے سکتا تھا۔ جس کو چاہتا مروا سکتا تھا۔ جس لڑکے کو وہ "کھن بن" کہے اسکے لئے لازمی تھا کہ وہ فوراً ایک ٹانگ پر کھڑا ہو جائے اور اس وقت تک کھڑا رہے جب تک سعیدہ "جا کھن بن" نہ کہے۔ بے چارے لڑکے کی ایک ٹانگ پر کھڑے کھڑے بری حالت ہو جاتی وہ روتا چیختا مگر مجال جائے جو بغیر سعیدہ کے حکم کے بیٹھ جائے "اللہ کے واسطے بھائی سعیدہ معاف کردو۔ خدا کے واسطے میری خطا معاف کردو۔ اُف اللہ میاں میری توبہ ..... اللہ کے واسطے بھائی سعیدہ"

اور سعیدہ اپنی بھینگی آنکھ جھپکائے بغیر اپنے اسیر کو گھورتا رہتا اور اسکے ہونٹوں پر ایک عیارانہ مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ اسے لڑکوں پر اپنے اختیار اور رعب کا پورا احساس تھا وہ انہیں خوب بتا چکا تھا کہ "جا کھن بن" کہنے سے پہلے بیٹھنے کی سزا کیا ہوگی اور وہ سزا اتنی بڑی تھی کہ لڑکے اسکے ذکر ہی سے کانپ جاتے "کھن بن" بہت بھاری اور خطرناک جن تھا جسے سعیدہ نے اپنی مٹھی میں لے رکھا تھا۔ وہ اتنا مضبوط تھا کہ بڑے سے بڑے آدمی کو اپنی چٹکی میں کھٹمل کی طرح مسل کر رکھ دیتا بقول سعیدہ کے "کھن بن" جس کا غلام ہے وہ بڑے بڑوں کی چٹکی بجاتے بند کر سکتا ہے

"ابے تونے وہ علاؤالدین کا دیو دیکھا ہے۔ بس ویسا ہی ہے یہ میرا یار "کھن بن" یہ بڑا

کالا سیاہ فام۔ وہ اڑ بھی سکتا ہے اور اسنے مجھے کئی بار آسمانوں کی سیر کروائی ہے ...
"کھن پن" کو ہاتھ میں لینے کے بعد سعیدہ کا محلے کے ہر چھوٹے بڑے لڑکے پر سکہ بیٹھ گیا تھا جنات اس کی مٹھی میں تھے اور وہ جس کا چاہتا آناً فاناً بیڑا غرق کر سکتا تھا۔

تو پھر یہ تھا جناب سعیدہ! اگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ یار کی یاری سے کام یار کے فعلوں سے کیا کام تو وہ بالکل ٹھیک ہی تو کیا ہے۔ سعیدہ کو لوگ لاکھ آوارہ اور بدمعاش کیوں نہ سمجھیں۔ مگر تھا وہ یاروں کا یار اپنے خاص دوستوں کے لئے اس کی جان بھی حاضر تھی۔ اس کے دوستوں کو اس کی اس صفت کا پورا اعتراف تھا۔ اور وہ اپنے والدین اور بزرگوں کی تاکید اور سرزنش کے باوجود اس سے چھپ چھپ کر ملتے اور ہر بات میں اس سے مشورہ لیتے۔ یوسف اور مجید بھی اسی ضمن میں تھے۔ سعیدہ ان میں سب سے زیادہ تجربہ کار تھا اب تو وہ سینما تک اکیلا چلا جاتا۔ بھلا باقی لڑکوں کی کہاں اتنی ہمت ہو سکتی تھی کہ وہ سینما کے قریب بھی پھٹک لیں۔ اگر کبھی عید بقرعید میلے تہوار کے دن سینما کا پروگرام بھی بنتا تو یا تو گھر ہی کے کسی بڑے کے ساتھ یا پھر دو چار مل کر کسی ایک کے ہاں کے ملازم کو ساتھ میں لیتے تب کہیں جا کر شو دیکھنا نصیب ہوتا۔ مگر سعیدہ تو کھلے خزانے سینما دیکھا کرتا تھا اور اس کا سب کو پتہ بھی تھا۔ اس کا کوئی بگاڑ ہی کیا سکتا تھا۔ کس میں اتنی ہمت تھی جو اس کے سامنے آ کر اپنی پگڑی اچھلواتا۔

شہر کے چپے چپے کا اسے پتہ تھا ایک دفعہ تو کسی نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ چاندنی بھی جانے لگا ہے یہ بات غلط تھی یا صحیح مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ "ان معاملات" کا سعیدہ کو اتنا کچھ پتہ تھا کہ اسکے سارے دوستوں کو ملا کر بھی اس کا عشر عشیر بھی نہیں آتا تھا۔ خود اپنے جسم کے مختلف حصوں کے متعلق بھی جو کچھ بھی انہیں اب آ گیا تھا۔ وہ سب سعیدہ ہی کے ذریعہ اسنے ہی انہیں اپنے جسم سے لذت حاصل کرنے کے طریقے سکھائے تھے نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ نہ پیسے چلے جانے کا خوف نہ بدنامی کا ڈر۔ مگر لطف پورے کا پورا۔ اکیل دوکیل دونوں کا مزہ۔ یوسف کو تو کچھ ایسا چسکا پڑا تھا کہ بس جب دیکھو اسی کے پیچھے پڑا ہے۔ سعیدہ کو جب معلوم ہوا تو اسنے بہت ڈانٹا! ابے سالے شامت

آتی ہے تمہاری۔ ابے یہ کوئی گڑیوں کا کھیل تھوڑا ہی ہے کہ جب چاہا لے کر بیٹھ گئے۔ اس میں جان لگتی ہے خون پانی ہو جاتا ہے۔ اگر اسے اس طرح ہنسی مذاق سمجھا تو بس بیٹا آگیا تمہارا نمبر۔ یوں ہی کسی دن بیٹھے بیٹھے ٹیں ہو جاؤ گے۔ ابے جبھی تو میں کہوں سالے تمہاری آنکھوں تلے یہ کالے کالے حلقے کیوں پڑے رہتے ہیں۔۔۔۔۔" اور یوسف جھینپ کر رہ جاتا اور ساتھ ہی اسکے دل میں ایک ٹھنڈا ٹھنڈا خوف بھی سرسرانے لگتا۔ اس کو کمپنی باغ میں اس مجمع لگانے والے کی صورت یاد آجاتی جو چیخ چیخ کر لوگوں کو "بچپن کی غلط کاریوں" کے ڈراؤنے انجام سے خبردار کیا کرتا تھا۔ وہ اعلان کرتا کہ ان حرکتوں کے باعث آدمی منہ دکھانے کے لائق نہیں رہتا۔ اور پھر وہ خون کے تناسب سے ثابت کرتا کہ صرف ایک قطرے میں کتنی جان ہوتی ہے اور اس کی کیا قیمت ہوتی ہے پہلے تو کچھ بھی نہیں معلوم ہوگا۔ مگر پھر آہستہ آہستہ آدمی کا سارا بدن گھلنے لگتا ہے آنکھوں تلے حلقے پڑ جاتے ہیں صورت سے پھٹکار ٹپکنی ہے چلو تو قدم ٹھیک نہیں پڑتے۔ سوچو تو سر گھومنے لگتا ہے بھوک بند ہو جاتی ہے۔ زندگی دوبھر معلوم ہونے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ خودکشی کو طبیعت چاہنے لگتی ہے۔ یہ لت ہی ایسی موذی ہے ایک دفعہ پڑ جائے تو چھٹائی مشکل ہو جاتی ہے اور۔۔۔۔۔" اور خدا جانے کیا کیا۔ یوسف کا ان باتوں کے خیال ہی سے دم نکلنے لگتا۔ وہ اللہ میاں سے توبہ کرتا کہ اگر اب کے کرے تو وہیں کھڑے کھڑے گر کے مر جائے۔ مگر پھر کسی نہ کسی طرح سے توبہ ٹوٹ جاتی۔ کبھی خود اپنی طبیعت بے قابو ہو جاتی کبھی مجید آجاتا کبھی کسی اور کا اثر پڑ جاتا۔ غرض کہ روز ہی کوئی نہ کوئی بہانہ اور موقع نکل آتا اور یوسف مجبور ہو جاتا۔ ایک دفعہ دوستوں کے کہنے سے اور دو دفعہ خود اپنی کمزوری کی بنا پر۔

سعیدہ کو جب اس کی ان زیادتیوں کا پتہ ہوتا تو بڑی ڈانٹ پھٹکار کرتا۔ اسکو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس تھا آخر اسنے ہی تو ان سب کو ڈھرے سے لگایا تھا ورنہ یوسف بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ بیر کا آگا کدھر ہوتا ہے اور پیچھا کدھر ہوتا ہے وہ تو نرا بدھو تھا ذرا ذرا سی بات پر شرمانے لگتا۔ آنکھ کے اشارے سے جھینپ جاتا جھینپو

تو وہ اب بھی اتنا ہی تھا مگر اندر خانے کافی ہوشیار ہو چلا تھا۔ اور خاص "کارروائی" میں تو سب سے آگے جا رہا تھا۔

پھر سعیدہ کو معلوم ہوا کہ یوسف پر شیخ جی کی خاص نظر عنایت ہونے لگی ہے۔ شیخ جی کو محلے ہی میں کیا بلکہ آس پاس کے سارے علاقہ میں کون نہیں جانتا تھا۔ ان کے دم سے ہر جگہ بڑی رونق رہتی تھی۔ ساٹھ کے پیٹے میں ہوں گے مگر زندہ دلی میں جوانوں کو مات کرتے تھے جب چلتے تو دونوں بازو چوڑے کر کے چلتے۔ آستین کے کفوں میں کبھی بٹن نہ لگاتے بلکہ انہیں یونہی کھلا چھوڑ دیتے اس طرح کہ وہ لٹک کر ان کی باہوں کی چوڑائی میں کچھ اور بھی اضافہ کر دیتے۔ تل جاولی داڑھی والے۔ لمبے لمبے۔ سرخ سفید۔ موتی ایسے سفید دانتوں والے شیخ جی عجیب رنگین شخصیت کے مالک تھے۔ ان کو رنڈوا ہوئے برسہا برس ہو گئے تھے۔ یار دوستوں کے اصرار کے باوجود انہوں نے دوسری شادی کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ اور یونہی چھڑے چھانٹ رہے شاید یہی کنوارپن ان کی قابل رشک صحت کا راز تھا۔ محلے میں اگر کوئی اچھی عمر کا جوان آدمی ان سے پوچھتا کہ شیخ جی آخر آپ کی صحت کا راز کیا ہے تو وہ ایک خاص معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہتے کہ میاں صحت وحت کیا یہ سب معاملہ "کرنٹ" کا ہے اور بس یہیں خاموش ہو جاتے۔

جب وہ گلی میں نکلتے تو باچھیں کھلی ہوتیں۔ اپنے برابر والوں سے سلام وعلیکم سلام کے بعد کوئی نہ کوئی مذاق کی بات ضرور کرتے۔ پیر جی سے مٹھ بھیڑ ہو جاتی تو ان کے نام کی مناسبت سے ان کی پیری بول دیتے۔ "اماں سلام وعلیکم۔ پیر جی....." اور پھر ذرا منہ ایک طرف کر کے خود ہی کہتے! "پیری ہے بے....." حافظ محمد دین کو دیکھتے تو "اندھے حافظ جی" کا نعرہ لگاتے "اماں اندھے حافظ جی سلام وعلیکم۔ ذرا دیکھ کے آگے کنواں ہے...." حافظ محمد دین محلے میں شاید تیسرے بزرگ تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں پر طاقت والا چشمہ چڑھا لیا تھا۔ بوتصائی کی دکان کے آگے سے آپ گذرتے تو نعرہ چست کرتے "کبھو بھی

خلیفہ آج کس کا قیمہ بنا رہے ہو۔ بڑے کا یا چھوٹے کا ..... " بوکے دو لڑکے تھے جو اسکے ساتھ ہی دکان پر بیٹھا کرتے تھے ۔ آٹا دال والے حکیم جی کی دکان کے پاس سے گذرتے تو کہتے ! " اماں سلام و علیکم ۔ کہو بھئی مرغی کے ــــ انڈے کیا بھاؤ لگائے ہیں " مرغی کے بعد وہ ذرا سا سکتہ دیتے اور حکیم جی ان کی پھبتی پر کبھی مسکرا دیتے اور کبھی جھلا اٹھتے ۔

حاجی مہرالٰہی سے ان کی پرانی یاری تھی ۔ گو اب حاجی مہرالٰہی بہت بدل گئے تھے ۔ وہ نہ صرف دادا نانا قسم کے بزرگ ہو گئے تھے بلکہ اپنے آپ کو ویسا ہی سمجھنے بھی لگے تھے ۔ مگر شیخ جی پر اس کا کیا اثر ہوتا تھا ۔ ان کو تو اپنے مذاق سے کام تھا وہ دونوں ساتھ کے کھیلے ہوئے جوڑی دار تھے ۔ عمر بھی تقریباً برابر تھی ۔ مگر ان میں اب زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا تھا ۔ کہاں شیخ جی کہ چلتے تو دندناتے ہوئے معلوم ہوتا کہ اب بھی پتھر پہ پاؤں ماریں تو پانی نکل آئے ۔ اور کہاں حاجی مہرالٰہی کہ کمر جھکی ہوئی ہے اور جیسے سوچ سوچ کر قدم اٹھا رہے ہوں ۔ ایک دن شیخ جی سے جو آمنا سامنا ہوا تو لنگڑا لنگڑا کر چل رہے تھے ۔ بجائے پیر میں موچ آ گئی تھی یا گٹھیا کا اثر ہو چلا تھا ۔ شیخ جی بھلا کہاں چپ رہنے والے تھے فوراً بولے " اماں کیا ہو گیا دشمنوں کو کہیں کسی لات تو نہیں مار گئی ۔ بھئی کیا کہتے ہیں میرے ٹڈے پہلوان نے جواب نہیں ..... " حاجی صاحب منہ بسور کر رہ گئے ۔ یہی بات انہیں زہر معلوم ہوتی تھی ۔ بھلا یہ کوئی پھبتی بازی کا موقع تھا ۔ اور پھر آدمی ذرا اپنے سن کا بھی تو خیال کرے یہ تو وہی بوڑھے منہ مہاسے والی بات ہو گئی ۔

شیخ جی کی اس چھیڑ چھاڑ میں محلے کے لونڈے بالوں کو بڑا مزہ آتا تھا ساتھ ہی انہیں بڈھوں کی باتوں پر تعجب بھی ہوتا تھا ۔ ایک طرف تو یہ حال تھا کہ حاجی مہرالٰہی کے نام سے بھی ان کے گھر والوں بلکہ سارے محلے والوں کی جان نکلتی تھی اور دوسری طرف یہ عالم تھا کہ وہ شیخ جی کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے ان کی پھبتیاں سنتے اور بس بڑبڑا کر رہ جاتے ۔ حالانکہ وہ اتنے غصیل تھے کہ اکثر لوگ تو انہیں سلام کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے ۔ بات کی بات میں ان کا پارہ چڑھ کر آسمان سے باتیں کرنے لگتا ۔ اور وہ جس سے خفا ہوتے وہیں کھڑے کھڑے اس کی ایسی کی تیسی پھیر کر رکھ دیتے ۔ جو منہ میں آتا اسے سناتے اور آئندہ کے لئے کان پکڑواتے مگر شیخ جی کی فقرے بازی

کے سامنے ان کی کیفیت ہی دوسری ہوتی ۔ چھوٹی پود والے اس پر بہت حیران ہوتے مگر جو لوگ ذرا بڑی عمروں کے تھے وہ کہتے "بھئی اس میں تعجب کی کیا بات ہے بڈھا بڈھے کو پہچانتا ہے ۔ اماں یہ بڈھے بھی کبھی جوان تھے یہ حاجی مہرالٰہی کوئی ہمیشہ کے حاجی تھوڑا ہی ہیں ۔ اور شیخ جی خیر ان کا تو کہنا ہی کیا ۔ آج اب ضرور کر آئے ہیں مگر شیخ جی آخر شیخ جی ہیں ۔ ان کا کوئی کیا مقابلہ کر سکتا ہے ۔ ویسے اپنے وقتوں میں حاجی مہرالٰہی بھی راجہ اندر سے کم تھوڑا تھے انہوں نے شیخ جی کے ساتھ مل کر کیا کیا گل چھرّے نہیں اڑائے ۔ سبزی منڈی میں ایک پوری کوٹھی کرائے پہ لے کر کون سا عیش نہیں کیا ۔ اجی وہ تو یہ کہو کہ حاجی صاحب کے اتنے پوتے نواسے ہو گئے اور شیخ جی یونہی چھڑے چھانٹ رہ گئے ورنہ حاجی صاحب ان سے کوئی کم تھوڑا ہی ہیں ۔ تل یا پٹ کسی داؤ بھی مار کھانے والا نہیں تھا مگر یار دوست وقت وقت کی بندری ہوتی ہے ۔ کمال تو دراصل شیخ جی کا ہے کہ وہ وقت کا جیسے ان پر کوئی اثر ہی نہیں ۔ داڑھی کے بال اب ضرور آدھے سے زیادہ سفید ہو گئے ہیں اور سر پہ آلیٹ آگیا ہے ورنہ مجال جائے جو ذرا سا بھی کوئی اور فرق پڑا ہو ہم نے تو جنم ہی سے ان کو ایسا دیکھا ہے کیا بڑی بوٹی پائی ہے اماں ٹھیک ہی تو ہے وہ کرنٹ والی بات ۔ نہ جورو نہ جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

چھیڑ چھاڑ میں شیخ جی لونڈے بالوں کو بھی نہیں بخشتے ۔ چلتے چلتے کبھی اس کے کان پکڑتے کبھی اس کی گردن کے گرد اپنا وسیع و عریض بازو ڈال کر بر کو دبا لیتے ۔ جو بمشکل ان کے پیٹ یا اس سے ذرا اوپر پہنچ پاتا تھا کبھی کسی کے گدگدی کرتے ۔ وہ جب کلبلاتا تو ٹھٹھا مار کر ہنستے "اٹھ جا سمار (حمیار) ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں تجھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور پھر انعام میں کبھی ادھنا کبھی اکنی نکال کر دے دیتے "چلو بھاگو اس کی جلیبیاں کھا لینا ذرا ہاتھ پیروں میں جان تو آئے یہ تو اس قدر سوکھے کیوں جا رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" یہ کہہ کر وہ لڑکے کو آزاد کر دیتے اور وہ مٹھی میں ناوا دبا کر یہ جا اور وہ جا۔

چند لڑکوں پر شیخ جی خاص طور پر شفقت کرتے مثلاً بابو پر ۔ اسکے باوجود کہ بابو محلہ میں خاصا بدنام تھا پھر بھی وہ اسکو بہت چاہتے تھے ۔ بیچ میدان میں کھڑے ہو کر وہ اسکے گدگدی اور ہنسی مذاق کرتے ۔ بابو بہت گورا چٹا تھا اور اس کی آنکھیں بلی کی آنکھوں کی طرح نیلی تھیں ۔ وہ ہر وقت دانت نکالے ہنستا رہتا تھا یا کچھ نہ کچھ کھاتا رہتا ۔ نہ جانے ہر وقت کھانے کے لئے اس کے پاس پیسے

کہاں سے آتے تھے دوسرا نواب تھا وہ خاصی عمر کا لڑکا تھا۔ پندرہ سال سے کیا کم ہوگا۔ اس کی آنکھیں بہت بڑی بڑی تھیں اور ان میں ہمیشہ سرمہ لگا رہتا تھا شیخ جی اس سے برابر چھیڑ کرتے۔ کبھی اسے بن بن کر ڈانٹتے۔ اور اس کے کلّے مروڑنے لگتے۔ نواب بھی ان سے برابر والوں کی طرح ملتا۔ ان کی باتوں پر ٹھٹھا مارتا اور دانت نکوسنے لگتا۔ فلو پر بھی شیخ جی اکثر مہربان رہتے اور اس سے بھی خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتے۔ فلو اپنے بالوں میں خوب تیل تھوپتا جس کی وجہ سے وہ ہر وقت چپکے اور چمکتے رہتے اور وہ انہیں دکھانے کے لئے اپنی ٹوپی سر کے بجائے اکثر اپنے ہاتھ میں یا بغل میں رکھتا تھا اس کا قد کافی چھوٹا تھا اور ہونٹ بہت موٹے موٹے اور سُرخ سُرخ شیخ جی اس کے خوب کان مروڑتے اور پھر خلیفہ دودھ والے کی دکان پر کھڑے ہو کر اپنے سامنے آدھ سیر کا مٹکیا نا پلواتے۔

مذاق تو خیر وہ سبھی سے کرتے تھے۔ کیا بڑا اور کیا چھوٹا۔ مگر اُدھر کچھ دنوں سے وہ یوسف پر بھی خاص شفقت فرمانے لگے تھے کبھی اس کے گدگدی کرتے کبھی اس کے کان مروڑتے اور کان مروڑتے مروڑتے ان کا ہاتھ اس کے گالوں تک پہنچ جاتا اور یوسف کو ایسے معلوم ہوتا جیسے وہ آہستہ آہستہ اس کے گال سہلا رہے ہوں مگر وہ پھر اک دم سے رک جاتے۔ دونی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھماتے اور ساتھ ہی کہتے کہ بیٹا اگر اور پیسے کی ضرورت ہو تو بتلا دینا۔

شیخ جی کا ہمیشہ سے یہی دستور تھا وہ اتنے بڑے تھے۔ بھلا ان پر کسی کو کیا شک ہو سکتا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اپنی شفقت اور سخاوت کی بنا پر لونڈوں بالوں میں مقبول تھے البتہ کبھی کبھی لڑکوں کو ان کے گال سہلانے میں ضرور اعتراض ہو جاتا مگر پھر بھی کیا غضب تھا دادا کے برابر آدمی کوئی کلہ کاٹ کر تو نہیں لے جاتے۔

پر سعیدہ کا اصرار تھا کہ شیخ جی سے بچ کر ہی رہنا چاہیے۔ "ابے تمہیں کیا معلوم کہ وہ کیا ہیں۔" "تو پھر تم بتاتے کیوں نہیں۔" یوسف نے جھلا کر سوال کیا۔ "ابے کہہ تو دیا ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔" سعیدہ غرایا۔ "جب آئے گا پھر بتلا دیں گے۔ سالے تمہیں روکتا

کون ہے۔ ایسی ہی کھجا رہی ہے تو ضرور ملوا اپنے دادا سے ....." اور یوسف جھینپ کر رہ گیا۔ اسنے امداد طلب نظروں سے مجید کی طرف دیکھا مگر مجید نے بھی اپنی نظریں دوسری طرف کرلیں۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر سعیدہ خود ہی بولا! "اچھا یار اپن کو ان سب باتوں سے کیا واسطہ جو جس کے جی میں آئے کرے مگر صاحب کیا کہنے ہیں شیخ جی کے اول نمبر کا بیاں ہیں"۔ "تو یار پھر بتا ہی کیوں نہیں دیتے۔ آخر ایسا بھی کونسا راز ہے"۔ مجید نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

سعیدہ نے مجید اور یوسف کو گھور کر دیکھا اور پھر بولا" اچھا بیٹا تو پھر اگر یہی بات ہے تو سنو۔ اِدہر اُدہر کی نہیں بلکہ پکی تجربے کی بات ....." اور پھر وہ سوچنے لگا جیسے اپنی داستان کے لئے کسی موزوں تمہید کی تلاش کر رہا ہو۔

الطاف فاطمہ

اک شورِ ماومن

یہ صبح تمام رات بھیگتی رہی تھی۔

اور جو سحر تمام شب بھیگتی رہی ہو۔ جن اجالوں کے پیش رو اندھیرے کی چھاتی پر بجلی کے کوندے تڑپ تڑپ کر جگمگائے ہوں جس ہنگام سحر کے نقیب سناٹوں پہ بادل گرج گرج کر برسے ہوں۔

ایسی سحر کو کیا کہئے۔

اور اس سحر کی پیش رو رات کے اندھیروں میں میں نے وہ خواب دیکھا۔

مگر خوابوں کا دیکھنا کچھ اچھی علامت نہیں۔ خواب تو ہمیں سرگرداں کر دیتے ہیں۔

انسان نے عہدِ قدیم سے اپنے اچھے خوابوں کی پاداش میں تختی سہی ہے۔

جب انسان ستاروں اور سورج چاند کو اپنے آگے سربسجود دیکھتا ہے تو اندھیرے کنوئیں اس کا مقسوم بنتے ہیں۔

اس علم کے باوجود میں نے تمام رات وہ خواب دیکھا حالانکہ میں اس تمام رات نیم خوابی کے عالم میں رہا تھا۔ میرے کانوں میں بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک گونجتی رہی تھی اور آنکھوں میں وہ خواب براجتا رہا تھا۔

تب وہ سحر بند کواڑوں کے اس طرف مسکرائی اور سحر کی کیا مجال جو کسی کی پردہ پوشی کر سکے چنانچہ اس کے حریری لبادے نے ہر روز کی طرح اس روز بھی تاریکی کا ہر راز فاش کیا۔ اور قصور تو میری کھڑکی کے میلے دھوانسے شیشوں کا تھا جو وہ ہنگام سحر دروازے کے اس طرف ہی ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔

مگر مجھے تو میرے خواب نے جگا دیا تھا۔

اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ خواب سوتے میں ہمارے پاس آتے ہیں یا انہیں بیداری سے وحشت ہوتی ہے لیکن ہمارے خواب ہی ہمیں جگا دیتے ہیں یا پھر ممکن ہے کہ وہ خواب ہی ایسے ہوں جن سے نیند گھبراتی ہو یا پھر یہ کہ ہم ان خوابوں کو عالم بیداری میں ہی دیکھنا چاہتے ہوں۔

میں نے اس خواب میں کیا دیکھا! یہ میں ہرگز نہیں بتا سکتا اس لئے کہ میں نے سنا ہے کہ خواب، بدخواہ، بدصورت اور کج فطرت انسان کے سامنے نہیں بیان کرنا چاہئے اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ کنعان کے بوڑھے پیغمبر نے اپنے بارھویں بیٹے کو منع کیا تھا کہ وہ اپنا خواب اپنے گیارہ بھائیوں کو نہ سنائے اور یقیناً وہ گیارہ بھائی بدصورت اور کج فطرت نہ رہے ہوں گے۔ یہ محض ہمارے خواب ہیں جو دوسروں کو بدخواہ اور کج فطرت بنا دیتے ہیں۔

اور یہ بھی سچ ہے کہ انسان کو اس کے اچھے اور برے دونوں ہی خواب سرگرداں رکھتے ہیں۔

میں اپنا خواب کسی کو نہیں سناؤں گا۔

اور اب مجھے دفتر جانا ہے۔

تمام راستے سڑکوں اور شاہراہوں نے گھوم گھوم کر مجھے پکارا ہے۔ آؤ! تم ہمیں اپنا خواب سناؤ۔

پتھروں اور تارکول کی سختیوں اور سنگینوں کو سہتی، تڑختی ہوئی دھوپ میں جھنجھناتی اور پٹا پیٹ بارشوں میں بھیگتی سڑک کسی کی بدخواہ نہیں ہو سکتی۔ وہ سب کے قدموں تلے بچھ بچھ جاتی ہے۔ کیا میں اپنا خواب اس کے آگے بیان کر دوں۔

ایک یہ بھی تو مصیبت ہے ہمارے اندر باتیں کیتی بھی تو نہیں یہ انسان کا اندر بھی کیسا بے برداشت اور بے ظرف ہوتا ہے اتنی سی ذرہ برابر پھانس کو بھی تو اپنے آپ میں سنبھال کر نہیں رکھ پاتا۔ جو سوئی لے کر کریدنے سے بھی اسے نہیں نکال پاتا۔ تو پھر وہ مواد بن کر پک کر پھوٹتا ہے اور وہ ذرا سی رمق بھر پھانس بھی مواد کے ریلے میں بہہ جاتی ہے۔

اور اب یہ پک کر پھوٹنے کی بات پر مجھے یہ بھی دھیان آیا ہے کہ میں اپنے آپ خواب کو اپنے ضمیر کے بطن میں اتنی مدت ضرور محفوظ رکھوں گا کہ وہ پک کر خود بخود پھوٹ نکلے۔

یہ کام کا وقت ہے اور میں ایک وہمی عورت کی طرح اپنے خواب کی ادھیڑ بن میں مصروف ہوں اور یہ کوئی نیا خواب تو نہیں جو میں نے دیکھا ہے میں نے سوتے اور جاگتے میں بارہا خواب دیکھے اور ان کے ہاتھوں سرگرداں بھی رہا ہوں۔

لیکن یہ خواب تو جیسے میرا پہلا پہلا خواب ہے یا پھر کیا بات ہے کہ میرا دل اپنے کام سے اچاٹ ہے۔

جب ہمارا دل اچاٹ ہے

جب ہمارا دل اچاٹ ہوتا ہے تو ہم انتہائی غیر ضروری اور غیر اہم باتوں کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے سوچتے ہیں مگر خواب کے بارے میں تو سنجیدگی سے فرعون نے بھی سوچا تھا اور اس نے اپنے تخت کے پائے کے ساتھ کھڑے تناور درخت' سے گھبرا کر بنی اسرائیل کا بیج مار دینے کی ٹھان لی تھی۔ اس لئے کہ اسکو بتایا گیا تھا۔ کہ تناور اور چھتنار درخت جمہور کی علامت ہوتے ہیں۔ پھر بھی مجھ میں اور فرعون میں بڑا فرق ہے وہ کاٹھ کے تخت پر بیٹھ کر خدائی کے دعوے اور اپنے فرمان جاری کرتا تھا اور اپنے موسیٰ کو خود اپنے ہاتھوں پروان چڑھا رہا تھا۔ اور میں YOUNG ONES (ینگ ونز) کے اس چھوٹے سے دفتر میں جس کرسی پر بیٹھا ہوں وہ نہ کاٹھ کی ہے اور نہ میری اپنی ہے لوہے کی تین ٹانگوں پر کھڑی یہ کرسی مرئی پلاسٹک کی باریک باریک پٹیوں سے بنی ہوئی ہے۔ اور یہ بھی اس دفتر اور اس کی ہر شے کی طرح بیرا انعام اللہ کی ملکیت ہے۔ میرا فرمان بجز اس دبلے پتلے پستہ قد تلوار جیسی مونچھوں والے ٹائپسٹ کے کسی دوسرے آدمی پر جاری ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ ٹائپ کے علاوہ پی این (PEON) اور ڈسپیچ کے فرائض بھی یہی خالد خاں ٹائپسٹ انجام دیتا ہے۔ جس کو بیگم انعام اللہ از راہ کرم دو بار اپنی گاڑی میں بٹھا کر ٹی بی کلینک لے جا چکی ہیں اور ملٹی وٹامن گولیاں بھی مفت دلوا چکی ہیں۔

اور اب میں نے خالد خاں سے پوچھا ہے۔

خالد خاں تم کو خوابوں میں یقین ہے۔

جی وہ! میں! وہ گھگیا گیا (نہیں معلوم یہ کیوں ہمیشہ گھگیا جاتا ہے مگر پہلے جب یہ اتنا کھانسا نہیں کرتا تھا تو یہ بات بھی نہ تھی)۔

وہ کہہ رہا ہے۔

"میں نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ پکا مکان بن رہا ہے راج اور مستری اونچے اونچے مچانوں پر شور مچا رہے ہیں۔ اینٹ لاؤ۔ گارا لاؤ۔

اور میں ہر طرف اہتمام کرتا پھر رہا ہوں۔"

اور میں نے جب یہ خواب مولوی صاحب کے سامنے بیان کیا تو وہ سر جھکا کر چپ ہو گئے۔

دوسرے دن والد صاحب فوت ہو گئے۔ اور میں ان کے سوئم اور چالیسویں کی فاتحہ کے چکر میں مصروف ہو گیا۔

کیا کہا! میں چیخ پڑا ہوں۔ اتنی زور سے کہ خالد خان اچھل پڑا ہے اسنے مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھا ہے۔ تم نے پکا مکان بنتے دیکھا تو والد صاحب فوت ہو گئے۔

جی وہ پہلے سے بھی کچھ بیمار تھے۔ کھانستے رہتے تھے اسنے سر جھکا کر ٹائپ شدہ کاغذ سمیٹنا شروع کر دیئے مگر میرا مطلب یہ ہے کہ کھانسی انہیں گلے سے آتی تھی۔

خالد خاں! میں نے رعب سے اسکو مخاطب کیا ہے۔

یس سر!

تم کو کسی اور اچھے خواب کی بری تعبیر ملی ہے۔

سر مجھے خواب یاد نہیں رہتے اسنے نہایت عیاری سے سر جھکا کر بات ٹالی ہے اس طرح کہ مجھے ضد آ گئی ہے میں اس کا خواب خوش سن کر رہوں گا جس کی تعبیر غلط ملی۔

دیکھو خالد خاں مجھے تمہارا خواب ابھی چاہیئے ہے مجھے خوابوں کے بارے میں فیچر لکھنا ہے میری آواز میں تحکم ہے اور میں کتنا جھوٹا ہوں۔ پیر انعام اللہ کی طرف سے مجھے سختی سے ہدایت ہے کہ YOUNG ONES کو میں اپنی اور اپنے ہی جیسے دوسروں کی جولانی طبع کا میدان بنانے سے احتراز کروں کہ طبع زاد باتوں میں کئی قباحتیں بھی ہوتی ہیں۔ میں تو ذہنوں

سے اترے ہوئے پرانے اور فرسودہ ٹائم میگزین لائف اور ریڈرس ڈائجسٹ کے دلچسپ اور محیر العقول مواد ہی کو بطور خود دیکھنے کا مجاز ہوں۔ شاید اسی لئے خالد خاں نے مجھے حیرت سے دیکھا ہے اور میرے بشرے پر بدستور قائم سختی کو دیکھ کر اب وہ اپنا ایک اور خواب بیان کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔

پھر جناب میں نے خواب میں اپنی منجھلی بہن کو دلہن بنتے دیکھا تھا تو جناب ایک ماہ بعد وہ بھی فوت ہو گئی۔

ایک اور اچھے خواب کی بری تعبیر مگر خالد خاں یہ تمہارے ہر خواب پر تمہارے گھرانے کے لوگ ہٹ سے مر کیوں جاتے ہیں؟ میں نے اسکو گھورا ہے۔

بس جی اتفاق ہے! اللہ کی قدرت ہے۔ اس کا نحیف اور پستہ وجود جیسے زمین میں گڑا جا رہا ہے۔ میں نے اس مرتبہ فالنامے میں دیکھا تھا اس میں یہی تعبیر تھی کہ جس کسی کو دولہا یا دلہن بنتے دیکھو تو یہ اس کی موت کی علامت ہے۔ اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم پشتینی بیماری میں مبتلا ہیں۔

خالد خاں مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا ہے اور اس کا خوف اور شک بے سود ہے۔

میں پہلے ہی بیگم انعام اللہ سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس کے ساتھ بیٹھ کر کام کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔

البتہ وہ اکثر اپنے گھر کے اس دور افتادہ کمرے میں اس کی موجودگی کے خیال سے اکثر پریشان ہو جاتی ہیں۔

اور کوئی خواب!

اور خالد خاں نے اس کام کو بھی شاید منجملہ ٹائپسٹ پی آن (PEON) اور ڈسپیچر کی ڈیوٹی کے طور پر قبول کر لیا ہے اور وہ نہایت مستعدی سے خواب سنا رہا ہے۔

پھر میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مر گیا ہوں اور فالنامے میں موت دیکھنا شادی کی علامت ہے تین ماہ بعد میری شادی ہو گئی اور چار سال میں جیسٹر واں ملا کر پانچ بچے ہو چکے ہیں۔

عجیب الٹے خواب دیکھتے ہو تم۔

خواب نہیں جی اس کی تعبیر الٹ ہوتی ہے اسنے نہایت وثوق سے کہا ہے۔

پھر میرے خواب کا کیا بنے گا میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ہے۔
جی آپ کا خواب؟
خالد خان! میں نے رعب سے اسکو مخاطب کیا ہے۔
یس سر!
اس ماہ کا پرچہ تیس تاریخ کو مارکیٹ میں آجانا چاہیئے۔
خالد خاں تم مجھ سے میرا خواب نہیں اگلوا سکتے۔ میں نے سوچا ہے اور اپنے کاموں
ں لگ گیا ہوں۔ میں یہاں سے اٹھوں گا تو مجھے مسعود مل جائے گا اور پھر وہ مجھ سے الٹی سیدھی
یں کر کے مجھے بور بھی کرے گا اور اپنے کام سے بددل بھی۔

لیکن مسعود یہ کبھی نہیں سوچتا کہ میں پیر انعام اللہ کی اتنی طویل اور عریض اور اتنی خوبصورت
ٹھی کے آخری سرے پر بنے ہوئے اس چھوٹے اور نسبتاً گرم کمرے میں اپنی خوشی سے نہیں بیٹھا
وں۔ اس کمرے میں جہاں پیر اور بیگم انعام اللہ کے سر میں YOUNG ONES نکالنے کا سودا
انے سے پہلے باغبانی کا فالتو سامان اور گھاس کاٹنے کی مشین رکھی جایا کرتی تھی۔ وہی شخص
ینا پسند کرے گا جسے کچھ مجبوری لاحق ہوگی۔ اور میں نے تو سینئر کیمبرج تک کسی ایسی ویسی بات
ے متعلق سوچا بھی نہ تھا۔ کہ سینئر کیمبرج کی وساطت سے تعلیم مکمل کرنے والوں کا مستقبل روشن اور
تحکم ہوتا ہے۔

لیکن یہ بھی ایک مجبوری ہی تھی کہ اگرچہ میں نے خالد خان کی طرح پکا مکان بنتے خواب میں نہیں
یکھا تھا لیکن پھر بھی! ابا جان پکا مکان بنواتے بنواتے فوت ہو گئے۔ اور پھر مجھے اس منزل تک
ہنچتے کئی سال لگ گئے اور سرکاری ملازمت میں عمر کی ایک خاص حد مقرر ہے جس کے آگے
ایک لفظ سننے پر تیار نہیں ہوتے۔ آخر عمر کا بڑھ جانا کوئی جرم تو نہیں۔

مگر مجبوری شاید سب سے بڑا جرم ہے جسے سننے کی کسے فرصت ہے میں نے جانا تھا کہ
ڑی موٹی ملازمتیں کر کے بہن بھائیوں کو پڑھوانے اور ان کا پیٹ بھرنے میں میرا وقار بہت بڑھ
ے گا۔ اور میرا شمار غازیوں اور شہیدوں میں کیا جائے گا۔ لیکن میں غلطی پر تھا اور یہ میرا پہلا
اب تھا جس کی تعبیر الٹ ملی تھی۔ میرا وقار گرتا چلا گیا۔ اور اب اس چھوٹے سے کیبن میں میں مسعود

کے ساتھ نہ جائے رفتن اور نہ پائے ماندن کے عالم میں بیٹھا ہوں مسعود تمہاری تخلیق اللہ تعالیٰ نے شاید میرے احساس اور جذبے کو مجروح کرنے ہی کے لیئے کی تھی۔

مسعود ہنس رہا ہے

یہ تمہارا YOUNG ONES ایک محدود حلقے میں ہی چلے گا۔ تم اپنے عوام سے دور ہو۔ تمہاری تحریر اجنبی ہے تم دلدل میں قدم جما کر کھڑے ہونا چاہتے ہو اور میرا دل چاہ رہا ہے مسعود کے منہ پر تھوک دوں عوام! عوام نفرت ہوگئی عوام کے نعرے سے عوام اور جمہور ہے کس بلا کا نام، عوام کدھر ہیں جب ان میں سے ہر آدمی خاص الخاص بننے کی فکر میں ہے بجز جھلسی دوپہروں میں سڑکوں پر کام کرنے والے مزدوروں اور بے حد گھوم گھیر والے رنگ برنگی پھولدار لہنگے پہنے چاندی اور کانسی کے میلے میلے زیوروں میں لدی مزدورنیوں کے جو بڑی چونچالی اور مستعدی سے دوڑ دوڑ کر کام کرتی ہیں ان کے قریب میری تحریر پہنچ رہی ہے اور نہ تمہاری۔ مسعود میاں میں اور تم ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اور ایک ہی دلدل میں قدم جما رہے ہیں۔ تمہارا ادب یہ مزدور نہیں سمجھیں گے اور YOUNG ONES پڑھنے والے بھی نہیں سمجھیں گے اس لئے کہ ان کو تمہارے ادب سے پرخ نہیں میرا مطلب مس نہیں ہے۔

اور رہ گئے باقی کے عوام تو وہ خود کو جلد جلد خواص میں تبدیل کر رہے ہیں۔ عوام کو خواص بنانے والی مشین کا پہیہ تیزی سے چکر کاٹ رہا ہے۔

تم کلف اور BEHTNIKS کے نمائندے ہو مسعود نے کافی میری پیالی میں اپنے ہاتھ سے ڈالی ہے۔ میری جان BEATLES کہو BEATNIKS اور BEHTLES میں بڑا فرق ہے۔

فرق ہو یا نہ ہو۔ تم ہماری نئی نسل کو تباہ کر رہے ہو مسعود کی کیپسٹن مُڑ گئی ہے اس لئے اب اسنے میری وڈ بائن کی ڈبیا میں سے سگریٹ کھینچ لیا ہے۔ تمہاری نئی نسل کو نہ میں تباہ کر رہا ہوں اور نہ تم۔ لیکن پھر بھی وہ تباہ ہو رہی ہے۔ یا پھر یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں مل کر اپنی نسل یعنی پرانی نسل تباہ کر رہے ہوں یا پھر ممکن ہے کہ وقت میرے اور تمہارے ہاتھوں یہ سب کروا رہا ہے۔ تم نے اپنے TEEN AGERS میرا مطلب ہے نئی نسل کے لئے کونسا

اور کس مقدار میں ادب پیدا کیا۔

واہیات ہو تم! مسعود کہیں دور دیکھ رہا ہے۔ ضرور اسکے کسی بیداری یا نیم خوابی کے دیکھے ہوئے خواب کی تعبیر الٹ ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ اب اس کے چہرے پر خالد خاں والی بے بسی ہے۔

دیکھو میری جان اب بھی مان جاؤ۔ میں بیگم انعام اللہ بھیوری کے آگے ہتھیار ڈال چکا ہوں۔ میں نے اپنے اندر کے سارے شور اور سارے ہنگامے کو سلا دیا ہے اور میرے اندر فی الحال کوئی الجھن کوئی کش مکش نہیں۔

کون سی بھیوری۔

یہی کہ اب انسانیت کو ایک ہی نقطہ اور مرکز پر متحد کیا جا سکتا ہے اور وہ کلفت کے ریکارڈ BEATLES اور رولنگ اسٹونس کی تہذیب ہے قطامہ ہے بیگم انعام اللہ حرافہ ہے

مسعود اتنی تیزی سے سگریٹ پر سگریٹ مت پھونکو میری وڈبائین میں کل دو سگریٹ باقی رہ گئے ہیں اور بیگم انعام اللہ کا بال بھی بیکا نہیں ہوا وہ اس وقت اپنے باغ میں بنی روکری کے ارد گرد کھڑے ناگ پھنی کے پودوں پر جراثیم کش دوائیں چھڑکوا رہی ہوں گی۔ اور ان کے دونوں لڑکے اور بڑی لڑکی اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی کوٹھی کی رقص گاہ میرا مطلب ہے بال کے فلور پر ٹوئسٹ بلکہ شیک کے ریکارڈوں کی گت پر رقص فرما ہوں گے۔

شیک! شیک کیا؟

واہ مسعود میاں یہ بھی خبر نہیں ٹوئسٹ اب والز، رمبا اور چاچا کی طرح آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے۔

چھوڑو مجھے نہیں دلچسپی تمہاری مغرب زدگی سے۔

یہ مغرب زدگی نہیں رہی مسعود! میری مانو مغربی موسیقی کے پاکستان اور بھارتی پروگرام باقاعدگی سے سنو تو تم کو احساس ہوگا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان دن بھر کشمیر حائل رہتا ہے اور ساڑھے دس بجے رات یہ خلیج خود بخود پٹ جاتی ہے اگر اناؤنسر بیچ بیچ میں اپنے

اسٹیشن کے متعلق یاد دہانی نہ کروائیں تو تم کو مطلق پتہ نہ چل سکے گا کہ یہ کس ملک اور کس اسٹیشن سے نشر ہو رہا ہے۔ دہلی سے کراچی اور پٹاری سے بمبئی والوں کے لئے چھوٹے چھوٹے جذباتی اور مخلص پیغاموں کے ساتھ اپنے خاندانی اور فلمی دوستوں کے نام بجوائے جانے والے ریکارڈ سنکر مجھے یوں لگتا ہے کہ بگین بادشاہ زادی کی سوکن نے گلے سے وہ مالا اتار دی ہے جس میں بادشاہ زادی کی جان تھی۔ اور دن بھر مردہ رہنے کے بعد وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی ہو۔ یہ وہ نقطۂ اتحاد ہے . . . . . میری بات ادھوری رہ گئی ہے۔ مسعود جھنجھلا کر اٹھ گیا ہے اور مجھے کیفے میں اکیلا چھوڑ گیا ہے میں یہاں اکیلا کھڑا ہوں۔ اس کیفے کے باہر موٹریں رکشا اور اسکوٹر ایک کے بعد ایک گزرتے جارہے ہیں۔ بیگم انعام اللہ کی گاڑی ابھی ابھی سامنے سے گزری ہے

ایل ای چھپن ہزار دو سو بیالیس ان ہی کی گاڑی کا نمبر ہے وہ خود ڈرائیو کر کے گاڑی لے گئی ہیں۔ ان کا رخ جم خانے کی طرف ہے اور ان کی گاڑی میں پیر انعام اللہ موجود نہیں۔

ان سڑکوں پر بہت ہنگامہ ہے اور میرے دل میں بھی بڑا شور شر اور ہنگامہ ہے پھر بھی میں سڑکوں پر گھومتا رہوں گا۔ میں گھر کے اندر اس وقت داخل نہیں ہونا چاہتا جب تک کہ میرے قدم زبردستی مجھے گھسیٹ کر وہاں نہ لے جائیں۔ میں گھر جانے سے اس لئے نہیں گھبراتا کہ وہاں کسی کا تبسم اور ہنستی ہوئی آنکھیں میری منتظر نہیں۔ یہ ایک اور خواب خوش تھا جو میں نے اکثر دیکھا۔ اور خالد خاں کے فالنامے میں اس کی تعبیر بھی الٹ ہی نکلے گی۔

جس طرح سرکاری ملازمت کے لئے میری عمر نکل چکی ہے شاید اسی طرح . . . . .

ہاں تو میں اپنے اس خواب کے ڈر سے واپس جانا نہیں چاہتا جو میں نے اس سحر کے بعد بھی اکثر دیکھا ہے کبھی سوتے ہیں اور کبھی جاگتے ہیں۔

آہ میرا وہ خواب جیسی پھانس کی طرح کب پک کر اور مواد بن کر پھوٹ بہے گا۔

اس لئے کہ میں وہ خواب کسی قیمت پر بھی کسی کے آگے بیان نہیں کرنا چاہتا۔ یہی تو وہ خواب ہے جس کی تعبیر خالد خاں کے فالنامے میں بھی نہیں۔

اس کا اور اس شور و شر کا انجام کیا ہونا ہے جو اس خواب کے نتیجے میں میرے اندر برپا ہے مسعود کہتا ہے دیوان حافظ سے بڑی سچی فال نکلتی ہے۔

مسعود بھی عجیب ہے پتہ نہیں وہ اتنی دور دور کیوں بھاگتا ہے اور جو میں کیٹس، بائرن یا پھر ہیملیٹ کے دیوان سے فال نکال لوں تو پھر اسکے مرچیں لگ جائیں مگر خیر یہ فاصلے بہت بعید میں سوچ رہا ہوں اور چل رہا ہوں اور آخر کو میرے قدم مجھے گھر کے دروازے پہ لے آئے ہیں اور اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں میر کے دیوان سے فال نکالوں گا۔
وہ بہت بھولا بھالا اور بے ضرر انسان تھا اور اس پہ تو شراب خواری کی تہمت بھی نہیں اور اب میں نے دیوان اٹھالیا ہے۔
مگر مجھے تو فاتحہ پڑھنا نہیں آتی۔ خیر خدا مجھے معاف کرے اور میر کو بھی۔ اور میرے اندر کے اس شور و شر کو بھی۔
میری انگلی سطروں پہ چلتی چلتی رک گئی ہے اور میں نے آنکھیں کھول دی ہیں۔

رہتی تھی بے دماغی ایک شور سا دمن میں
آنکھوں کے مند گئے پہ آرام سا تو پایا۔

ہائیں کیا کہا تم نے۔ میر جی: اور یہ تم غالب خاں بھی تو نہیں کہ جس کو ڈپٹ دیا جائے۔
دیوان میرے ہاتھ سے پھسل کر گر گیا ہے ایک اور رات۔
اور اب اس رات کی سحر قریب ہے۔
آج کی رات مجھے کسی خواب کا خطرہ نہیں ہے اس لئے کہ آج میں اپنے خواب کی طلسمات سے آزاد ہو چکا ہوں۔ کہتے ہیں خواب انسان کو اس وقت تک سرگردان رکھتے ہیں جب تک وہ اسے کسی کے سامنے بیان کر کے اس کی تعبیر نہ لے۔ ہاں میں سچ ہی تو کہتا ہوں
عزیز مصر نے خواب میں دیکھا۔
کہ سات دبلی گائیں ہیں جو سات فربہ گایوں کو کھا رہی ہیں اور اسنے مزید یہ بھی دیکھا کہ سات گیہوں کی سوکھی بالیاں ہیں اور سات ہری۔
اُس کے خواب نے اُسے اس وقت تک سرگرداں رکھا جب تک کہ یوسف صدیق کو زندان سے باہر نہ لایا گیا۔ اور یہ مصر کے بادشاہ بھی خوب ہوا کرتے تھے۔ پہلے خواب دیکھتے پھر ان کی تعبیروں کے لئے سرگرداں ہوتے۔

اور تعبیریں ملتیں تو ان کے مطابق عمل کرنے کی فکر میں دبلے ہوتے اور میں عزیزِ مصر تو نہیں
پھر اب ان دنوں ہمارے عہد میں یوسف صدیق کا زنداں خانے سے نکلنا بھی تو محال ہے
چنانچہ آج اس رات سے قبل چار سو پھیلی دوپہر میں میں نے اپنا خواب خود اپنے ضمیر کے روبرو
بیان کیا ہے۔ آج اس بھری دوپہر میں پیر انعام اللہ کی لان میں کھڑی رنگ برنگی چھتری کے سائے
تلے شیشے کی میز کے گرد چھوٹی چھوٹی نیچی نیچی کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے جب میں بیگم انعام اللہ کے سامنے
YOUNG ONES کے مسودے پھیلائے کام کر رہا تھا۔ اور بیچ بیچ میں ان کی ہدایتیں بھی
سنتا جا رہا تھا تو اسی وقت پیرزادہ صاحب بھی وہیں آ بیٹھے تھے اور انہوں نے مسودے اٹھا
کر دیکھنا اور ان پہ مختلف اعتراضات کرنا شروع کر دیئے تھے اور اسی آن مجھے محسوس
ہوا تھا کہ بیگم اور پیر انعام اللہ اب YOUNG ONES کی پالیسی بدلنا چاہتے ہیں۔
دیکھو..... اس فیچر کے بجائے اگر کوئی اور فیچر ہو جائے تو بہتر ہے یہ یہ کچھ ایسا ہی
ہے۔ وہ بات چبا چبا کر کہنا چاہ رہی تھیں۔

"مثلاً آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے؟ اور آپ کس انداز کا فیچر چاہتی ہیں؟"
سارا کام تیار ہو اور میٹر (MATTER) پریس میں جلنے والا ہو اور اس وقت سرے
سے پالیسی ہی کو غلط قرار دے دیا جائے تو پھر جھنجھلاہٹ تو آپ سے آپ ہی آئے گی۔
بیگم کو میرا لہجہ ناگوار گذر رہا تھا۔
انہوں نے ناگواری کو دانتوں تلے ہونٹ چبا چبا کر دبایا اور اپنے لہجے کو قابو میں رکھ کر مجھے
سمجھانا چاہا۔

"میرا مطلب ہے اس کے بجائے کسی مقامی موضوع پر فیچر ہو جائے۔"
"مثلاً؟ میں نے بھی جھنجھلاہٹ کو دانتوں تلے ہونٹ دبا کر ضبط کیا۔
"مثلاً یہ جو پوسٹ آفس کے باہر چٹھیاں لکھنے والے بیٹھتے ہیں ان کے بارے میں فیچر ہو جائے
اس مرتبہ!
"مگر مسز..... میڈم پھر وہ تصویریں اور ان کے بلاک وغیرہ"
"دیکھئے وہ سب ہو جائے گا تصویریں میرے ذمے رہیں۔ کوئی بات نہیں اس مرتبہ کچھ دیر

سے سہی ۔"

"مگر اب اس مرتبہ تو یوں ہی چلنے دیجئے ۔ اگلی مرتبہ سہی ۔"

"نہیں بھئی بات یہ ہے کہ تمہارے پیچ کا عوام سے کوئی ربط ہی نہیں ہے اپنے عوام میں
مطلب ہے جمہور سے بے تعلقی تو جسرم ہے ۔"

میں نے چونک کر بیگم انعام اللہ کو دیکھا تھا ۔

وہ انتہائی تندہی سے بقیہ مسودوں کے جائزے میں مصروف تھیں ۔ فرنچ شیفون ک
اٹالین پنک ساری اور اسی رنگ کے گرم امریکی بلاوز میں وہ بہت خوبصورت اور بہت معصو
معلوم ہو رہی تھیں ۔ ان کے چشمے کے سنہری فریم سے لے کر ان کے پیروں کی ہسپانوی چپل تک میں
ایک نرمی لطافت اور دل آویزی تھی ۔

اور مجھے ان کو ایسی باتیں کرتے دیکھ کر بہت دکھ ہوا تھا ۔ یہ شفاف دُھلا دھلا جسم او
لطیف اور نفیس لباس جمہور سے قریب آئے ۔ تو ان کا کیا انجام ہوگا ۔

اور پھر جیسے کسی نے میرے ہی اندر چونک کر سوال کیا تھا ۔

انجام ! مگر کس کا ؟

اور میں سٹ پٹا گیا تھا الجھن اور بد دلی نے میرے ذہن کو کھٹکا دیا تھا ۔

" اور نجومیوں نے فرعون کے خواب کی تعبیریں بیان کی تھی کہ اے بادشاہ وہ درخت
جو تو نے اپنے پایۂ تخت کے قریب پھیلتے اور پروان چڑھتے دیکھا ہے اس سے مراد بنی اسرائیل
بنی اسرائیل یعنی تیرے عہد کے جمہور ۔"

میں پھر جھنجھلا گیا تھا اس لئے کہ خواب اور ان کی تعبیریں پھر میرے ذہن پر حاوی ہو
تھیں اور میں خوابوں اور ان کی تعبیروں سے خوف زدہ تھا ۔ چنانچہ اپنی نوٹ بک لینے میں د
والے کمرے کی طرف چلا گیا ۔

تو خالد خاں بڑی تیزی سے ٹائپ رائیٹر پر انگلیاں چلا رہا تھا ۔

خالد خاں تیار ہو جاؤ ۔ موجودہ مسودے تقریباً سب کے سب رد ہو چکے ہیں اور اب
مسودے ٹائپ کرنا ہوں گے ۔

لیکن سر میں تو صاحب کی نامزدگی کے کاغذات ٹائپ کر رہا ہوں۔ خالد خاں نے یوں جواب دیا جیسے اسکو میری اور مسودوں کی کوئی پرواہ ہی نہ رہی ہو۔

نامزدگی کے؟ میں آج پہلی بار خالد خاں کے لہجے سے مرعوب ہوا تھا۔

یس سر! وہ اسمبلی کے الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔ اسنے ٹائپ رائیٹر پر جھکا چہرہ میری طرف اٹھا کر دیکھا تھا۔

اس کے چہرے کی طرف آج پہلی مرتبہ میں نے غور سے دیکھا تھا وہ بے رنگ پیلاہٹ میں ڈوب رہا تھا اور اس پر جا بجا ہڈیاں اور غدود سے ابھر رہے تھے وہ چہرہ تھا کہ پیلا اور ٹھٹرا ہوا بے جان پودا۔

میں اسکو دیکھ کر یوں حیران رہ گیا جیسے وہ آج ہی پہلی مرتبہ میرے سامنے پڑا ہو۔

خالد خاں! میں نے اسکو آواز دی۔

ہوں! وہ بے اعتنائی سے کاغذ پر حروف ٹٹولتا ہوا بولا تھا۔

اور پھر میں اس سے یہ پوچھے بغیر باہر نکل آیا تھا کہ

خالد خاں تمہارے ہونٹوں کی رنگت اور آنکھوں کی جوت کس نے چوس لی ہے۔

اپنی نوٹ بک اور فائل لئے ہوئے لان کی طرف جاتے جاتے میری نظر رکابین کے گھنیرے درخت کی جڑ کی طرف گئی اور اس کی جڑ کے بہت قریب بلکہ ساتھ ایک ننھی سی کھمبی اگ تھی۔ میرا ذہن بدستور سوچ رہا تھا

خالد خان بیگم و ہیر انعام اللہ فنجائی۔

یعنی کھمبی یعنی وہ بے رنگ و بو چھتری نما پودا جو اپنی بقار اور غذا کے لئے دوسرے توانا اور گھنے درختوں کا محتاج ہوتا ہے جو چپکے سے دھیرے سے اپنے بے برگ و بار وجود سے بال سے بھی زیادہ باریک ڈورا کسی ہرے بھرے درخت کی رگ میرا مطلب ہے جڑ میں پیوست کرکے آرام سے اسپر پلتا رہتا ہے

اپنے سائنس ماسٹر کی سالہا سال پرانی دھیمی اور ٹھیری ہوئی آواز رفتہ رفتہ میں نے سنی تھی اور میں فائل اٹھائے اپنی جگہ پر جا بیٹھا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ اس لان پر لگی رنگ برنگی

چھتری تلے بیٹھے بیٹھے میرا سر یوں چکرا یا تھا جیسے میں کسی منڈولے میں بیٹھا ہوں۔
دھیرے دھیرے ہر مبہم اور غیر واضح چیز میرے ذہن کے پردوں پر اجاگر ہوئی۔
اور پھر میرا وہ خواب جسے میں بیان بھی کرنا چاہتا تو بیان نہ کر پاتا۔ جو میرے ذہن اور احساس کے درمیان مفید تھا انگڑائی لیتا محسوس ہوا یہاں تک کہ وہ ہر قید سے آزاد ہوا اور میرے ذہن کے پردے پر ابھرا۔
ہاں میں نے اس رات ریکائن کا یہی گھنا درخت دیکھا تھا مگر وہ اس وقت اور بھی گھنا نظر آرہا تھا کہ اس کی ڈالیں ہر ایک چیز پر چھائی جارہی تھیں پر وہ درخت کسی کے تخت کے پائے کے ساتھ نہیں تھا بلکہ دھرتی کے بیچوں بیچ بڑی توانائی اور شگفتگی سے کھڑا تھا لحظہ بہ لحظہ آندھیوں اور طوفان کے ساتھ ساتھ اس کا محیط بڑھا۔ اور پھر اچانک کڑک اور گرج کے درمیان اسکے ارد، گرد زمین شق ہوئی اور بےشمار کھمبیاں نمودار ہوئیں۔ ہاں وہی درختوں کی قوتِ نمو اور سرسبزی کو چوس لینے والی کھمبیاں۔
ہر کسی کے انجانے میں موہوم بے رنگ اور باریک ڈوراسی رگیں آگے بڑھیں اور درخت کی جڑوں سے چمٹ گئیں۔
اور اب مجھے کچھ یاد نہیں آتا.....
مگر ٹھہرو مجھے اور کچھ بھی یاد آرہا ہے۔
ان کھمبیوں پر عجیب وغریب ٹوپیاں پہنے چھوٹے چھوٹے ہیولے تھے۔ ان کی شکلیں اور ان کے چہرے! خیر اب میں کچھ اور نہیں کہنا چاہتا۔ ریکائن کا درخت خالد خاں کے پیلے اور گلٹیوں والے چہرے کی طرح ٹھرٹا اور سوکھتا جارہا تھا۔
میں نے آنکھیں بند کرلی تھیں اور اب پھر مجھے کچھ نہیں یاد آرہا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے اپنا خواب اپنے ضمیر کے سوا کسی اور کے روبرو نہیں بیان کیا۔
میں تو وہاں سے سیدھا اٹھ کر اپنی نوٹ بک اور فائل لے کر دفتر میں آگیا تھا میں نے اسکو دراز میں رکھا اور اپنا استعفیٰ لکھ کر خالد خاں کے حوالے کرکے چلا آیا تھا جو اس نے میرے آنے کے بعد بیگم انعام اللہ کے حوالے کردیا ہوگا۔

مسعود جب میرا استعفیٰ دینے کی وجہ سنے گا تو کس قدر لے دے کرے گا۔
جب اسکو یہ معلوم ہوگا کہ میں نے استعفیٰ اس لئے دیا ہے کہ میں اب YOUNG ONES کی اس پالیسی کو تبدیل کرنے کے حق میں نہ تھا جو میں نے جبراً بیگم انعام اللہ کے ایما ہی پر اختیار کی تھی اور مسعود جس کا مخالف تھا۔
واقعی میں کس قدر جمہور دشمن نکلا
اور اب اس رات مجھے مصر کے کئی خواب دیکھنے والے بادشاہ یاد آئے ہیں اس لئے کہ آج کی رات ہی مصر کے جلاوطن بادشاہ کی موت کی خبر سنی ہے جس نے وینس کے ایک ریستوران کے شور اور ہنگامے کے درمیان میز پر سر رکھ کر چپکے سے آنکھ موند لیں۔
اور یہ بھی ایک دلچسپ خبر ہے۔
کلو پیٹرا کے دیس کے فاروق نے جولیس سیزر کے روم میں دم دے دیا۔
اور آج کی شب میں نے ایک بڑے انسان کی موت پر بہت آنسو بہائے ہیں اور سوچا ہے

"مصر کے آخری بادشاہ کیا تو نے ایک بھی خواب نہ دیکھا
تھا۔ اور تجھے کبھی کسی یوسف کی رہبری کی ضرورت محسوس
نہ ہوئی۔ یا پھر یہ کہ تجھے اس کا کھوج ہی نہ ملا"

اور میں جو کہ عزیز مصر نہیں ہوں اور نہ ہی میں نے کسی کے روبرو اپنا خواب بیان کیا ہے پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے یوسف صدیق کو زنداں خانے سے باہر نکال دیا ہے اور اب مجھے بھی آنکھیں موند لینا چاہئے کہ میرے اندر بے حد شور اور بڑا ہنگامہ ہے۔

جوگندر پال

حلقۂ دامِ خیال

میری آنکھ لگ گئی ہے۔

مگر اپنے بند پپوٹوں کے اندر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مجھے باہر کی کل کائنات دکھائی دے رہی ہے، گویا میں سوتے سوتے جاگ رہا ہوں اور میری بند آنکھوں نے زندگی کے اس گھنے خوابناک جنگل پر ٹکٹکی باندھ لی ہے جہاں سورج کی ایک شعاع کا گزر بھی ممکن نہیں، لیکن تاریکی کے باطن میں گھس کر مجھے ہر شے بخوبی نظر آ رہی ہے اور میں گویا اِن اشیا کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہا۔ بلکہ انہیں انہی کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ اور اس سے میری بینائی کئی گنا بڑھ گئی ہے۔

نینا! نینا! —— نینی! ——

وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہے، یہ خود اپنی آنکھوں سے کیونکر چھپ سکتی ہے، وہ میرے سامنے کھڑی ہے، یہ!

روؤ نہیں نینی، میں مروں گا نہیں، تمہارے لئے زندہ رہوں گا، لیکن ایسی زندگی کا کیا کروں؟ دیکھو نا، میری بیماری کا بوجھ ڈھوڈھو کر تمہاری کیا صورت نکل آئی ہے۔

میں ٹھیک ہوں، آپ بھی ٹھیک ہو جائینگے۔

ٹھیک تو اب میں مر کے ہی ہوں گا، پر گھبراؤ نہیں ابھی نہیں مروں گا، لیکن میری خواہش ہے نینی کہ میری پیدائش از سرِ نو ہو اور —— اور ——

اور مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ میری مرحوم ماں آکاش سے نیچے اتر رہی ہے، وہ میرے قریب آ گئی ہے، اور قریب، اور مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا ہے اور میں اپنے بستر پر نہیں اس...

میں ہوں اور اس کے پیٹ سے باہر آکے اس کی چھاتیوں پر منہ رکھنے کو بے تاب ہوں: میں اپنی ماں کے پیٹ سے باہر آرہا ہوں! از سرِ نو پیدا ہو رہا ہوں، ننھا منا سا، سالم تندرست، دنیا کی ہر بیماری سے مبرا، میں انگوٹھا چوس رہا ہوں۔ اور میری ماں میری طرف دیکھ دیکھ کر، میرے تابناک مستقبل میں جھانک جھانک کر از خود مسکرائے جا رہی ہے۔ میرا لعل بڑا ہوگا، میں بڑا ہو رہا ہوں، اسکول جائے گا، میں اسکول جا رہا ہوں، اپنے سارے امتحان پاس کرے گا ـــ ماں، ماں، میں فسٹ ڈویژن میں پاس ہوا ہوں۔ ماں، او موری ماں! ـــ میری زبان پر لڈو کا ذائقہ گھل مل رہا ہے۔ فرطِ مسرت سے چہرہ تمتما رہا ہے، اور میں اپنی ماں سے بغلگیر ہو گیا ہوں۔ اور اس نے میرا منہ چوم لیا ہے۔

"کئی بار کہا ہے ماں، میرا منہ نہ چوما کرو۔"

ماں نے ایک بار پھر میرا منہ چوم لیا ہے۔

ماں ـــ! میں شرما کر احتجاج کر رہا ہوں اور مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں اب بچہ نہیں رہا، میرا ابھرا ابھرا جسم اور بھرا بھرا لگنے لگا ہے۔ میں جوان ہو گیا ہوں۔

کیا تم اب بھی مجھے بچہ ہی سمجھتی ہو ماں؟

کوئی جواب دینے کی بجائے وہ مجھے دودھ بھری آنکھوں سے دیکھنے لگی ہے اور میں گویا اسکی گود میں لیٹا ہاتھ پیر مار مار کر ضد کر رہا ہوں۔

میں اب بچہ نہیں ہوں ماں۔

تو کیا تمہاری شادی کردیں اب۔

شادی! لیکن نینا کا خیال نینا کو دیکھے بغیر کیسے آسکتا ہے؟

نہیں ماں، میں شادی نہیں کروں گا۔ مجھے بہت کچھ کرنا ہے!

میں اپنے مستقبل کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے جھجک جھجک کر ہاتھ بڑھا رہا ہوں، نہایت آہستگی سے، جیسے کوئی کسی کے گھر پہلی ملاقات کو آیا ہو۔ ٹھپ ـــ پ! اندر سے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ٹھپ! ـــ اندر بدستور خاموشی ہے۔ کھٹ کھٹ ـــ کھٹ۔ ٹھک! بوکھلا کر میں نے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا ہے۔

کون ہے؟

میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اپنے متعلق کیا کہوں۔

کون؟

م۔میں!

میں؟ دروازہ کھلتا ہے۔

میرے سامنے میرا خوبصورت مستقبل کھڑا ہے۔ نینا!

آیئے!

میں ــــ

آیئے نا!

میں ــــ میں ــــ

نینا ہنس رہی ہے۔ "آپ اپنے متعلق کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

میں ــــ

میرا مستقبل کھلکھلا کر ہنسنے لگا ہے۔

(نہیں، ابھی زندہ ہے۔ دیکھو سا کن جھیل پر سپنوں کا جال بن رہا ہے۔

لیکن نبض ــــ

نبض کا کیا ہے؟)

نینا بدستور ہنس رہی ہے، میری تاریک باطن میں رچی بسی روشنی کے مانند، اور میں بھی ہنسنے لگا ہوں۔ اور اتنی بڑی خوشی کو خوش آمدید کہتے ہوئے میں اس قدر خوش ہوں کہ مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔ کیا پتہ یہ خوشی میری نہ ہو؟ کیا پتہ یہ مجھ سے ناراض ہو؟ اور ــــ اور ــــ نہیں! نینا نے ہنستے ہنستے میرے گلے میں ہار پہنا دیا ہے اور میں نے اُسے گلے لگا لیا ہے اور شادیانے بجنے لگے ہیں، پنڈت ہمارے دِوِواہ منڈپ میں بہ آوازِ بلند سنسکرت کے شلوک پڑھ رہا ہے اور اپنے دھرم کے پراچین دیوتاؤں کی یہ زبان میں بالکل نہیں سمجھ رہا لیکن مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ دیولوک کی اِس مکمل زبان سے میرے جذبۂ اظہار کی تمام تر تسکین ہو رہی ہے، دیوتاؤں کا گوڑ گیان مدیرا پی کے بے سُدھ ہو کے، گا گا کے ایک نہایت دلکش صوتی آہنگ میں ڈھل رہا ہے، میں اِس کا ایک

لفظ بھی نہیں سمجھ رہا لیکن آہنگ کا کوئی لغوی معنی نہیں ہوتا، آہنگ اپنا مطلب خود آپ ہے
اس لئے اپنے آپ میں ہی اپنے آپ کو ادا کرتی ہے۔

میں بڑا خوش ہوں، اتنا خوش کہ میرا دل اچانک شدید اختلاج میں مبتلا ہو کر م
کی طرف اچھلنے لگا ہے، خون کے بے حد تیز دورے کی تاب نہ لا کر رگیں پھٹنے لگی ہیں، او
دیوتاؤں کی وانی پر کان دھرے میں اپنی دلہن کی گود میں آگرا ہوں۔ اور اس کی چیخ سن
بے ہوش ہو گیا ہوں۔

میں سو رہا ہوں اور عالمِ خواب میں بے ہوش ہو گیا ہوں۔ لیکن اس دوہری بے ہوشی کے با
میں پورے ہوش میں ہوں۔ اور اپنے بے ہوش وجود کو تک رہا ہوں۔ آس پاس کی بدحواس خامو
میں ابھی تک سنسکرت کے شلوک سنائی دے رہے ہیں، میری ماں گھبرا کر میرے اوپر جھکی ہوئی ہے،
کے ہاتھوں کی مہندی کی خوشبو میری پیشانی کے پسینے میں جذب ہو رہی ہے، یہ لمس! جیسے می
مر کر سورگ میں آپہنچا ہوں (یہ رو کون رہا ہے؟ ک ـــ؟ ـــ) وہ ڈاکٹر انکل کھڑے
اور بڑا گھمبیر منہ بنا کے پتا جی سے کہہ رہے ہیں کہ بلّی کو یہاں سے اٹھا کر اندر بستر پہ لٹا دو۔
چار آدمیوں نے نہایت احتیاط سے مجھے اٹھا لیا ہے، پتا جی بھی سہارا دینا چاہتے ہیں لیکن
کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔

کیا میں زندہ ہوں یا مر چکا ہوں؟ اگر مر چکا ہوں تو بالکل کیوں نہیں مرا؟ مجھے پتا جی ک
ہارا ہارا سا نظر آنا، کچھ ہو جانے کے خوف سے کانپنا قطعاً پسند نہیں، میرے لئے ان کی ہستی
ہمیشہ ایک ٹھوس طاقت کی پیامبر رہی ہے اور اُن کی یہی شکل مجھے محبوب ہے، چٹان، جو طو
کے تند تھپیڑوں کے باوجود اپنی جگہ پہ تن کر ڈٹی رہتی ہے، خوشی میں خوش نظر آتی ہے نہ غم میں
غمگین، اور جسکے وجود کی مٹی اس کی قوتِ ارادی سے فولاد ہو گئی ہے۔ دراصل پتا جی کی سخت گیری
اُن کے ضبط سے مجھے اپنے تحفظ کی خبر رہتی ہے، گویا اُن کا استحکام میری حفاظت کے لئے میرے
اردگرد ایک سنگلاخ دیوار کے مانند کھڑا ہو، لیکن اب اِس فصیل میں چھید ہو رہے ہیں اور بارو
کے ریزے اچھل اچھل کر میری روح میں کھب رہے ہیں۔ حملہ آور دشمنو، گولہ باری بند کر د
مجھے اپنی ہار قبول ہے، آؤ اور بلا جھجک مجھے قتل کر دو، آؤ میری دیوار ڈھے رہی ہے۔

میں بستر پر لیٹا ہوں اور پتا جی اپنی دائیں آنکھ کو بار بار رومال سے خشک کر رہے ہیں
بائیں آنکھ سے آنسوؤں کی دھار بہہ بہہ کر اُن کی سفید ڈاڑھی کو سیراب کر رہی ہے گویا دھرا
دکر اپنے جسم سے بوند بوند نچوڑ کر اپنی تہہ میں بیج کو پانی دے رہی ہو۔

اپنے ایم۔اے کا ریزلٹ سنکر میں تیز تیز چل کر پتا جی کے سامنے آ کھڑا ہوا ہوں۔

پتا جی!

میں ان کے پاؤں چھو رہا ہوں اور وہ میرے دائیں کندھے کو ذرا دبا کر ہلا رہے ہیں۔

پتا جی!

ایک خوشی مجھ میں دوسری خوشی کا بھی حوصلہ پیدا کر رہی ہے۔

مَیں نینا سے شادی کرنا چاہتا ہوں پتا جی!

مجھے معلوم ہے پتا جی نہیں چاہتے کہ ابھی میری شادی ہو، اس سے پہلے وہ مجھے مزید
کے لئے انگلینڈ بھیجنا چاہتے ہیں لیکن بیج جب پھوٹ کر دھرتی کے باہر آجانا چاہتا ہے تو
ـرتی اپنا سینہ پھاڑ کر بھی اُسے راہ دے دیتی ہے اور وہ باہر نکل کر جھومنے لگتا ہے۔

المناک فضا کی خاموشی ابھی تک سنسکرت کے شلوک دہرا دہرا کر انسانی نسل کی
نا کا پیغام دے رہی ہے اور میں بستر پر بے ہوش پڑا ہوں۔ اور پتا جی ڈاکٹر انکل سے پوچھ
یں کہ کوئی خطرے کی بات تو نہیں خطرے کی بات، میری موت کی بات، ہر خوشی کی انتہا سے غم
ندا ہوتی ہے، شادی تو محض باہر کی شے ہے، قالب ہے اور اس قالب کی روح غم ہی
ہارے غم ہی سے ہماری ساری خوشی کا وجود قائم ہے۔ میں سب جانتا ہوں ڈاکٹر انکل، آپ
کو صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہوا ہے، چوبیس برس کی عمر میں ہی
ں روگی ہو گیا ہے، یہ ڈاکٹر انکل، میری ماں کو یہ سب نہ بتانا، وہ بے چاری بھی دل کی روگی ہے
بر کی تاب نہ لا سکے گی، اور نینا، نینا کو میں خود دھیرے دھیرے اس خبر کے لئے تیار کر دوں گا، وہ
قدیر ہے، میری تاریک ہستی کا روشن مستقبل ہے، میں مٹ کر بھی یہی چاہوں گا کہ میرا مستقبل
ہے، میں اپنے اس مستقبل کو اجڑنے سے بچا لوں گا ڈاکٹر انکل، میں ٹھیک ہو جاؤں گا، ٹھیک ہوئے
رے لئے کوئی اور چارہ ہی نہیں، ـــــ میری بے ہوشی ٹوٹ جاتی ہے اور میں آنکھ کھول کر

مسکرانے لگتا ہوں۔

ڈاکٹر انکل، میں اب ٹھیک ہوں۔

لیکن میری مسکراہٹ آبدیدہ ہے۔

ہاں، تم ٹھیک ہو بلّی۔

لیکن ڈاکٹر بھی جانتا ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ میں ٹھیک نہیں ہوں' میرے دل میں درد ہو رہا ہے اور نینا میری پائینی بیٹھی سر جھکائے میرے تلوؤں پر اپنے ہاتھوں کی مہندی مل رہی ہے۔

میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر انکل!

میں اٹھ کر بیٹھ جانا چاہتا ہوں، تندرست انسانوں کی طرح بھاگنا دوڑنا چاہتا ہوں لیکن میرے دل میں درد ہو رہا ہے اور مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے اندر زندگی کی کوئی اہم کل ٹوٹ پھوٹ گئی ہو۔ ابھی ابھی چنگی بھلی چل رہی تھی، پھر یکلخت بے حد تیز ہو گئی اور تیز، اور پھر اتنی تیز کر ٹوٹ گئی۔ میرے دل میں درد پھر بڑھ رہا ہے' نینا کے ہاتھوں کی مہندی اُس کے پسینے کے ساتھ نکل نکل کر میرے تلوؤں میں دھنس رہی ہے، پتا جی میرے چہرے پر ٹکٹکی باندھے دھیانے کیا سوچ رہے ہیں۔

پتاجی!

سو جاؤ بیٹا!

میں نینا کی طرف دیکھنے لگتا ہوں۔

سو جاؤ۔

ہاں، مجھے بے خوف و خطر سو جانا چاہیے۔ کیونکہ میری تقدیر جاگ رہی ہے اور تقدیر خود آپ چوکیداری کر رہی ہو تو سب کچھ اپنے آپ ٹھیک ہو جاتا ہے' اجڑی ہوئی تدبیریں آنکھیں مل مل کر بیدار ہوتی ہیں تو حیران رہ جاتی ہیں، اُن کے ہاتھ پیر ہلائے بغیر سب کام پورے ہو جاتے ہیں۔

میں بے فکر ہو کر سو جاتا ہوں۔

"اب مر گیا ہے بے چارہ۔
"نہیں، ابھی زندہ ہے! کیا یہ چہرہ مرا ہوا لگتا ہے؟
لیکن دھڑکن ـــــ؟
یہ میرے پیروں پر سر رکھے کون بیوہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ہے؟ ـ ک ـ؟)

میں سو رہا ہوں، یعنی سوتے ہوئے خواب دیکھ رہا ہوں کہ میں سو رہا ہوں، یعنی اپنے اندر داخل ہو کر اور اندر چلا آیا ہوں۔ یہاں اندھیرا اور گہرا ہے اور اس گھور سیاہی میں ہر شے اور صاف نظر آنے لگی ہے، گویا روشنی تاریکی ہی کے ضمیر کا نام ہو۔ جوں جوں اندھیرے کے اندر ہی اندر قدم دھرتے جاؤ گے روشنی کے قریب تر ہوتے جاؤ گے۔ کیا ہم مرکز تاریکی کا روشن ضمیر چھو لیتے ہیں۔ اور اسے چھو کر وہی بن جاتے ہیں؟ یہی مقام ہمارے سفر کی انتہا ہے؟ کیا موت ہی زندگی کا ضمیر ہے جسے پا کر ہم اپنے جسم کی ضرورت سے آزاد ہو جاتے ہیں؟ چھوئے بغیر چھو سکتے ہیں، بولے بغیر بول سکتے ہیں، دیکھے بغیر دیکھ سکتے ہیں؟

میں اٹوٹ نیند میں ڈوبا ہوا ہوں۔ بیک وقت زندگی کی ان تہوں میں بھی موجود ہوں اور زندگی کی سطح پر بھی، کیونکہ میں آپ اپنی زندگی ہوں، اور اس لئے میں جہاں بھی ہوں، اپنے جسم کے ساتھ یا اس کے بغیر، میری زندگی میرے ساتھ ساتھ ہے، ایک دفعہ 'ہو جانا' اس امر کی علامت ہے کہ آدمی اب ہمیشہ کے لئے 'ہو گیا ہے'، شاید اسی لئے ہمارے پیغمبروں نے ہماری روح کو غیر فانی قرار دیا ہے۔

میں اپنی روح کی ابدیت کے خیال کے پیچھے پیچھے کیوں ہو لیا ہوں؟ اس لئے تو نہیں کہ کہیں اپنی راہ مجھے موت تک نہ لے آئے؟ شاید مجھے مرنے سے ڈر محسوس ہوتا ہے، ہمارے سبھی ہیرو موت کی قربت محسوس کرتے ہیں تو خوف زدہ ہو ہو کر ابدیت کے فلسفہ میں پناہ لیتے ہیں تاکہ آسانی سے مر سکیں۔ ان کی موت پر جب ہم انہیں مسکراتے ہوئے دیکھتے ہیں تو انکی خنداں پیشانی کا نقش ہمارے ذہن پر ثبت ہو جاتا ہے اور پھر اپنی موت پر بھی ہم مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں مسکراتے ہوئے نظر بھی آنے لگتے ہیں لیکن اپنے خوف کو دباتے ہوئے ہمیں اور زیادہ خوف کا احساس ہونے لگتا ہے۔

میں سوچ رہا ہوں اور سوچتے سوچتے دیکھنے لگا ہوں کہ میرا ایک دوست راجو اور میں، ہم اسکول کے دو لڑکے میونسپل گارڈن میں ایک جھاڑی کے قریب کھڑے ہیں اور چند قدم کے فاصلے پر ایک کالا ناگ پھن پھیلائے ہماری جانب گھور رہا ہے اور میں خوف سے تھر تھر کانپ رہا ہوں مگر راجو خوف سے سکرا رہا ہے اور مسکراتا مسکراتا سانپ کے کاٹنے سے پہلے ہی ڈھیر ہو جاتا ہے۔

مجھے شروع سے ہی ہر خوفناک شئے سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ مجھے بزدل لوگ پسند نہیں۔ لیکن میں خود بڑا بزدل ہوں مجھے اپنے آپ سے بڑی محبت ہے، یا اُن سے، جو میرے ہی ہوں، اور مجھے یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ مجھے یا اِن میں سے کسی کو کچھ ہو جائے گا اور اگر کچھ ہو گیا تو ـــ تو ـــ میرے چہرے پر لاغر سی مسکراہٹ چلی آتی ہے۔ ابھی کیا ہونا باقی ہے؟ ـــ تم کئی ماہ سے بستر پہ پڑے ہو، تمہاری ماں کی حالت الگ نازک ہے۔ شاید آج یا کل وہ چلتی بنے۔ اگر ماں چلی گئی تو پتا جی کا کیا ہوگا؟ ـــ اب پتا جی کی عینک نہیں مل رہی۔ یہ لیجئے۔ اب ان کی چھڑی کھو گئی ہے۔ یہ پڑی ہے، لیجئے۔ اب وہ پریشان ہو رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی کتاب پڑھتے پڑھتے کہاں رکھ دی تھی۔ یہ تو رکھی ہے ـــ بڑی کی ماں، جب تک تم ہو میں کبھی کچھ نہ کھوؤں گا، میرا سب کچھ قائم رہے گا، میرا سارا بھروسہ تمہارے ہی دم سے ہے بڑی کی ماں، تمہارے بغیر میرا اپنا آپ بھی کھو جائے تو مجھے خبر نہ ہو۔

یہ سب لوگ مجھ سے چھپا رہے ہیں مگر مجھے علم ہے کہ ماں مر رہی ہے اور آج گجر دم ہی وہ بستر چھوڑ کر چل نکلے گی۔ جب بھی اُسے کہیں اکیلے سفر پہ جانا ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ صبح سویرے ہی گھر سے نکل جاتی ہے، تاکہ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے وہ اپنی منزل پر جا پہنچے، اور یہ سفر تو بڑا لمبا ہے، سورج کی شعاعوں کے مانند طویل۔ مجھے یقین ہے کہ ماں مر رہی ہے اور یہاں سے جو تھے کمرے میں سب لوگ جمع ہیں اور بجھتی ہوئی شمع پہ آنکھیں گاڑے ہوئے ہیں مگر ماں کی بجھتی ہوئی آنکھیں پتا جی کے قمیض کے بٹنوں پر جمی ہوئی ہیں۔ اِدھر آیئے، یہ بٹن ٹوٹا ہوا ہے، ذرا ٹانک دوں ـــ چٹان سے چشمہ ابلنے لگا ہے ـــ ار۔ رے! یہ اندھیرا کیوں ہو گیا ہے؟ روشنی ـــ روشنی! یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ میرا بایاں پہلو ـــ یہ بایاں ہاتھ، یہ ٹانگ، یہ کندھا! یہ میرا نہیں۔ میں مفلوج ہو رہا ہوں! نہیں! ماں ـــ! آؤ، میں مر رہا ہوں، دیکھو میری قمیص کے سارے بٹن ٹوٹ گئے

ہیں، میرا جسم میرے کپڑوں سے باہر آرہا ہے۔ میں — میں — یہ — میرا بایاں پہلو کہاں ہے؟ یہ پہلو میرا نہیں، یہ مرگیا ہے، میں اپنا نصف رہ گیا ہوں، میں آدھا مرگیا ہوں اور آدھا زندہ ہوں، میرا آدھا مردہ جلادو تاکہ اپنے بقیہ نصف جسم سے میں تندرست لوگوں کی طرح چل پھر سکوں، یا میری مرحوم ماں کو بلاؤ، سدا کے لئے اِس قبر میں پڑا رہنے کی بجائے میں پھر سے اس کے پیٹ میں الٹا لٹکنا چاہتا ہوں۔ ماں، مجھے ایک بار پھر جنم دو، مجھے اپنا سالم وجود چاہئے۔ اگنی کے سامنے دیوتاؤں کے من پسند سنسکرت کے شلوکوں میں مجھ سے قسم لی جاچکی ہے کہ میں اپنا پورا وجود نینی کے ارپن کروں گا، میں اپنا یہ وعدہ پورا کرنا چاہتا ہوں، گھبراؤ نہیں نینی، میں اپنا یہ محبوب وعدہ پورا کرونگا — مجھے ایک اور وجود دو ماں، مجھے پھر سے بناؤ ماں، ماں — ما — اں — م — ! —

میں اپنی نیند میں جاگ رہا ہوں اور وقت سویا ہوا ہے اور میں بھی سو جانا چاہتا ہوں مگر مجھے نیند نہیں آرہی۔

نینا ! بی — !

آپ سو جائیے۔

ہاں، اب مجھے سو جانا چاہئے۔ بہت جاگ لیا، اب مجھے ہمیشہ کے لئے سو جانا چاہئے۔ میں اپنی زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ موت سے مجھے ڈر لگتا ہے لیکن تم ٹھیک کہتی ہو نینی، اب مجھے سو جانا چاہئے۔ تم سب کو میرے سو جانے کا دکھ ہوگا، ہوگا نا نینی؟ — لیکن میری آنکھوں سے نیند اڑ گئی ہے۔ یہ ناگن سی لمبی رات کیونکر کٹے گی؟ ڈاکٹر انکل کو بلا کر مجھے مارفیا کا ایک انجکشن لگوادو نینی، جب تک موت ڈنک نہیں مارتی" مجھے ایک چھوٹی سی موت دیدو پلیز، پلیز، پلیز نینی ! —

میرے خون میں مارفیا جارہا ہے، میرے خون کے بے چین کیڑے بے ہوش ہو رہے ہیں، میری آنکھیں مندگئی ہیں، میں شاید واقعی سو رہا ہوں، جانے کب سے۔ میرے سامنے نینی بیٹھی ہے، اس قدر اداس نظر آرہی ہے جیسے وہ صرف روح ہی روح ہو، تصویروں کے چہرے بھی ہشاش بشاش ہوں تو وہ سچ مچ کے لگتے ہیں لیکن سچ مچ کے چہرے اس طرح مایوس اور

محروم ہو تو لگتا ہے کہ ہوا میں یونہی ان چہروں کی تصویر سی بن گئی ہے ـــــ میرے قریب آؤ نینی، تاکہ تمہیں چھو کے دیکھوں کہ تم ہو یا نہیں ہو ـ سنسکرت کے شلوک اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اب تم کنواری نہیں ہو ـ لیکن نینی، تم جانتی ہو کہ اب تک تم کنواری ہو، اور ـــ اور اس وقت تک کنواری رہو گی جب تک تمہارا شوہر زندہ ہے ـــــ کئی بار مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم کہیں مجھے چھوڑ کر چلی نہ جاؤ، پر نینی، تم واقعی چلی جاؤ تو ٹھیک ہے، تم جوان ہو اور تندرست ہو اور تمہیں ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچ کر وہاں سے ساری دنیا کا نظارہ کرنا ہے، مجھے اپنا وعدہ یاد ہے کہ تمہیں دنیا کی سب سے اونچی چوٹی پر لے جاؤں گا ـ لیکن میری ہمت اب جواب دے چکی ہے نینی، میرے دل و دماغ یخ بستہ ہو چکے ہیں، میں مر رہا ہوں، مجھے یہیں پہاڑ کے اس برفانی دامن میں تنہا چھوڑ کر تم چپکے سے آگے بڑھ جاؤ، جاؤ نینی، ورنہ میرے ساتھ تم بھی اجل کا شکار ہو جاؤ گی، میری برف زدہ یاسیت سے تم بھی برف ہو جاؤ گی، جاؤ، وہ دیکھو ماؤنٹ ایورسٹ اپنا سر اٹھا اٹھا کر تمہاری راہ تک رہی ہے، جاؤ پلیز، جاؤ نا! ـــــ کیا ـــ کیا تم واقعی جا رہی ہو نینا؟ ـــــ میرے دل کی دھڑکن سردی کے بوجھل احساس سے نہایت مدھم، اور مدھم، اور مدھم ہوتی جا رہی ہے ـ نہ جاؤ نینی، اب میں گھڑی بھر کا مہمان ہوں، ذرا اور ٹھہر جاؤ ـ میرا دایاں پہلو بھی سن ہو رہا ہے، سارا بدن برف کا تودہ بنتا جا رہا ہے ـ بس اب گھڑی دو گھڑی کی بات ہے ـ مجھے اپنی موت صاف نظر آ رہی ہے ـ یہ ـــ ا میرے اوپر جھکی ہوئی، یہاں! اُفوہ! اس کا لمس کتنا ٹھنڈا ہے! ـــــ میرا دم اکھڑ جائے نینی تو مجھے یہیں برفوں میں چھوڑ کر آگے ہو لینا، تاکہ میں سدا کے لئے مرا رہوں، ایسا نہ ہو کہ تم میری لکڑیوں کی چتا بنا کے آگ کے سپرد کر دو تو حرارت محسوس کر کر کے میں از سرِ نو جی اٹھوں ـ مجھے زندگی سے ڈر لگتا ہے نینی، جینے سے بے حد ڈر لگتا ہے!

بچاؤ نینا! میں سچ مچ مر رہا ہوں، بچاؤ! ـــ کوئی بھی میری آواز نہیں سن رہا ـ میرے اس پاس یہ اتنے سائے کیوں جمع ہیں؟ یہ سب لوگ کہاں ہیں جن کے یہ سائے ہیں؟ نینی کہاں ہے؟ نینی کہاں ہے؟ کیا مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے؟

نینی ـــ نینا ـــ نینی ـــ نی ـ! ـ!

کئی بار کہا ہے اتنی آوازیں نہ دیا کرو۔
نینی کا لہجہ بدلا ہوا کیوں ہے؟
تم گئیں نہیں؟
نہیں، لیکن چلی جاؤں گی۔

؟!

اب میں تنگ آ گئی ہوں، بے حد تنگ آ گئی ہوں۔ اب نہیں ٹھہروں گی!
میرے خون کی ایک بہت بڑی لہر دائیں سے بائیں جانب اچھلی ہے۔
یہ تم کہہ رہی ہو؟ تم؟ ت ـــــ؟
میں نے گویا دھکا کھا کر تاریکی کے مرکزی نقطے کو چھو لیا ہے، موت کے عین پیٹ میں آ گھسا ہوں، جہاں طور کا عالم ہے، اتنی روشنی کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا، کچھ سنائی نہیں دیتا، کچھ محسوس نہیں ہوتا۔

(اب؟
ہاں، اب چل بسا ہے، دیکھو چہرہ سپنوں سے بالکل خالی ہو گیا ہے۔)
لیکن دفعتاً میں نے موت کے پیٹ سے جنم لے کر از سرِ نو آنکھ کھول لی ہے اور اپنے بالکل صحت مند، سالم وجود کو اٹھا کر بڑی آسانی سے بیٹھ گیا ہوں۔ اور اپنی لاش کے ارد گرد بیٹھے ہوئے، بکے لوگوں سے بڑی بے تابی سے پوچھا ہے۔ نینی کہاں ہے؟!

یونس رمزی

اکنّی اور سائنائیڈ

وقت کی آرسی آج دھندلا گئی ہے۔
تو س و قزح عنکبوت کے تار و پود بکھر گئے ہیں۔
یہ کس نے میرے شیشۂ دل پر پتھر دے مارا۔
بکھرے ریزوں کو تو چُن لوں ـــــ
نہیں؟ ـــــ
تو پھر میں اپنی بند آنکھوں میں تمہاری اس خوبصورت دنیا کو ہمیشہ کے لئے سمیٹ لیتا ہوں۔ یہ خوبصورت سی دنیا جس میں انسان مرنا نہیں چاہتا۔
"امی سُندر بھوبے آمی مریتے چائی نا"
ٹیگور ـــــ

"ہلو سیما ڈیئر کچھ سُنا تم نے پاس ہی نہیں جیت لیا ہے، صفدر ہار گیا۔ اب شادی تم مجھ سے کروگی۔"

"ڈیم اِٹ ـــ" سیما نے ٹیلی فون رکھ دیا۔ اور ہیتھن مانڈتھ فوارے کے پاس کرسی ڈال، کر مادام سائنسی کے لئے چائے بنانے لگی جو ان دنوں اس کی مہمان تھیں۔

سائنائیڈ ـــــ
سائنائیڈ ـــــ ڈاکٹر صفدر نے خودکشی کرلی۔ پوسٹ مارٹم روم میں ڈاکٹر عبدالجبار نے

تصدیق کرتے ہوئے کہا۔
اور اس کی مٹھی میں کیا ہے ___؟ اناٹومی کے پروفیسر نے جھکتے ہوئے پوچھا۔
" ایک اگنی ! ___" نرس انجلانے آپریشن ولیسٹ کی طرح اسے گدڑی بال میں ڈالتے ہوئے کہا۔
" ہاؤنی ___ اگنی اور سائنائیڈ ۔ ۔ ___
" اے سیڈ ڈیتھ ___ اناٹومی کے پروفیسر نے جیسے اعلان کیا۔
" اے ویری سیڈ ڈیتھ ___ مس انجلانے کراس بناتے ہوئے کہا خدا مغفرت کرے ۔ آپریشن
ٹیبل پر کھڑے ہوئے لوگوں کی آنکھیں بھیگ گئیں ۔

سورج ڈوب رہا ہے ۔ آسمان پر نارنجی بادلوں کی بادبان ہے اور پوتر گنگا پر کشتیاں
دھیرے دھیرے چل رہی ہیں ۔ گاؤں کی بیاہی جانے والی گوریوں کی طرح ۔ من میکے اور تن سسرال
میں، لہروں کی بھی یہی کیفیت ہے ۔ ریور دے پر لڑکے لڑکیوں کا ہجوم ہے ۔ اس ہجوم کا حصہ اُن
کے قہقہے ہیں جو سلگتے بم کی طرح پھٹ پڑتے ہیں ۔ یا صرف پھول لٹا جاتے ہیں، ان قہقہوں میں
ایک پل گرمی ہے اور دوسرے پل نرمی ۔ ریور دے کے اختتام پر کینٹین ہے ۔ کینٹین سے ملحق وسیع
ٹریس ہے جس کی بالکونی دریا کے سینہ پر محیط ہے اور جس کے نیچے پوتر گنگا کا پانی ہے ٹریس پر
راجا پھولوں کے تختے ہیں ؛ اور جوہی کی بیل بالکونی کی گرلز سے لپٹی ہوئی مہک رہی ہے ۔ شام کی
ہوا اس خوشبو میں اور بھی مہک پیدا کر دیتی ہے ۔ کینٹین میں شور ہے ۔ اودھم مچ رہا ہے اس
لئے کہ کینٹین میں لڑکیاں ہیں ۔ خوبصورت آنکھوں، مرگ نینی اور سیاہ بالوں والی لڑکیاں ۔ ان کے
موتی سے دانت ہیں اور ان دانتوں میں گنگا پر طلوع ہونے والے سورج کی سی چمک ہے اور یہ
چمک شام کے اندھیارے میں بھی جگنو چمکا سکتی ہے اور یہ چمک ہنسی کی جھنکار میں مل کر سات سروں
کو جگاتی ہوئی لوک اور پرلوک میں رشتہ پیدا کر دیتی ہے اور شاید ایسے ہی وقت خدائے عزوجل
بھی مسکرا دیتا ہوگا ۔ ! اپنی اتنی خوبصورت سی کائنات کی تخلیق پر جس میں موت کے تصور کے بعد
بھی انسان زندہ ہے ۔ ہنستا اور مسکراتا ہے، چاچا بوم بوم سمبا اور کینن کینن ناچتا ہے کیبریز میں
عورتوں کو ننگا نچاتا ہے ۔ اور دن میں گرجا مندر اور مسجد بھی آباد کرتا ہے ۔ شام کے چار بجے ہیں ۔

روزانہ چار بجے شام ہو جاتی ہے۔ جب گھڑی نہیں تھی تب بھی شام ہوتی تھی اور اب بھی شام ہوتی ہے اور ٹھیک شام کے چار بجے ریور وے کینٹین کے ٹریس پر سیما کے سینڈل کی کھٹا کھٹ گونجتی تھی اور بہت سی آنکھیں اس دستک دل پر اٹھ جاتی تھیں، دم بخود۔ کینٹین میں شور رک جاتا تھا اکثر لڑکے باادب کھڑے ہو جاتے جیسے اسے گارڈ آف آنر دے رہے ہوں۔

سیما نے آج جوگیا ساڑی پہن رکھی ہے۔ گلے میں جلیبی لڑکیوں کی سی مالا لٹک رہی ہے اپنے بالوں کے جوڑے کو کس کر دیو داسیوں کی طرح باندھ رکھا ہے۔ آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیر ہے۔ چہرے پر پھولوں کی سی تازگی۔ اور پھر وہ ٹریس پر صفدر کے قریب بیٹھ جاتی "سنو صفدر، میں آگئی ہوں۔"

"ہاں، دبے پاؤں، ہوا کے خوشگوار جھونکے کی طرح ــــ"

"مگر یہ بتاؤ میں کیسی لگ رہی ہوں ــــ؟"

"نیچے دریا کی آرسی میں منہ نہار لو ــــ مگر نہیں لہروں کے درپن میں تمہارے روپ کی مہانتا کہیں بٹ نہ جائے، اس لئے کہ تم ایک ہو ــــ تمہارا وجود صرف ایک ہے۔ اس کی اپنی ایک وحدت ہے ــــ"

"ہاں جیسے اس کینٹین کی چائے ــــ تم اس قدر پوئیٹک کیوں ہو رہے ہو؟ ــــ"

"سنو ٹریس کے نیچے دریا کا شور سنو ــــ سرسر شپ ــــ سرسر شپ، چپ چپ کتنی خوشگوار لہریں ہیں۔ ہم اگر چپ بھی ہو جائیں تو یہ لہریں محبت کی زبان بنی رہتی ہیں۔"

"لیکن مجھے تو آج ڈائسکشن روم کی وہ خوبصورت عورت یاد آرہی ہے ــــ"

"ہاں شاید موت نے اسے اور خوبصورت بنا دیا تھا۔ آج تمہارا اختیار نظر نہیں آرہا ہے ــــ؟"

"اسے تو اب تک آجانا چاہئے تھا۔"

"تم کوئی فیصلہ کیوں نہیں کر لیتیں۔ دریا کے دو کنارے ہیں ــــ"

"اور دونوں ہی خوبصورت ہیں ــــ" سیما نے کہا

"یہ بکواس ہے سیما ــــ"

"ہاہاہا . . . . . سنو بقول تمہارے ہم چپ بھی ہو جائیں تو ٹرلیس کے نچلے دریا کی لہریں ہماری محبت کی زبان ہیں۔"

"تمہارا تمام ایکسپریشن محض ایک خوبصورت جھوٹ ہے۔ بختیار سے آخر تم پیچھا کیوں نہیں چھڑا لیتیں۔"

"میرا جی نہیں چاہتا ۔۔۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔

"آخر کیوں ۔۔۔؟"

"وہ اس لئے کہ رقیب روسیاہ کے بغیر کوئی کہانی مکمل نہیں ہوتی ۔۔۔ رات سے دن کا فرق اور صبح سے شام کا تضاد معلوم ہوتا ہے۔ بختیار کے وجود ہی نے تمہارے دل میں میرے لئے اتنی محبت پیدا کر دی ہے اگر وہ نہ ہوتا تو شاید تم اکتا جاتے۔ محبت بڑا اسپکنڈ سبجکٹ ہے مگر تم چپ کیوں ہو گئے ۔۔۔؟"

"بس یونہی ۔۔۔"

"یوں کہو تم بڑے جلیس ہو۔ بختیار اپنی حماقتوں سمیت کتنا خوبصورت نظر آتا ہے تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ زندگی میں رنگا رنگی کے لئے بختیار جیسے انسان کا وجود کتنا لازمی ہے حالانکہ تم آئینہ کا مجلا رُخ ہو اور وہ پردہ زنگاری۔ آگے سب کچھ ہے پیچھے کچھ نہیں۔"

لیکن دوسرے دن ڈاکٹر صفدر نے خودکشی کر لی۔ کیٹین کے قہقہے اپنی جگہ پر تھے کینٹین کا ٹرلیس ویسے ہی گنگا پر محیط تھا اور ٹرلیس کے نیچے وہی گاتی گنگناتی لہریں تھیں۔ دوسرے دن شام کے چار بجے صفدر وہاں نہیں تھا سیما حسب معمول آئی تھی، اور چلی گئی ۔۔۔

ڈاکٹر صفدر کی خودکشی کے بعد وہ عرصہ تک وشں کنیا بنی رہی ۔۔۔ سفید ساڑی، سفید بلاوز کھلے ہوئے غیر آراستہ بال ۔۔۔ اجڑا چہرہ ۔۔۔ وہ اب بھی ٹرلیس پر آتی تھی۔ بختیار سایہ کی طرح اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ تمام لڑکوں کی نگاہ میں وشں کنیا بن گئی تھی۔ مگر بختیار کو اب بھی اجڑی دھرتی سے پھولوں کی خوشبو آتی تھی۔ اور جب ٹرلیس کے نیچے لہروں کی آواز سنتی ہوتی ۔۔۔ وہ اپنی شخصیت اور وقار کا تاج روزانہ اس کے قدموں میں رکھ کر سرگوشی کے لہجہ میں کہتا ۔۔۔ "مجھ سے شادی کر لو سیما ۔۔۔ پھر تم صفدر کو بھول جاؤ گی۔"

"اور یہ لہریں ۔۔۔؟" وہ بڑے کھوئے کھوئے انداز میں کہتی۔
"یہ لہریں گونگی اور بہری ہیں ۔۔۔ یہ کچھ بھی نہیں کہتیں۔"
"نہیں ان کی بھی ایک زبان ہے ۔ غور سے سنو ۔"
"بے وقوف نہ بنو سیما ۔۔ تم نے ڈاکٹر جیسے پیشے کو بھی ٹھکرا دیا ہے اور اب .....
"اور اب تم سے شادی کروں جب کہ میرے سامنے شادی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے
IT IS JUST AN IMAGINARY HUMAN BONDAGE"
اسنے زور کا ایک قہقہہ لگایا جو دریا کی لہروں کے ساتھ ٹوٹ گیا۔
"کیسی باتیں کرتی ہو تم ۔"
"میں سچ کہتی ہوں ۔۔ اچھا تم مجھ سے شادی کر لو ۔۔ وہ پلٹ کر بولی۔
کچھ دنوں بعد وشِ کنیا سے بختیار کی شادی ہو گئی۔ لوگوں کو بڑی حیرت تھی۔ ایک بار پھر وہ رنگوں میں نہا گئی۔ عورت اور خوبصورتی کا تصور تو رنگوں سے وابستہ ہے۔ رنگ گاتے ہیں ۔ گنگناتے ہیں ۔۔ ان کی اپنی ایک موسیقی ہے ۔۔ ان کی اپنی ایک آواز ہے جو عورت سے مل کر پیدا ہوتی ہے۔ اور ان رنگوں میں نہا کر وہ مسز بختیار بن گئی۔
شادی کے چوتھے دن کا ذکر ہے :۔

رات بھیگ رہی ہے۔ چاند ابھر رہا ہے۔ جیسے دھیرے دھیرے کوئی رسونتی نار دریا میں غوطہ کے بعد سر ابھار رہی ہو۔ چاند ایسے ہی نکلتا ہے۔ اور پھر دل کے دروازوں میں جھانک کر مسکرا دیتا ہے۔ سیما نے دریچے کھول دیئے۔ ہوا کے خوشگوار جھونکوں میں رات کی رانی کی لپٹ پردوں میں ہانپنے لگی ۔۔ سامنے رکھے ہوئے وائلن پر چاند کی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ وہ اپنے شب خوابی کے لباس میں سینہ کے بل لیٹی ہوئی دریچہ سے باہر دیکھنے لگی۔ سامنے گرے ہاؤنڈ کھڑا تھا ۔۔ اور اس کے پرے سرونٹ کواٹر کی چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وائلن کے قریب ہی منٹل پیس پر صفدر کی تصویر مسکرا رہی تھی ۔۔ مسکراہٹ بھی محبت کی زبان ہوتی ہے ۔۔ محبت کی زبان' ۔۔ بزنس ڈیل کی زبان' ۔۔ خوشامد کی زبان' ۔۔ ایسی تمام مسکراہٹیں دوکان میں فروخت کئے جانے والے پھولوں کی طرح ہیں ۔۔ مگر صفدر کی مسکراہٹ کیسی تھی۔

بھیانک، اور مسرت آگیں ـــــ

" میں آسکتا ہوں ـــــ" بختیار نے اسے چونکا دیا۔

" کیوں نہیں ـــــ" اسنے دھیرے سے کہا اور اٹھ بیٹھی۔

" اس بڈروم میں تم کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی ہو۔"

" ہاں تمہاری میز پر رکھے ہوئے گلدان کی طرح۔"

" بالکل ـــــ" اسنے اسے اپنی آغوش میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

" تمہارے ہونٹ کتنے خوبصورت ہیں ـــــ" بختیار نے اس کے ہونٹوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا ـــــ اور یہ بالوں کے آبشار ....."

" بکواس نہ کرو ـــــ آؤ سو جائیں"

" اتنی جلدی ـــــ کیوں نہ محبت کی باتیں کریں"

" افلاطونی محبت! ـــــ میں اس کی قائل نہیں۔"

" کیا ہو گیا ہے تمہیں! ـــــ

" مجھے تو کچھ نہیں ہوا ـــــ رات گہری ہو چکی ہے دیکھتے نہیں، میں تمہاری بیوی ہوں اور بیوی کا کام ہے مکینکل انداز میں شوہر کے سینہ سے چمٹ کر سو جانا۔ اور وہ بھی اس کے ایما پر ہے ورنہ ....."

" میں دیکھتا ہوں زندگی کا جمالیاتی تصور جس پر کبھی تم جان دیتی تھیں ختم ہوتا جا رہا ہے۔"

" ہو سکتا ہے۔ میں اس مسئلہ پر تم سے الجھنا نہیں چاہتی ـــــ"

" تو پھر تم سو جاؤ۔ میں تھوڑی دیر جاگنا چاہتا ہوں۔"

" تو پھر شب بخیر ـــــ تم چاہو تو وائلن بجا سکتے ہو۔ چاندنی رات میں کوئی وائلن بجائے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ بس ایسا لگتا ہے کہ سروں سے مدھر چاندنی رس رس کر ٹپک رہی ہو۔ اور ہم تم خالی پیمانے ہیں جن میں چاند رس بہت دھیرے دھیرے قطرے قطرے ٹپک رہا ہے" اسنے بستر پہ لیٹے لیٹے کہا اور کروٹ بدل لی ـــــ

پھر تھوڑے ہی دنوں بعد وہ ہوا بن کر پھولوں سے ٹکرائی اور خوشبو بن کر دنیا پر چھا گئی۔
کلب میں بال ناچتے ہوئے اسنے راناسے سرگوشی کے لہجہ میں پوچھا۔
"بتاؤ میں کتنی خوبصورت ہوں ــــ"
"خوبصورتی کے حدامکان تصور سے زیادہ ــــ" رانا نے کہا۔
"میرے بازوؤں کا گداز نم محسوس کر رہے ہو؟ ــــ اور میرے یہ ہونٹ ــ یہ بالوں کے آبشار ــــ"
"ہاں ــــ" اسنے ٹھنڈی سانس لی۔" ان کے تصور ہی سے ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔"
"اور میری جلتی ہوئی سانسیں؟"
"ہاں اس سے کئی بجھے چراغ جل سکتے ہیں ــــ"
"تو پھر آؤ ہم لابی کی طرف چلیں۔ حالانکہ میں اس پردہ داری کی بھی قائل نہیں۔"
اور لابی کے اندھیرے میں رانا نے محسوس کیا خوشبودار پھولوں سے لدی ہوئی شاخ بہت نیچے جھک آئی ہے اور اسکے ہاتھوں کے لمس سے پھولوں کی پنکھڑیوں میں تھرتھری آگئی ہے۔
پھر سیما نے بڑی سرگوشی کے لہجہ میں کہا۔
"مجھے نیند سی آئی جارہی ہے ــــ مجھے سنبھالو۔
"مگر بختیار ــــ؟"
"اوہ ــ ڈیم اِٹ ــــ"
مگر بختیار اسے تلاش کرتا ہوا لابی کی طرف نکل آیا تھا۔
"سیما تم یہاں ــــ؟"
"ہاں یہاں پر اندھیرا بڑا مقدس ہے۔"
"مقدس ہے؟ ــــ"
"سوری مسٹر بختیار" ــــ رانا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دوبارہ ہال میں داخل ہو گیا۔
"میں پھر ملوں گی رانا ــــ"
"اس گوریلا سے ــــ؟"

"ہاں ــــ"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں ــــ؟"

"مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا ڈارلنگ۔ میں راتا سے کہہ رہی تھی، مجھے نیند آ رہی ہے مجھے سنبھالو۔"

"شرم کرو سیما۔ یہ کیا بکواس ہے۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں ــــ میں اس سے یہی کہہ رہی تھی۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں ــــ؟"

"مجھے کچھ نہیں ہوا ــــ آؤ ریور وے کینین چلیں۔ محبت کی زبان سنیں۔"

"محبت کی زبان؟ ــــ"

"ہاں محبت کی ــــ"

"اچھا چلو ــــ شاید تمہیں تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔"

"نہیں ہر جگہ تازہ ہوا ہے۔ اور ریور وے میں تمہارے ساتھ کیوں جاؤں ــــ بڑا ہی مہمل خیال ہے۔"

"کیسی بہکی باتیں کر رہی ہو تم ــــ؟ چلو پھر گھر چلیں۔"

"مگر گھر کہاں ہے۔"

"بکواس بند کرو۔"

"سچ کہتی ہوں بختیاری گھر کوئی نہیں ہے۔ تمہارے مکان کی اونچی فصیلیں اور دیواریں سب نظروں کا دھوکا ہے۔ مجھے تو وہاں کوئی دیوار نظر نہیں آتی ــــ"

"معلوم ہوتا ہے تم نے پی لی ہے ــــ"

"نہیں نہیں مجھے ریور وے پر چھوڑ دو۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"شاید تمہیں میری ضرورت ہے؟"

"بکواس نہ کرو۔"

"سچی بات سنا ہے بڑی بُری لگتی ہے۔ حالانکہ کوئی بات نہ سچی ہے نہ جھوٹ۔ جیسے ک
میں تمہاری بیوی ہوں یہ تمہارے لئے سچ ہے۔ میں تمہاری بیوی نہیں ہوں یہ میرے لئے جھ
ہے اس طرح کچھ تمہارے لئے سچ ہے۔ کچھ میرے لئے جھوٹ ہے جو میرے لئے سچ ہے تمہارے
لئے جھوٹ ہے۔ جھوٹ، سچ — جھوٹ — سچ۔ ہاہاہا" اسنے زور کا قہقہہ لگایا۔ بختیا
تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ رانا نے اسے یقیناً پلا دی ہے۔

مگر دوسری شب جب اسنے اسے کیبرے میں بال کے لئے کھینچا تو وہ ہاتھ چھڑانے لگی۔
"میں رانا کے ساتھ رقص کروں گی۔ فی الحال تم اس ایرانی بلی کے ساتھ ناچو۔ دیکھتے نہیں
وہ کتنی خوبصورت ہے۔ اس کے مصنوعی ابرووں کی کمان۔ کمر کا خم۔ حیرت کا اتنا عمدہ میک اپ
تمہیں کچھ بھی پسند نہیں۔ تم میں ذرا بھی جمالیاتی حس نہیں۔ رقص کے لئے نیا مرد اور نئی لڑکی
ہی مناسب ہوتی ہے۔ میرا جسم تمہارے لئے بہت مانوس ہے۔ تمہارے ہونٹوں میں دبے ہوئے
پائپ کی طرح —" بختیار اسے دیکھتا رہ گیا اور اسنے بڑھ کر رانا کا ہاتھ پکڑ لیا —آؤ —
رات بھیگ چکی ہے۔ رقص کی قوسوں اور دائروں سے ہم ایک نئی صبح کی تشکیل کریں۔ انہیں
دائروں میں ہمارے تمہارے جسم ڈھل جاتے ہیں — جسم کے پیچ و خم اور جذبات و احساسات
ڈھل جاتے ہیں — اور — ہم ہر رات اسی ہال میں ان قوسوں اور دائروں کو جگا جگا کر سلا
دیتے ہیں۔ سلا سلا کر جگا دیتے ہیں۔"

"چپ چاپ رقص کرو سیما — ہمارے گرد جو سیال سی خاموشی ہے اس میں سانسوں
کی کشتیاں چل رہی ہیں۔ اور بھی بہت کچھ ہے۔ آواز کو ہمارے درمیان مخل نہ ہونا چاہئے۔ آواز
تو ایک برج ہے جس سے گزر کر ہم قربت حاصل کرتے ہیں اور جب قربت حاصل کر لیتے ہیں تو خاموشی
جو ابد ہے بڑی لذت انگیز بن جاتی ہے۔ دنیا کی خلا آواز سے یوں بھی بوجھل ہے۔"
"ون۔ ٹو۔ تھری —" سیما نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔
"تمہارے پیروں کی حرکت کتنی میکانکی ہے۔"
"مگر میرے پیر میکانیکل نہیں ہیں —"

"ہاہاہا..... اس کی بھی ایک ہی رہی۔"

وہ دیر تک ہاتھ میں ہاتھ دیئے ناچتی رہی۔ اور اسنے دیکھا بختیار کے ساتھ ناچنے والی ایرانی بلی بڑی جذباتی ہوئی جارہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے لابی کی طرف جارہے تھے اور وہ رانا کا ہاتھ گھسیٹتی ہوئی باہر آگئی اور کار میں بیٹھنے کے بعد اسنے اسٹرینگ وہیل پر رانا کے رکھے ہوئے ہاتھوں کے درمیان اپنا چہرہ ڈال دیا۔

"تم کتنے سوئٹ ہو رانا۔"

"سوئٹ تو تم ہو ڈارلنگ۔"

گھر پہونچنے کے بعد وہ دیر تک بختیار کی شمپین پیتا رہا ـــــ اور وہ اس کی باہوں میں لپٹی شراب کے نشہ اور اثرات کی طرح رگ وپے میں اترتی رہی ـــــ یہاں تک کہ رات کے بارہ بج گئے۔ رانا نے کئی بار رخصت چاہی لیکن اسنے اسے روکے رکھا اور ایک بجے وہ رانا کے ہاتھوں کو الوداعی بوسہ دے رہی تھی کہ بختیار کمرے میں در آیا۔

"تم یہاں ہو؟ ـــــ"

"ہاں میں رانا کے ساتھ آگئی تھی۔"

"رانا کے ساتھ؟" اسنے الٹے ہاتھ سے ایک تھپڑ اس کے بائیں رخسار پر جما دیا۔ جو پہلے ہی سے تمتمایا ہوا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے ـــــ" رانا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"رانا صاحب مجھے تمیز نہ سکھائیے، گولی مار دوں گا۔" اسنے ہاتھ جھٹک کر چھڑا لیا۔

سیما دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھی ـــــ رانا بجلی کی سی تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

"رانا بہت اچھا انسان ہے تم نے ناحق اسکی انسلٹ کی۔"

"مگر میں بہت برا آدمی ہوں۔ سمجھیں" ـــــ وہ رات کے سناٹے میں گرجا۔

"ذرا آہستہ ـــــ نوکروں کو جگانے سے کیا فائدہ؟"

"مجھے پتہ نہیں تھا کہ تم اتنی ذلیل بھی ہو سکتی ہو۔؟"

"ذلیل ـــــ اس کا مجھے کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ یہ TERMINOLOGY تمہاری

ہو سکتی ہے میری نہیں ۔۔۔"

"پھر تم پاگل ہو ۔۔۔"

"ہر ہوشیار کو لوگ پاگل کہتے ہیں۔"

"بحث نہ کرو ۔۔۔ کل سے تم کلب نہیں جاؤ گی۔ جاؤ سو جاؤ۔"

اور جب وہ سو گئی تو سلیپنگ گاؤن میں سوئی ہوئی سیما اسے گوشت و پوست کا وہ لوتھڑا نظر آ رہی تھی جو سڑ چکا ہو ۔۔۔ مگر اس کا چہرہ ۔۔۔، سوئی ہوئی خوبصورت آنکھیں، سینہ کا زیر و بم ۔۔۔، کیا انہیں فراموش کر سکتا ہے کوئی، ۔۔۔ وہ ڈریسنگ کمرے میں بڑی بے تابی سے ٹہلتا رہا ۔۔۔ یقیناً وہ پاگل ہو گئی ہے ۔۔۔ یا پھر ۔۔۔ یا پھر اس کی روح حد زمان و مکاں سے بلند ہو چکی ہے ۔۔۔، اسنے دھیرے سے اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرنا شروع کیا ۔۔۔ اور رخساروں سے انگلیاں جب مس ہوئیں تو جیسے اسے احساس ہوا کہ اسنے بدبو دار سڑے ہوئے گوشت میں اپنی انگلیاں گڑا دی ہیں۔

ایک سال بہت چپکے سے بیت گیا۔ اس درمیان میں کئی اسکینڈلز اس کے بارے میں مشہور ہوئے اور بختیار ان سے چشم پوشی کر گیا۔

وہ اکثر ایروڈڈروم چلی جاتی اور کسی اجنبی سے پیار جتاتی ۔۔۔، بار روم میں شراب پیتی اور کہیں داد عیش دے کر چلی آتی ۔۔۔، بختیار ساری باتوں سے واقف تھا ۔۔۔ مگر وہ ایک ایسا جذبہ، ایسا احساس تھی جس کے بغیر وہ سوچتا اس دنیا میں نہیں جی سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی ذہنی الجھنیں بڑھتی گئیں ۔۔۔، اکثر راتیں وہ ٹہلتے ہوئے گزار دیتا ۔۔۔ ہر روز دوست احباب اسے سیما کے متعلق بتاتے رہتے تھے اور اب تو اسنے اسے سمجھانا بھی چھوڑ دیا تھا، اور خود سیما کا یہ حال تھا کہ ہر شام کپڑے بدلتی میک اپ کرتی اور اسے بتا کر جاتی کہ آج وہ کس وقت آئے گی ۔۔۔، کہاں جا رہی ہے؟ کس کے یہاں جا رہی ہے۔ اور وہ اس کی باتیں سنکر اس طرح خاموش ہو جاتا جیسے قلوپطرہ کا غلام۔

"ٹھیک ہے جاؤ ۔۔۔"

اور وہ مسکراتی ہوئی چلی جاتی۔

اور شاید اس کی شادی کی دوسری سالگرہ تھی جب رات کے دو بجے کسی گاڑی کے پارک ہونے کی آواز اسنے سنی مگر دیر تک وہ گھر میں داخل نہیں ہوئی۔ آخر اکتا کر وہ خود گاڑی کی طرف بڑھا سیما نیم برہنہ حالت میں شراب کے نشے میں دھت پچھلی نشست پر پڑی تھی۔ اس نے اسے باہوں میں سمیٹا اور اپنے کمرے میں لے آیا۔ اس کی یہ آخری رات تھی۔ شمپین کی تین بوتلیں پینے کے بعد اسنے وارڈروب سے اپنا ریوالور نکالا اور خود کو شوٹ کرلیا۔ فائر کی آواز سے سیما کی آنکھ کھل گئی۔

"بزدل — آخر تم نے بھی خودکشی کرلی — اسکے ہونٹوں پر بڑی زہرخند مسکراہٹ تھی۔ تم سب بزدل تھے۔ صفدر بھی — تم بھی — سب بزدل تھے — تمہیں اس دنیا میں جینے کا واقعی کوئی حق نہ تھا۔

اور ٹھیک دس دنوں بعد وہ دھیرے دھیرے سول اسپتال کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ اسنے لیڈی ڈاکٹر کا معمولی سا ایپرن پہن رکھا تھا۔ اور اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔...... وہ دنیا کے تمام چمکدار رنگوں کو پیچھے چھوڑ آئی تھی — اس لئے کہ اب اسپتال کے وارڈ نمبر ۱۲ میں بیمار چہرے اس کے منتظر تھے۔

(تبصرے کیلئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

اردو شاعری کا مزاج

مصنف :۔ ڈاکٹر وزیر آغا
صفحات :۔ ۴۳۲
قیمت :۔ ۶ روپے
ناشر :۔ اے۔ایم۔خواجہ۔جدید ناشرین، لاہور

اردو شاعری کا مزاج میں نے بہت شوق اور توجہ سے پڑھی۔ اور اس لئے پڑھی
ہ یہ اردو میں پہلی کتاب تھی جس کا عنوان پوری شاعری کے افہام و تفہیم سے تعلق رکھتا
تا۔

اس کتاب کو پڑھ کر جو چار تاثرات میرے ذہن میں ابھرے وہ یہ ہیں ۱۔ ڈاکٹر
زیر آغا نے اردو میں پہلی بار ایک ایسے فیشن کو رواج دینا چاہا ہے۔ جو موضوع کو اتنا گھمبیر
نادے کہ پڑھنے والے پر یہ تاثرات قائم ہوں کہ مصنف نے اپنے موضوع سے انصاف کرنے
ے لئے تمام علوم و فنون کو کنگھالا ہے۔ سخت محنت کی ہے اور وہ صرف تنقید کی زبان
ی استعمال نہیں کرنا جانتا بلکہ اسکو سائینٹفک اصولوں پر پرکھ کر اس کو خطوط اور
انچوں سے ثابت کرنا بھی جانتا ہے۔ ۲۔ اس کتاب کا مصنف تحقیق کی عام روایت
سے اُوب گیا ہے اور اسنے اپنے دائرۂ تحقیق کو قوموں اور زمان و مکان کے تصوّرات
ک پھیلا دیا ہے جس کے دو فائدے مصنف کو پہونچے ایک تو اسنے نیا پن پیدا کر کے اردو
ے سامعین، قارئین اور ادیبوں کو چونکایا ہے۔ دوسرے اس کی تصنیف عام روایتی
تحقیق سے ہٹ کر ایک نئی اور اجنبی سطح کا احساس دلاتی ہے۔ ۳۔ یہ کتاب اس بات
کا خاصا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ مصنف کو کسی اور قسم کا غم اور مجبوری درپیش نہیں ہے۔
سوائے وقت گزاری کے غم کے۔ ۴۔ یہ کتاب بظاہر ایک موضوع پر لکھی گئی ہے۔ مگر دراصل
یہ چند الگ الگ موضوعات پر لکھے ہوئے چند ایسے مقالات کا ایک ملغوبہ ہے جسکو مصنف
کسی مصلحت کی بنا پر کسی اور تعلق سے نہیں چھپوا سکا تھا۔ لہٰذا اردو شاعری کے سہارے اسنے
کی معمولی سے شعوری کرتب کے ذریعہ ان مقالات کی اشاعت بہت خوبصورتی اور

ذہانت کے ساتھ کرادی۔

اب ان تاثرات کا سبب بھی سن لیجئے ۔ اردو شاعری کا مزاج جن الگ الگ مقالات سے تشکیل دیا گیا ہے، وہ عام تحقیق کی سطح سے کسی طرح مختلف اور بلند نہیں ۔ کیونکہ مصنف نے اپنے اشہبِ قلم کی جولاں گاہ صرف ادب کو نہیں بنایا ہے بلکہ اس مختلف اہم کتابوں سے انسان کے وجود اور اس کے ارتقا کی داستان تاریخ سے مختلف اقوام کی ابتدا اور خصوصیت سے ہندوستان کی قدیم عہد کی تاریخ اور اس کی مماثلت، تاریخ ادب اور بالخصوص ہندی تاریخِ ادب سے اس کی مختلف اصناف اور اس کی تفصیلات، تاریخ لسانیات سے لسانی اصول اور ہندوستان کے لسانی مسائل کا جائزہ اور غزل و نظم کی عام ادبی تاریخ سے مواد کو مہیا کر کے ایک جدید معیارِ تحقیق سے ایک لڑی میں پرو دیا ہے جس کا کوئی تعلق مصنف کے اپنے ذاتی تجربات، شعور اور ادبی نظریہ سے نہیں ہے ۔ اور نہ اِن تاریخی، لسانی، فلسفیانہ، سائنسی اور نفسیاتی محرکات سے شاعری کا باطنی اور حقیقی تعلق واضح کیا ہے۔ قدیم ہندی تمدن، آریائی تہذیب اور ہندوستان کے تاریخی اور سماجی پسِ منظر کا یہ ملغوبہ بہت اناڑی پن کی کیفیت کے ساتھ بغیر کسی تخلیقی شعور اور عمل کے اردو شاعری سے زبردستی پیوند کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب سے کہیں بھی مصنف کا تخلیقی محرک اُبھرتا نہیں محسوس ہوتا اور نہ اردو شاعری کے بارے میں اس کے کسی نظریہ یا شاعری کی روح اور اس کے اصل محرکات اور باطنی تارول کی آگاہی کا ہلکا سا بھی احساس ہونے پاتا ہے ۔ غزل اور اردو شاعری کے بارے میں مصنف کے خیالات بہت عام، سطحی اور محققانہ رویّہ سے پُر نظر آتے ہیں ۔ اس کتاب کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ مصنف نے ہند و تہذیب اور ہندوستانی تاریخ پر تو اچھا مواد مہیا کیا ہے مگر مسلمانوں کی آمد سے ہندوستان میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں اُنکو صرف تہذیبی یا لسانی انقلابات کی صورت میں پیش کیا ہے۔ جبکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ یہ بھی ہمیں بتاتے کہ مسلمانوں کا نظامِ فکر کیا تھا؟ اور انہوں نے زمان و مکان کے اپنے تصورات سے وہ کون سے بنیادی مسائل پیدا کئے تھے جو آریائی یا ہندی نظامِ فکر سے تعلق نہیں رکھتے تھے؟ قصّہ یہ ہے کہ ہندی اور آریائی تہذیب اور نظامِ فکر پر بلند پایہ

کتابیں ہر جگہ مل جاتی ہیں مگر ہندی مسلمانوں کے نظامِ فکر، طرزِ احساس اور رویّہ کو وزیر آغا صاحب خود ہی دریافت کر سکتے تھے جو شاید ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوستان میں صرف ایک ثقافتی کروٹ یا لسانی اثرات کا سبب ہی تلاش کر کے رہ گئے۔

"اردو شاعری کا مزاج" دراصل اردو شاعری سے کوئی تعلق نہیں رکھتی ـــ وہ صرف ہندوستان کی تہذیب اس کے مزاج، اس کی ادبی اصناف پر نوٹس کا، جو مختلف عنوان کے تحت لئے گئے ہوں گے، ایک ایسا انتخاب ضرور ہے جس میں اردو شاعری کے مزاج کا پتہ چلانا کارِ دارد ہے۔

اس کتاب کی مضحکہ خیزی کو واضح کرنے کے لئے ضروری تھا کہ تفصیلی مضمون لکھا جاتا مگر اس تبصرے میں چند اشارات ہی کئے جا سکتے تھے۔

کتاب اچھی اور خوبصورت چھاپی گئی ہے

ـــــــــــــ شمیم احمد

دیواریں (افسانوں کا ایک نیا مجموعہ)

مصنف :۔ حمید کاشمیری

صفحات :۔ ۲۸۷

قیمت :۔ ۵/۵۰

ناشر :۔ مکتبۂ ماحول۔ بہادر شاہ ظفر مارکیٹ۔

دیواریں حمید کاشمیری کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ کتاب کے آغاز ہی میں "مشہور نقاد" اور ترقی پسندوں کے "امام آخرالزماں" جناب ممتاز حسین کا دیباچہ پڑھ کر صاحبِ کتاب کی حالتِ زار پر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ بے چارے حمید کاشمیری نے کیا خطا کی تھی؟ کیونکہ "مشہور نقاد" کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ جب بھی کسی کتاب پر دیباچہ لکھتے ہیں تو پہلے صاحبِ کتاب کو "نیا منصور" بناتے ہیں اور پھر اسے پھانسی پر چڑھوا دیتے ہیں۔ اور رنج اس بات پر ہوا کہ حمید کاشمیری کے افسانوں کی اوقات

بھی اب یہ ہوگئی ہے کہ اور تو اور ممتاز حسین صاحب بھی ان کے افسانوں کی داد دینے لگے ہیں ـــــ ہوسکتا ہے کہ وہ واقعی انہیں داد کے قابل نظر آتے ہوں مگر میرے لئے بڑی مشکل یہ ہوگئی ہے کہ میں اُن افسانوں پر کیا لکھوں جو "مشہور نقاد" کے بھی سمجھ میں آگئے ہوں۔ دیباچے میں "مشہور نقاد" کی "طبع زاد ذہانت" اور "ادبی ذوق" کا اندازہ اس فقرہ سے کیجئے "جب انسان کا رقیب کتا بن جائے تو کتا ہی اس کا غمگسار ہوتا ہے" ـــــ اس کو کہتے ہیں۔

نہ چھیڑو نہ چھیڑو مری پنڈلیوں کو
کہ ان میں ہے دردِ جگر مام دینا

لیکن اپنی اس بدقسمتی کو کیا کروں کہ اس نئی دنیا پر جس نے پہلی بار ہمارے شہروں میں اپنے خد و خال نمایاں کئے ہیں اور ملک کے لئے ایک آئیڈیل کی صورت میں پہلی بار اکثریت کے علاقوں سے مختلف نظر آنی شروع ہوئی ہے۔ اس کو حمید کاشمیری جیسا ترجمان کم ازکم پاکستان میں دوسرا تو نصیب نہیں ہوا ہے۔ لہذا میں ایسے شخص پر نہیں لکھوں گا تو کس پر لکھوں گا ـ جو ہم جیسے بدنصیبوں کا بھی ترجمان ہے جو شب و روز شہر کی چکی میں پس رہے ہیں۔

۱۹۴۷ء صرف ایک تاریخی اور سیاسی تبدیلی کا ہی سنگ میل نہیں ہے بلکہ اس نے صغیر کے ہر باشندے کے طرزِ فکر اور طرزِ احساس میں نمایاں فرق پیدا کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد نئے افسانہ نگار بھی اپنے ساتھ ایک بدلا ہوا طرزِ احساس اور طرزِ فکر لے کر آئے ہیں۔ جو اس تبدیلی کا لازمی نتیجہ تھی جس نے برِصغیر کے مجموعی "کردار" اور "شخصیت" کو نئی نئی کیفیات اور تجربات سے آشنا کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے افسانہ نگار جو ۴۷ء سے پہلے اپنا مقام بنا چکے تھے، اس تبدیلی کا ساتھ نہ دے سکے ـــــ اور ان کی مقبولیت تو گھٹ گئی یا بے جان طرزِ تحریر اور فکری یکسانیت کا شکار ہو گئی۔ ان تمام افسانہ نگاروں میں شاید دو تین ہی ایسی مثالیں ہوں جنہوں نے ان نفسی تبدیلیوں کو بھانپ لیا اور اس کے مطابق اپنے رویہ میں نمایاں تبدیلی پیدا کرلی۔ بحیثیتِ مجموعی پرانے اور نئے افسانہ نگاروں میں بہت بڑا فصل اور فرق پیدا ہو چکا تھا۔ نئی تبدیلیاں نئے معاشی تصورات سے پیدا

ہوئی تھیں، جنہوں نے برصغیر کے معاشرتی کردار میں جذباتی اتار چڑھاؤ کی بنا پر ایک نئے
رویہ اور طرزِ احساس کو جنم دیا تھا، جن کا ادراک فوری طور پر نہ کیا گیا اور نہ کیا جا سکتا
تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدائی دور میں کسی مخصوص معیار یا عین کو سامنے رکھے بغیر افسانے
تخلیق کئے گئے، جن میں فنکار اکھڑا اکھڑا سا نظر آتا ہے۔ اسکو اپنے معاشرے کی بدلتی
ہوئی اقدار پر نہ گرفت محسوس ہوتی تھی اور نہ وہ اجتماعی نفسیات کو اتنا سمجھ پایا تھا
کہ کوئی معاشرتی تجزیہ پیش کر سکتا۔ البتہ اُن کی تحریروں سے ایک آدھ بات کا پتہ
فوری طور پر چل جاتا تھا۔ ایک تو یہ کہ اُن کے رویہ اور لہجہ میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی تھی۔
اور دوسرے یہ فوراً معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ لوگ ان تبدیلیوں کے پیچھے کام کرنے والے عوامل سے
ناآشنا ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افسانہ نگار پورے معاشرے کی اجتماعی شخصیت سے کٹ کر
صرف اپنی ذات تک محدود رہ گیا یہ بات فنونِ لطیفہ کی دیگر اشکال کے لئے سازگار
ہوتی ہو تو ہو مگر ناول اور افسانے کے لئے سخت مہلک ہے کیونکہ یہ فن کردار۔ ماحول۔
واقعہ۔ مقام اور کہانی سے الگ ہو کر کوئی معنی پیدا ہی نہیں کر سکتا افسانے میں صرف
موضوع یا طرزِ اظہار کا کوئی مقام نہیں۔ وہ مندرجہ بالا تمام چیزوں سے مل کر تو اپنا
رنگ متعین کر سکتا ہے مگر الگ اور علیحدہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اچھے افسانہ نگار اور
ناول نگار کے لئے اپنے معاشرے کی اجتماعی نفسیات اور "کردار" سے آگاہی بہت ضروری
ہے۔ ۴۷ء میں جس چیز نے ہمارے افسانے کو بہت پست معیار تک پہونچا دیا وہ یہی
مجبوری تھی ـــــ ہمارا افسانہ نگار دراصل اپنے نئے معاشرے سے کوئی ربط پیدا نہیں کر سکا
تھا۔ اور نہ فنکار کا طرزِ احساس اور طرزِ فکر معاشرے کے اجتماعی طرزِ احساس میں ضم ہو سکا تھا۔
جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افسانہ نگار کا لہجہ، رویہ اور طرزِ تحریر افسانے اور کہانی کی جگہ شاعرانہ ہو گیا۔
اس لئے اس نے جھٹ واحد متکلم والی طرزِ تحریر کو اختیار کر لیا۔ جس کے معنی یہ تھے کہ وہ اپنے
معاشرے میں تنہا رہ گیا ـــــ ایک زمانے تک نئے افسانہ کے اس انجام نے بے حد مایوسی
اور بد دلی پھیلائے رکھی ـــــ مگر کچھ عرصہ کے بعد وقت اور تجربے نے ایک بہت ہی
محدود تعداد میں چند افسانہ نگاروں کو نئے معاشرے کی بعض تبدیلیوں سے مانوس
کر دیا۔ اس میں سب سے نمایاں نام شوکت صدیقی کا رہا ہے۔ جن کے بارے میں میری رائے

بہت اچھی نہیں رہی ہے۔ حمید کاشمیری نے بھی اگر کسی ہم عصر کا تھوڑا بہت اثر قبول کیا ہے تو وہ شوکت صدیقی ہیں۔ مگر شوکت صدیقی کے افسانوں کی ایک خامی نے اُن کے اس کئے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ یہ درست ہے کہ نیا پاکستان ابھی تک نئے شہروں اور روزافزوں پھیلتے اور بڑھتے ہوئے شہروں میں تعمیر ہو رہا ہے۔ اور یقیناً شوکت صدیقی نے سب سے پہلے اس نئے پاکستان کو دیکھنے کا کام شروع کیا مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اُن کی شخصیت میں اس نئے معاشرے اور شہری زندگی کے مطالعہ سے پہلے ہی مخاصمت قائم ہو چکی تھی — ان کا طرزِ فکر بھی منفی رخ رکھتا تھا۔ اس لئے انہیں شہروں میں جو تصویریں نظر آئیں وہ سب منفی تصویریں تھیں۔ انہوں نے شہر کی عفریت۔ شیاطینی اور بہیمانہ زندگی میں ایک سرے سے پاکیزگی۔ حسن۔ انسانیت۔ ہمدردی اور خلوص کو نظر انداز کر دیا۔ جو بدترین شہری زندگی میں بھی کسی نہ کسی انداز میں باقی رہتا ہے۔ یہ بات شوکت صدیقی کے منفی طرزِ فکر کے علاوہ اس بات کی شہادت بھی دیتی ہے کہ اُن کی ذہنی اور جذباتی شخصیت ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی تکمیل پا چکی تھی۔ ۱۹۴۷ء سے قبل کا معاشرہ، انداز، تصورات، نظریات اور آئیڈیلز سے تہی نہیں تھا۔ وہ معاشرہ لاکھ بدل گیا تھا مگر اس میں اس وقت بھی قدیم اصول اور معیار کوئی قیمت ضرور رکھتے تھے۔ نئے معاشرہ میں یہ تمام چیزیں مفقود ہو رہی تھیں۔ جس وجہ سے شوکت صدیقی کے قلم میں طنز کی زہرناکی پیدا ہو گئی تھی — ایسا طنز جو تعمیری نہیں تھا بلکہ تخریب سے پھوٹا تھا — حمید کاشمیری کا ذہن اس نئے معاشرہ کے ساتھ بن رہا تھا اس کے ذہن اور قلب میں نئے معاشرے سے مخاصمت اور نفرت پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ حمید کاشمیری کا شعور جدید معاشرے کے شعور کا ایک حصہ تھا۔ یہی وجہ تھی جب اسنے شہری زندگی کو کاغذ پر منتقل کرنا شروع کیا تو اس کے ذہن میں نئی شہری زندگی اور نئے پاکستان سے کوئی تعصب پہلے سے موجود نہ تھا۔ اسی لئے اسنے شہر میں جہاں عفریت اور شیاطین کو محو استحصال دیکھا وہیں اسکو انسانیت کی اُن کچلی ہوئی اقدار اور سسکتی ہوئی زندگی کا حسن بھی نظر آیا، جو معاشرے کی استحصالی قوتوں سے اپنی مظلومیت کی بنیاد پر نبرد آزما ہے۔ یہ مظلومیت انسانیت اور انسانی اکثریت کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتی ہے۔ اسی مظلومیت سے اقدار

جنم لیتی ہیں۔

حمید کاشمیری کے اس پہلے مجموعے میں آپ کو شہری زندگی کے اسی سیاہ و سفید، منفی اور مثبت۔ ٹھنڈے اور گرم تاروں کا بڑا حقیقت پسندانہ امتزاج ملے گا۔ یہ افسانے شہری زندگی کا ایک البم ہیں جس میں ظالم و مظلوم مل کر استحصالی قوتوں کے خدوخال کو نہایت حسن کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں ۔ حمید کاشمیری وہ افسانہ نگار ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اپنے معاشرے کے قومی ترین "پاور ہاؤس" یعنی شہری زندگی کو ایک فرد اور ایک شہری کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ وہ خود بھی اسی معاشرے کا ایک کردار ہے جو ہمارے سامنے روز بروز پھیل رہا ہے اور سمٹ رہا ہے۔ یہ بات بہت غیر معمولی ہے۔ جو آئندہ افسانہ نگاری کے لئے واضح اور واحد راہ متعین کرتی ہے۔ مجھے یقیناً یہ ماننے میں ہرگز تامّل نہیں ہے کہ حمید کاشمیری کے افسانوں میں وہ گہرا نفسیاتی تجزیہ نہیں ملتا جو کسی معاشرے کے عوامل پر پوری گرفت اور اس کا شعور رکھنے والے فنکاروں میں ہوتا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ اس کے افسانوں میں جدید شعور کی وہ کاٹ اور تیزی نہیں ہے۔ جو اجتماعی شخصیت سے خود بھی متاثر ہوتی ہے اور اسے بھی متاثر کرتی ہے۔ لیکن ایک، ایسے نئے اور نوعمر افسانہ نگار سے یہ توقع رکھنا جس کا 'پہلا مجموعہ' ہمارے سامنے ابھی آیا ہو ایک زیادتی ہے اور یہ اس فنکار کے ساتھ سخت ناانصافی بھی ہے جو ہمارے معاشرے کے حقیقی کرداروں اور ماحول کا واحد عکاس ہو۔

دیواریں میں جو افسانے شامل ہیں۔ ان میں ہمارے اجتماعی دکھ درد۔ بدلتی ہوئی اقدار، دشوار تر زندگی کے مسائل اور اس کی چکّی میں پستے ہوئے عام انسان کی کراہیں بھی سنائی دیتی ہیں جو استحصالی قوتوں اور جبر کی طاقتوں کو پہچاننے میں ہماری مدد بھی کرتی ہیں۔ اور ان کے خلاف موثر ترین صدائے احتجاج کا رول بھی ادا کرتی ہیں

دیواریں کے افسانے زبان و بیان کے اعتبار سے مجھے بہت کھٹکے ہیں اور میں اس کو کسی طور نظر انداز کرنے کا حامی بھی نہیں ہوں مگر ایک ایسا جدید افسانہ نگار جو ایک مکمل اور ڈھلا ڈھلایا فنی سانچہ پیش کرنے پر قادر ہے اس سے یہ توقع بجا طور پر کی جاسکتی ہے کہ وہ بہت جلد اس کمزوری پر قابو پالے گا۔

شمیم احمد

بلوچی لوک گیت

ترتیب وترجمہ۔ عطا شاد۔ عین سلام
صفحات :۔ ۱۴۱
قیمت :۔ ۴/۵۰
ناشر :۔ قلات پبلشرز۔ مستونگ

قومی کلچر کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ مختلف علاقوں کے ادب، تاریخ، روایت اور
لوک کہانیوں اور گیتوں کے ترجمے اردو زبان میں محنت اور سلیقہ سے کئے جائیں۔ زیر نظر کتاب
اس کام کی طرف ایک مفید قدم ہے۔ عطا شاد اور عین سلام نے اصل زبان سے بلوچی لوک
گیتوں کا اردو ترجمہ کیا ہے اور ان گیتوں کو مختلف اصناف کے تحت مرتب کیا ہے ساتھ ساتھ
مختصر الفاظ میں ان اصناف کی تشریح کر دی ہے۔ اردو ترجمے منظوم ہیں اور ساتھ ساتھ اصل گیت
بھی دے دیا گیا ہے۔ ترجمہ محنت سے کیا گیا ہے اور مترجمین نے اصل کی روح کو ترجموں میں
برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ بلوچی روح اور مزاج کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ
مفید ہے۔ کتاب خوبصورت ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر سلیقہ سے شائع کی گئی ہے۔

——— جمیل جالبی

براہوی کی لوک کہانیاں

مصنف وترجمہ :۔ انور رومان
صفحات :۔ ۹۷
قیمت :۔ ۲/۷۵
ناشر :۔ قلات پبلشرز مستونگ

انور رومان صاحب نے اس مجموعہ میں پانچ کہانیاں پیش کی ہیں۔ کہانیاں "براہوی"

لیکن زبان و بیان خود انور رومان صاحب کا ہے جو یقیناً دلنشین ہے ان کہانیوں
کے ہیروہیوں کا مزاج، ان کا انداز فکر و عمل اور ان کی روح کا عکس ملتا ہے۔
انور رومان صاحب نے ان کہانیوں کو اردو میں لکھ کر ایک اچھا کام کیا ہے۔
کتاب خوبصورت ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر سلیقے سے شائع کی گئی ہے

______ جمیل جالبی

حضرت اکبر کے شب و روز

مصنف :۔ محمد رحیم دہلوی

صفحات :۔ ۲۷۶

قیمت :۔ ۵ روپے

ناشر :۔ مکتبۂ رضیہ ۔ جناح ہاؤس ۔ لارنس روڈ ۔ کراچی

محمد رحیم دہلوی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ زیر نظر کتاب اکبر الہ آبادی کے خطوط
سامنے رکھ کر روزنامچہ کی شکل میں بڑی محنت سے مرتب کی گئی ہے۔ ترتیب میں
سلیقہ ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے یہ روزنامچہ خطوط کی مدد سے رحیم صاحب نے مرتب
نہیں کیا بلکہ خود مصنف کا لکھا ہوا ہے۔

خواجہ حسن نظامی مرحوم نے 'غالب کا روزنامچۂ غدر' مرتب کر کے اس روایت کی
بیل ڈالی تھی۔ محمد رحیم صاحب نے اس روایت کو نہ صرف سلیقے سے نبھایا ہے بلکہ
بڑھایا ہے۔ شروع میں تعارف کے عنوان سے ملا واحدی صاحب کا دلچسپ
تعارف' شامل ہے اور مولوی عبدالحق کی مختصر تقریظ بھی۔ اس کے علاوہ خود رحیم صاحب
نے ایک تفصیلی پیش لفظ بھی لکھا ہے جس میں نہ صرف اکبر الہ آبادی کے خطوط پر روشنی ڈالی ہے
مثالوں اور حوالوں سے اسے اور دلچسپ بنا دیا ہے۔

کتاب سفید کاغذ پر سلیقہ سے شائع کی گئی ہے۔ کتابت و طباعت اچھی ہے جلد مضبوط
اور سرورق خوبصورت ہے۔

______ قمر سلطانہ

یہ دلّی ہے

مصنف :۔ یوسف بخاری
قیمت :۔ ۵ روپے
ناشر :۔ ایچ۔ ایم ۔سعید کمپنی۔ پاکستان چوک کراچی

دنیا میں گنتی کے ایسے شہر ہیں جو کسی ملک کی تاریخ یا تہذیب کی علامت بن گئے ہیں۔ دلّی، جو ہندوستان کی تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف اقوام کی تہذیبی مرکزیت کا نام ہے، ایک ایسا ہی شہر ہے جس پر برِصغیر ناز کرتا رہا ہے۔ سید یوسف بخاری نے اس دلّی کی تصویر ایک محبوب کی تصویر کی طرح بڑے چاؤ اور بڑی محبت سے کھینچی ہے ۔زبان نکھری ستھری الفاظ موتی کی طرح جڑے ہوئے۔ بیان ایسا کہ زبان خود چٹخارے لے۔اس کتاب کے مضامین کہانی کی طرح دلچسپ ہیں۔

زیر نظر کتاب دوسرا ایڈیشن ہے جسے سلیقے اور خوبصورتی کے شائع کیا گیا ہے۔

قمر سلطانہ

کہانی

مصنفہ :۔ آمنہ ابوالحسن
صفحات :۔ ۱۲۸
قیمت :۔ دو روپے پچاس پیسے
ناشر :۔ مصطفےٰ علی اکبر۔ حیدر آباد۔ بھارت

بہت دنوں بعد ایک متوازن اور خوبصورت افسانوی مجموعہ پڑھنے کو ملا ہے ۔
آمنہ ابوالحسن کی کہانیاں زندگی سے اتنی قریب ہیں کہ ان کو پڑھتے ہوئے سچ مچ کے کردار نظر میں ابھرتے لگتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ایک خوشگوار حیرت بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے بالکل سامنے کے، صاف اور سیدھے موضوعات کو کتنی فنکاری اور خوبصورتی سے پیش

کردیا ہے کہ انسان کے محسوسات ایک نئے اور متنوّع انداز میں نظر آنے لگتے ہیں آمنہ ابوالحسن کو کہانی لکھنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اُن کی نظر بہت گہری نہیں ہے اور یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ وہ بڑے بڑے موضوعات کو بالکل نہیں چھوتیں مگر چھوٹے چھوٹے افسانوں میں انہوں نے اپنے مشاہدے اور زندگی کی قربت کا جس قدر فنکارانہ اظہار کیا ہے۔ وہ اس کمی کا احساس کبھی نہیں ہونے دیتا ـــــ حقیقت اور کہانی اُن کے یہاں مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اور یہ چیز بھی آج کل بہت کم لوگوں کو حاصل ہے۔ یہ مجموعہ افسانوی ادب میں ایک دلچسپ اضافہ ہے۔

ـــــــــ قمر سلطانہ

درد کا شہر

مصنف :۔ زاہد ڈار

صفحات :۔ ۷۲

قیمت :۔ ایک روپیہ پچاس پیسے

ناشر :۔ نئی مطبوعات۔ ۷ اے شاہ عالم مارکیٹ۔

"درد کا شہر" نثری منظومات کا وہ پہلا مجموعہ ہے جس میں نے پُرخلوص کاوش پایا۔ اس کا مصنف محض فیشن پرستی کا شکار نہیں۔ وہ محض باغی بھی نہیں اور اسے سرکس کا جوکر بننے سے تسکین بھی نہیں ہوتی۔ اسنے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کی ذات کا مسلہ یقیناً محسوس ہوتا ہے۔ اس کے خیالات بہت واضح ہیں۔ اور اس کی الجھنوں، غموں، تکلیفوں اور تعصبات میں خلوص ہے۔ یہ خلوص ہی ہے جو اس سے زندگی کے ہر اس مسلہ پہ لکھواتا ہے۔ جو آج کے شہری نوجوانوں کے جیتے جاگتے محسوسات ہیں۔ اسی لئے یہ مجموعہ مختصر بھی ہے اور پُر اثر بھی۔

زاہد ڈار کو سمجھنا اس لئے زیادہ آسان ہے کہ وہ سچ بولتا ہے۔ اسکو اپنی جنسی بھوک کا احساس ہے اسکو جنس کی ناآسودہ خواہشات میں چھپی ہوئی لپست لذتیت کی صداقت کا علم ہے۔ اسکو ایسی تنہائی سے واسطہ رہا ہے جو کھوکھلے نعروں، جھوٹی اخلاقیات، بے روح اقدار اور

مصنوعی تعبیر سے گھن کھاتی ہے۔ وہ بیسویں صدی کے اس بے رحم تاریخی جبر کا شکار ہے۔
صرف اس لمحہ کو سچ جاننا ہے جس میں وہ زندہ ہے اسے اس لمحہ سے پہلے اور بعد کے تاریخ
پھیلاؤ کی سچائیوں کا کوئی علم نہیں۔ اسی لئے اس کا مجموعہ ہر اس لمحہ کا اظہار ہے جس سے شہر کا نوجو
ہر روز گزرتا ہے۔ اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ زندگی کے بنیادی مسائل کیا ہیں۔ وہ
اسے جھوٹ سمجھتا ہے کہ اس کی پیدائش سے پہلے زندگی اتنی سستی، اتنی سطحی نہیں تھی۔ اسے
یہ پتہ نہیں کہ اس کے پرکھوں کے سامنے اپنی ذات اور کائنات کے بارے میں کون سے
بڑے بڑے سوالات تھے۔ اُسے اس سے غرض نہیں کہ فرد اور معاشرہ کی ذمہ داری کا مفہوم
کیسے متعین ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کو ڈھکوسلا سمجھتا ہے۔ اس کی تمام سچائیاں ایک بن ماں باپ
بنِ اقدار، بنِ تصورات اور بے مقصد زندگی اور اس زندگی کے بِن سوت دھاروں
سے پھوٹی ہیں ـــــ یہ وہ باتیں ہیں جو ہر نوجوان کا مسئلہ ہیں، جاہل پڑھے لکھے، عامی اور
راستہ سے گزرنے والا ہر جوان آدمی بلاتخصیص یہی باتیں سوچ رہا ہے۔ یہی باتیں کیفوں،
ہوٹلوں، گھروں میں کر رہا ہے۔ اور اسی واحد، تنہا، بے چھور اور یتیم لمحہ کو زندگی سمجھتا ہے
اور دنیا کی ہر قدر، علامت اور بلندی کو حقارت اور بیگانگی سے دیکھتا ہے۔ اسی لئے یہ
نظمیں اور ان میں جو کچھ کہا گیا ہے ہر اخبار کے کالموں، ہر فلم کے پس منظر اور سستے رسالوں
کی صفحات، ہر ڈائجسٹ میں چھپے ہوئے لطیفوں، ہر کلب ہر ہوٹل کی شاموں کی عام
گفتگو کی طرح سچی عمومیت اور پستی رکھتی ہیں۔ یہی شہر کے نوجوانوں کی زندگی ہے۔ قوم اور
ملک سے ماورا تاریخ اور شعور سے ماسوا، احساسِ ذمہ داری اور انسانی ارتقا سے بے نیاز،
حیات و کائنات کے بنیادی سوالات اور مسائل سے بیگانہ اور ہر لذت کو ہر نا آسودگی کو
اصل زندگی سمجھنے والا ایک عام آدمی۔ اور اس کے خیالات، اس کا خوف، اس کی نفرت،
اس کی بے چارگی، محرومی اس کے لطیفے، چونکانے کی لذت اور بے معنویت سب عمومی اور
سطحی۔ اسی لئے یہ مجموعہ سچا بھی ہے اور نیا بھی ـــــ یہ غالباً ایک مردہ اور بے معنی
معاشرہ کی وہ پرچھائیں ہے جہاں شاعر کا وجود غیر اہم ہو جاتا ہے اور وہ صرف ایک سچ
بولتا نظر آتا ہے جو زاہد ڈار نے بھی بولا ہے۔

"رحمِ مادر سے نکلنا مرا بے سود ہوا"

یہی حق ہے اور یہی سچ ہے۔ یہ میں طنزیہ نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ وہ نوجوان جو ابھی میرے سامنے کولھے مٹکاتا سیٹی بجاتا اور نہایت بھونڈے اور مبتذل فقرے کستا ہوا ایک لڑکی کا پیچھا کرتے ہوئے گزرا ہے یہ اس کی حیات ہے اور لاریب سب سے بڑا سچ بھی۔

اس مجموعہ میں اگر کوئی چیز نہایت مکروہ۔ مصنوعی۔ تضاد سے پُر اور تمام ادبی خصوصیات اور صفات سے محروم ہے تو وہ اس کا دیباچہ ہے۔ جس میں دیباچہ نگار بہت چھوٹا اور حقیر نظر آتا ہے اس شاعر اور ہمارے معاشرے کے عام نوجوان سے بھی چھوٹا کیونکہ اس مجموعہ میں صرف اسی نے جھوٹ بولا ہے ——— "درد کا شہر" پڑھنے کی چیز بھی ہے اور اور کسی حد تک دیکھنے کی بھی۔

——— شمیم احمد

چاندنی کی پتیاں

مصنف :۔ ناصر شہزاد

صفحات :۔ ۱۱۷

قیمت :۔ ۴ روپیہ ۰ ۵ پیسے

ناشر :۔ مکتبہ ادب جدید۔ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

سب سے پہلے تو آپ وہ سن لیجئے جو مصنف نے اس مجموعہ اور اپنی شاعری پر خود لکھ کر کتاب کے ساتھ چھپوایا ہے "میں نے اردو شاعری کے قدیم اور جدید پر دیپ سے لویں مستعار نہیں لیں۔ میں زبان کے روایتی لب و لہجہ اور خیال کی ڈھلی ڈھلائی ہیئت سے متاثر نہیں ہوا ——— میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ میرے سفر کے راستے محض بھرے پڑے شہروں، کولتار کی بچھی ہوئی سرمئی سڑکوں، پُرشکوہ عمارتوں اور ان عمارتوں کے آس پاس بکھرے ہوئے نائٹ کلبوں، کلبوں آرکسٹروں پہ بجتی ہوئی اجنبی دھنوں اور ان دھنوں پر ناچتے ہوئے رد پہلے سایوں کے قریب سے ہو کر ہی نہیں گزرتے میری منزلوں میں

جنگلوں کا سکوت بھی ہے، اور پربتوں کی بلندی بھی، ندیوں کا بہاؤ بھی ہے اور مرلیوں کے لہرے بھی، کھیتوں میں ساون الاپتے ہوئے جیالے کسان بھی ہیں اور پنگھٹوں پر جھو[لے] جھلاتی ہوئی منوہر لجونتیاں بھی ..... دھرتی کے یہی سمے جو دلوں کو سواشکتی د[یتے] ہیں۔ میرے گیان کا حصہ ہیں اور ان ہی سے میں نے اپنے فن کی جوت جگانے کی کوشش کی ہے۔"

اقتباس آپ نے پڑھا اب مجھے صرف اتنا بتا دیجئے کہ انہوں نے میرے لئے کچھ کہنے کی گنجائش کہاں چھوڑی ہے۔ اس پر طرفہ یہ کہ ناصر شہزاد صاحب آگے چل کر اپنے قاری کو یہ مشورہ دینے سے بھی نہیں چوکتے۔

"آپ سے اس امر کا متمنی ہوں کہ آپ میرے کلام کو اردو شاعری کے مروّجہ ماحول اور اس ماحول کی موروثی کیفیت سے بالکل ہٹ کر پڑھیں گے اور اسے اسی پیمانہ پر پرکھنے کی سعی نہیں فرمائیں گے جو ہماری عارفانہ شاعری کا امتیازی نشان رہا ہے۔"

اب آپ خود ہی شاعر کے خوف کا اندازہ کر لیجئے ــ ویسے ناصر شہزاد صاحب کے صرف اسی بیان پر مجھے اعتراض ہے کیونکہ ان کی شاعری صرف "روایتی" لب ولہجہ اور خیال کی ڈھلی ڈھلائی کیفیت سے عاری ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ روایتی، اس سے بھی زیادہ پرانے اور ڈھلے ڈھلائے خیال کی حامل ہے ــ اُن کو ہندی ڈکشن، اور ہندی شاعری کے تصوّرات اور علامتوں کی بنا پر اس دھوکہ میں اور مغالطہ میں نہیں پڑنا چاہیئے کہ ان کی شاعری کوئی "نیا تجربہ" یا بالکل غیر روایتی شاعری ہے ــــــ اور آخر غیر روایتی اور نئے پن پر اس قدر اصرار کیوں ــ ؟ کیا آپ نے زندگی کی نئی حقیقتوں اور تصورات کو دریافت کر لیا ہے ؟ کیا آپ نے شاعری کی نئی تعبیر تلاش کر لی ہے ؟

ــــــ شمیم احمد

[مش]تاق اللہ پرنٹر پبلشر نے باہتمام عبداللہ مطبع سعیدی قرآن محل سے چھپوا کر ۵۲ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۵ سے شائع ک[یا]
ستمبر ۱۹۶۶ء

سوان چپل

اپنے شہر کے ڈیلروں سے طلب فرمائیں یا براہ راست

اولمپیا واچ کمپنی - الفنسٹن اسٹریٹ صدر کراچی کو رجوع کریں

643 C

NAYA DAUR

A widely circulated Literary Magazine

Published by : The Pakistan Cultural Society

P. I. B. Colony, Karachi-5